ولی عہد

ڈاکٹر کرن سنگھ

مترجم

غلام نبی شیدا

ولی عہد

WALI-AHAD

ڈاکٹر کرن سنگھ

Dr. KARAN SINGH

مترجم

غلام نبی شیدا

G. N. SHAIDA

گلشن پبلیشرز سرینگر

GULSHAN PUBLISHERS, Sgr.

نام کتاب ——— ولی عہد

مصنف ——— ڈاکٹر کرن سنگھ

مترجم ——— غلام نبی شیدا

پبلیشر ——— گلشن پبلیشرز، گاؤکدل سرینگر

کاتب ——— منظور قادری

سنہ طباعت ——— ۱۹۹۴ء

زیر اہتمام ——— معراج الدین

طباعت ——— سیما آفسیٹ پریس جامع مسجد دہلی

قیمت ——— ستّر روپے

تقسیم کار

شیخ محمد عثمان اینڈ سنز تاجران کتب گاؤکدل سرینگر

پیش لفظ

ڈاکٹر کرن سنگھ اگرچہ گوناگوں شخصیت کے مالک ہیں۔ تاہم مجھے سب میں زیادہ ان کی علمی قابلیت اور انداز تحریر نے متأثر کیا ہے۔ برسوں سے میں ڈاکٹر صاحب کے قریب رہا ہوں۔ ہمارے درمیان اگرچہ بعض معاملات پر اختلاف رائے بھی رہتا ہے لیکن یہ اختلاف ہمارے تعلقات پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ دراصل ڈاکٹر صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ہر بات خندہ پیشانی سے سنتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اس قدر باصلاحیت ہیں کہ اگر انہوں نے ایک بادشاہ کے گھر میں جنم نہ بھی لیا ہوتا یا اگر وہ بڑے بڑے کلیدی عہدوں پر فائز نہ بھی رہے ہوتے۔ پھر بھی ان کا شمار ملک کی اہم شخصیتوں میں ہوتا۔

میں نے جب ان کی غیر معمولی نشیب و فراز سے پُر سوانح حیات 'HEIR APPARENT' پڑھی تو میں نے اس کا اُردو میں ترجمہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ مختصر سی سوانح حیات کافی معلوماتی ہے۔ اور اسے بہت ہی دلچسپ پیرائے میں لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے حالات کو قلمبند کرتے وقت صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا شمار چوٹی کے قلمکاروں میں ہوتا ہے۔ اور انگریزی پر ان کو قدرت حاصل ہے اپنی جانب سے میں نے بھرپور کوشش کی ہے کہ اُردو میں بھی کتاب کی دلچسپی اور خوبصورتی برقرار رہے۔ میں وثوق کے ساتھ کہہ نہیں سکتا ہوں کہ میں اس کاوش میں کہاں تک کامیاب ہوں۔ اس سوانح حیات کا ترجمہ میرے لئے کافی کٹھن ثابت ہوا۔ اس مشکل کام میں میری اہلیہ شمیم زیدی نے وقتاً فوقتاً گھر کی مصروفیات سے وقت نکال کر میرا ہاتھ بٹایا۔ مجھے پوری اُمید ہے کہ قارئین اس کتاب کو دلچسپ اور کارآمد پائیں گے۔

غلام نبی شیدا

دیباچہ

یوں تو بائیس برس ایک سوانح عمری کے لئے مختصر سا عرصہ ہے لیکن میری ابتدائی زندگی اتنے سارے غیر معمولی حالات سے دوچار رہی کہ قارئین اس کہانی میں کچھ نہ کچھ دلچسپی ضرور پائیں گے۔ یہ ایک ایسے لڑکے کی کہانی ہے جو دو دنیاؤں کے درمیان بالک سے بالغ ہوا۔ میں نے اس جلد کو ۱۹۵۳ء میں رونما ہوئے ڈرامائی نوعیت کے سیاسی حالات پر ختم کیا ہے۔ یعنی میرے ریاست جموں وکشمیر کے صدر ریاست منتخب ہونے کے ایک برس بعد۔
لکھنے کا کام ہاتھ میں لینے کے فوراً بعد مجھے احساس ہوا کہ یہ بہت ہی جان جوکھم کا کام ہے۔ بچپن کی یادداشت عام طور سے دھندلی ہوتی ہے جس میں بہت کم حصے نمایاں ہوتے ہیں۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ پوری صورت حال مزید پیچیدہ ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ حالات کو مناسب طور پر قلمبند کرنا زیادہ مشکل بن جاتا ہے۔ تاہم میں نے ماضی سے متعلق اس ریاضت کو بیش

قیمت اور دلکش پایا، کیونکہ مجھے بیتے ہوئے زمانہ اور رفتار یہاں تک کہ اپنے اندر جھانکنے پر مجبور ہونا پڑا۔

زندگی کے شروع کے برسوں کو اکٹھا کرنے میں مجھے بہت حد تک اس بات سے مدد ملی کہ میرے والد خط وکتابت کا باضابطہ ریکارڈ رکھتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد بہت سارے خطوط میری تحویل میں آئے۔ ان خطوط میں والد صاحب کے نام میرے اپنے خطوط اور ان کے جوابات بھی شامل ہیں۔ علاوہ ازیں بہت سارے اہم فائل بھی میری تحویل میں آئے۔ جن میں میرے والد کی وہ خط وکتابت بھی موجود ہے جو انہوں نے ۱۹۴۷ء کے بعد بھارت سرکار کے ساتھ کی تھی۔ میں نے ان کی اس عادت کو اپنایا۔ اور میں نے جو اہم خطوط لکھے یا جو مجھے موصول ہوئے۔ میں نے ان کا ریکارڈ رکھا۔ اس کتاب کے آخری ابواب میں، میں نے تفصیل کے ساتھ ان دستاویزات کے حوالے دئے ہیں۔ خاص طور سے ان بیشمار خطوط کے جو مجھے میرے سیاسی اُستاد پنڈت جواہر لعل نہرو نے لکھے ہیں۔

میں اپنی بیٹی جیوتسنا چوہان اور اکسفورڈ یونیورسٹی پریس کے ایڈیٹر کا مشکور ہوں جنہوں نے ٹائپ شدہ عبارت پڑھکر مجھے سنائی۔ اور فائدہ مند تجویزیں پیش کیں۔ میں اپنی اہلیہ کا بھی شکرگذار ہوں جنہوں نے تصویروں کے انتخاب میں میرا

ہاتھ بٹایا۔ حکومت جموں وکشمیر بھی مہربان رہی جو اس نے مجھے اپنے جنم اور ابتدائی برسوں سے متعلق محافظ خانہ کے ریکارڈ کو دیکھنے کی اجازت دی۔

میرے لئے یہ دکھ کی بات ہے کہ اس کتاب کے شائع ہونے سے کچھ ہی روز پہلے شیخ محمد عبداللہ انتقال فرما گئے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اس جلد میں جس دور کا ذکر کیا گیا۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد میرے اور شیخ محمد عبداللہ کے درمیان شدید سیاسی اختلافات رہے لیکن آخری دم تک ہمارے درمیان ذاتی نوعیت کے خوشگوار تعلقات قائم رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شیخ محمد عبداللہ قد و قامت اور دیگر لحاظ سے ممتاز کشمیریوں میں سے ایک تھے۔ جنہوں نے پچھلی نصف صدی سے کشمیری عوام کی ترقی کے لئے بے مثال خدمات انجام دی ہیں۔ ملک کے ہنگامہ خیز دور میں، فرقہ پرست قوتوں کا مقابلہ کرنے میں ان کے رول کو ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

اس کتاب کو میں نے اپنے بیٹوں کے لئے مخصوص کیا ہے۔ جو اس ماحول سے بالکل مختلف ماحول میں پل رہے ہیں جس سے مجھے دو چار ہونا پڑا۔ جنہیں ایک ایسی دنیا کا سامنا کرنا ہوگا۔ جو اس زمانہ کے مقابلہ میں زیادہ تیزی سے بدل رہی ہے۔ قدیم سنسکرت میں بیان کیا گیا ہے ؎

سامیاک سامسارا تی اتی سامسارا

بہر کیف یہی تبدیلی زندگی کے سفر کو جوش و خروش بخشتی ہے، دانشورانہ طور پر سچائی سے متعلق پوچھ تاچھ کو ذائقہ مہیا کرتی ہے۔ اور ابدی رُوحانی جستجو کے لئے یہی تبدیلی ایک چیلنج پیدا کر دیتی ہے۔ جیسا کہ بجا طور پر کہا گیا ہے کہ لگاتار تبدیل ہونے والی دنیا کے اندر ہی ابدی سچائی موجود ہے۔ اور میرا یہ عقیدہ ہے کہ آدمی کا اصلی مقدر اسی صداقت کو دریافت کرنے میں مضمر ہے۔ آدمی کو چاہیئے کہ وہ اسے سمجھے اور آخر میں اس کی لامحدود وسعتوں کا ایک حصہ بنے۔

پس میں اپنی زندگی کے ابتدائی دور کی اس کہانی کو ایک دھندلی سی منزل کے بارے میں جستجو کی ابتدا سمجھتا ہوں جو ایک دوسری انجان منزل کی جانب سفر کی شروعات ہے۔

ڈاکٹر کرن سنگھ

باب ۱

ساحل سمندر پر واقع کیناس کا تفریحی قصبہ اگلے وقتوں میں یورپ اور ہندوستان کی اعلیٰ سوسائٹی سے تعلق رکھنے والوں کی ہمیشہ ایک پسندیدہ آماجگاہ رہا۔ مشہور کوٹے "ڈی زور" کے ساتھ ساتھ جو قابل غور سیاحی قیام گاہیں تعمیر کی گئی ہیں ان میں ہوٹل مارٹنز بھی شامل ہے۔ ۱۹۳۱ء کے شروع میں جموں و کشمیر کے شاندار اور خوبصورت مہاراجہ سر ہری سنگھ اور ان کی حسین بیوی مہارانی تارا دیوی اس ہوٹل میں وارد ہوئے۔ اور پوری تیسری منزل کو بک کیا۔ مہاراجہ اس برس لندن میں منعقد ہونے والی گول میز کانفرنس میں ہندوستانی شہزادوں کی نمائندگی کرنے والے تھے۔ سردیوں میں لندن کہر آلودہ اور ناخوشگوار تھا جبکہ کیناس کا موسم شاندار تھا۔

جہاں پولو اور شراب کی بہتات تھی۔ سمندر کی معطر ہوا کو شاہی مزاج بے حد پسند کرتے تھے۔ اس بات سے بے خبر کہ دنیا بھر میں بادشاہت خاتمہ کے قریب ہے۔

ہوٹل مارٹنز اب بھی ایک خوبصورت عمارت کے طور پر استادہ ہے۔ جہاں سے سمندر کا دلکش نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ تیسری منزل کے شمالی کونے میں سیوٹ نمبر ۳۱۸ - ۳۱۹ - ۳۲۰ میں نوعمر مہارانی زچگی کے آخری ایام کے قریب تھیں۔ ان کی عمر صرف اکیس برس تھی۔ اور ان کی دیکھ بال نوکرانیوں کی ایک جماعت کر رہی تھی۔ ان میں بعض ہندوستانی تھیں اور کچھ فرانس کی۔ اس زمانہ میں یورپ میں نوکر حاصل کرنا ممکنات میں سے تھا۔ آخری وقت میں کچھ پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں۔ اور زچگی میں غیر ضروری طور پر تاخیر ہوئی۔ نوکرانیاں، مہاراجہ کے ذاتی معالج "کرنل جے۔ ایچ گیو اور مشہور اوبسٹی ٹریشن OBSTETRIACIAN سر ہیری سیمسن دن رات مصروف رہے۔ جبکہ مہاراجہ اپنے دوستوں اور درباریوں کے ساتھ دن میں پولو کھیلنے میں مصروف رہتے اور رات میں خوب شراب نوشی کرتے تھے۔ آخر کار مقررہ لمحہ آ ہی گیا۔ ۹ مارچ کو زور زور سے روتے ہوئے میں اس دنیا میں وارد ہوگیا۔ میرا وزن نو پونڈ تھا۔ اور اس طرح سے یہ لمبا سفر شروع ہوا۔

میری پیدائش کو جموں و کشمیر کے عوام نے بلا لحاظ مذہب

وملت اور ذات پات کے ضرورت سے زیادہ جوش وخروش سے منایا۔ ایسا اس لئے بھی ہوا کیونکہ شاہانہ نظام کے ہندوستان میں ٹھاٹھ باٹ باقی تھے۔ اور ولی عہد کا جنم ہمیشہ ایک خوشی کا معاملہ ہوتا تھا۔ لیکن میرے بارے میں وجوہات اس سے بھی زیادہ تھیں۔ میرے والد اپنے چچا مہاراجہ پرتاب سنگھ جنہوں نے ریاست پر چالیس برس حکومت کی تھی، کے انتقال کے بعد ۱۹۲۵ء میں تخت نشین ہوئے۔ اس دوران برطانیہ کو روسی سلطنت کی بڑھتی ہوئی طاقت سے تشویش لاحق ہوئی تھی۔ اور اس نے شمال میں فوجی اہمیت کے صوبوں گلگت اور اسکردو پر اپنی گرفت مضبوط کرنا شروع کر دی تھی۔ یہ صوبے روسی سلطنت کے متصل تھے۔ جنہیں مہاراجہ گلاب سنگھ کی قوت بازو اور ان کے لائق فوجی جرنلز جن کی رہنمائی وزیر زور آور کر رہے تھے، کی دانشمندی کی وجہ سے ریاست جموں وکشمیر کے ساتھ جوڑ دیا گیا تھا۔ بلاشبہ مہاراجہ پرتاب کے دوران حکومت برطانوی محکمہ سیاست نے انہیں حکومت سے معزول کرنے کے لئے غور وفکر کے بعد ایک سازش تیار کی تھی۔ اس بناء پر کہ ان پر بیرونی طاقت کے ساتھ سازش میں شامل ہونے کا الزام تھا۔ اور یہاں تک کہ انہیں حکومت کو کونسل آف رجنسی کے حوالے کرنے پر مجبور کر دیا تھا اگر کلکتہ کے امریتا بازار پتریکا ایک مشہور مضمون CONDEMNED

UNHEARD کے ذریعہ اس سازش پر سے پردہ نہ ہٹایا گیا ہوتا تو انکو سچ مچ حکومت سے برطرف کر دیا گیا ہوتا۔ اس بات نے برطانوی پارلیمنٹ میں تہلکہ مچا دیا۔ اور شعبہ سیاست کو پیچھے ہٹنا پڑا۔

میرے والد پہلے بھی تین بار شادی کر چکے تھے۔ دو مرتبہ سراشٹرا میں اور ایک بار پڑوسی پہاڑی ریاست چھمب میں۔ لیکن ان کی پہلی بیوی اس وقت انتقال کر گئی تھیں۔ جبکہ بچہ ابھی انکی کوکھ ہی میں تھا۔ اور دوسری دو شادیوں سے کوئی بچہ حاصل نہ ہوا تھا میرے والد خود بھی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ اس لئے لوگوں کو یہ ڈر تھا کہ اگر تخت کا وارث پیدا نہ ہوا تو شکتی مان وائسرائے ایک دن بدنام اصول DOCTRINE OF LAPSE کا سہارا لیکر ریاست کو براہ راست برطانیہ کے انتظامیہ کے تحت لے لیں گے۔ اس لئے میرے والد نے ایک بار پھر شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس مرتبہ پرانے پنجاب میں کانگڑہ ضلع کے دریائے بیاص پر واقع ایک دور اُفتادہ گاؤں میں اُنہوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح نئی امیدیں پیدا ہونا شروع ہوئیں اور اب اس افواہ پر جوش وخروش شروع ہوا۔ کہ نئی مہارانی کے یہاں بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ میرے والد کے میری ماں کو زچگی کے سلسلہ میں یورپ لیجانے کی کئی تاویلیں کی گئیں بعض کا یہ خیال تھا کہ وہ ایسا اس لئے کر رہے ہیں تاکہ بچہ اور زچہ کو کینہ ور سازشی زنانہ (جس میں درجنوں مہارانیاں، رانیاں اور

ذکرانیاں سابقہ حکمرانوں کی یاد کو تازہ کررہی تھیں) سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ فرانس کو اس لئے چُن لیا گیا تھا کیونکہ ہر جگہ موجود برطانوی سلطنت جس کے اُوپر اس زمانہ میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا' سازش کرنے میں کامیابی نہیں ہوگی۔ بہرحال اگر اس قسم کے دستاویزات پر بھروسہ کیا جائے تو ولی عہد کے جنم نے ریاست کے عوام کو جوش وخروش کی لہر میں قریب قریب دیوانہ سا بنا دیا تھا۔ سرکاری طور ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲ مارچ کو جانوروں کے ذبح کرنے' مچھلیاں پکڑنے اور شکار کھیلنے پر تین دن کی پابندی لگادی گئی۔ اور تین دن ریاست میں عام تعطیل رہی۔ مندروں' مسجدوں اور گردواروں میں نذرونیاز چڑھائی گئیں، اور اسکول جانے والے بچوں میں مٹھائیاں بانٹی گئیں۔ اور ان سے شہزادہ کی درازی عمر کی دعا کرنے کو کہا گیا۔ اب بھی میں غیر متوقع جگہوں پر ان لوگوں سے ملتا ہوں جنہیں بچپن میں میرے جنم پر مٹھائیاں ملنے کا واقعہ یاد ہے۔ سرینگر میں میری پیدائش کا اعلان فوج اور تعمیرات عامہ کے وزیر جنرل جنک سنگھ نے کیا تھا۔ جبکہ جموں میں یہ اعلان میرے والد کے ایک منسٹر مسٹر واک فیلڈ نے کیا تھا۔ جنرل جنک سنگھ نے ایک مختصر یادداشت قلمبند کی ہے۔ جس میں مندرجہ ذیل فقرہ شامل ہے۔

"۹۔ مارچ پہلا خوشگوار دن تھا جب کشمیر میں طویل

شدید سردی کے بعد مطلع صاف ہوگیا تھا۔ اُسی روز اخباروں نے گاندھی اِروِن کے درمیان سرینگر میں طے پائے گئے سمجھوتہ کی خوشخبری بھی شائع کی۔ کشمیریوں نے ان واقعات کو اچھا شگون سمجھا۔ اور یہ کہ شہزادہ کا مستقبل شاندار ہے۔"

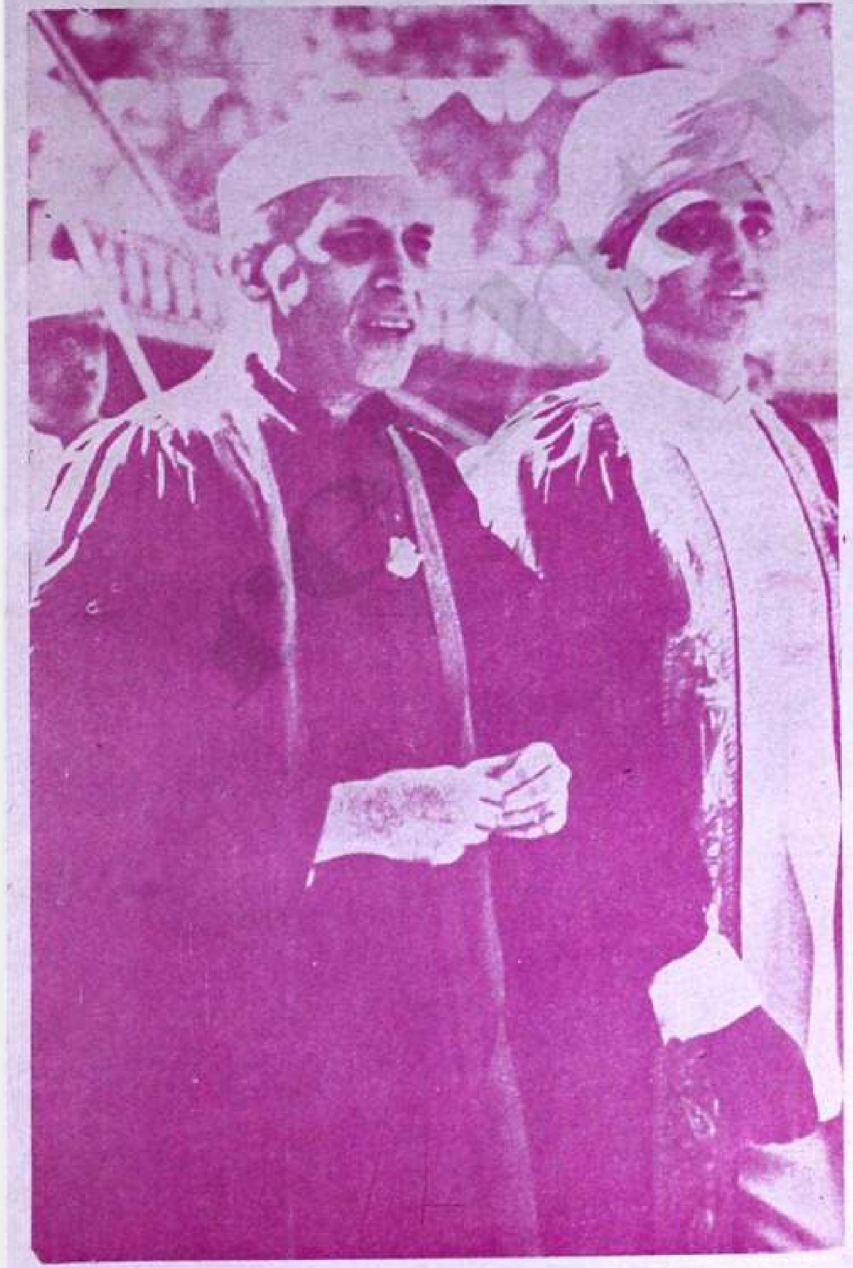
کیناس میں چھ ہفتے گذارنے کے بعد' قیصرِ ہند نامی جہاز میں جو بھاپ پر چلنے والا پی اینڈ او کا جہاز تھا' پوری جماعت واپس بھارت کے لئے روانہ ہوئی۔ یہ جہاز اپریل کے آخر میں بمبئی میں لنگر انداز ہوا۔ پس کشمیر کے بجائے یہ بمبئی تھا جس کے ساتھ مجھے سب سے پہلے واسطہ پڑا۔ بمبئی نے آئندہ تیس برسوں میں میری زندگی میں ایک اہم رول ادا کیا۔ گیٹ وے آف انڈیا پر میرے والد کا استقبال کرنے والوں میں بہت سارے حکمران شہزادوں کے ساتھ ساتھ افسروں اور درباریوں کی ایک بڑی جماعت منتظر تھی۔ میرے والد کے مطابق جو بعد میں واقعات بیان کرنے کے بہت شوقین تھے' شہزادوں میں بیکانیر کے مہاراجہ گنگا سنگھ جی بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ میں نے ان کی مشہور مونچھوں پر ایک نظر ڈالی اور زور زور سے رونا شروع کیا۔ جو ان کے کیبن سے چلے جانے کے بعد ہی رُک گیا۔ یہاں پر میرے والد کے ایک قریبی دوست پالن پور کے نواب تالے محمد خان بھی تھے۔ جن کے نام پہ ہمارے سرینگر کے گھر کا نام رکھا گیا تھا اس کے علاوہ ٹُلبل ہند

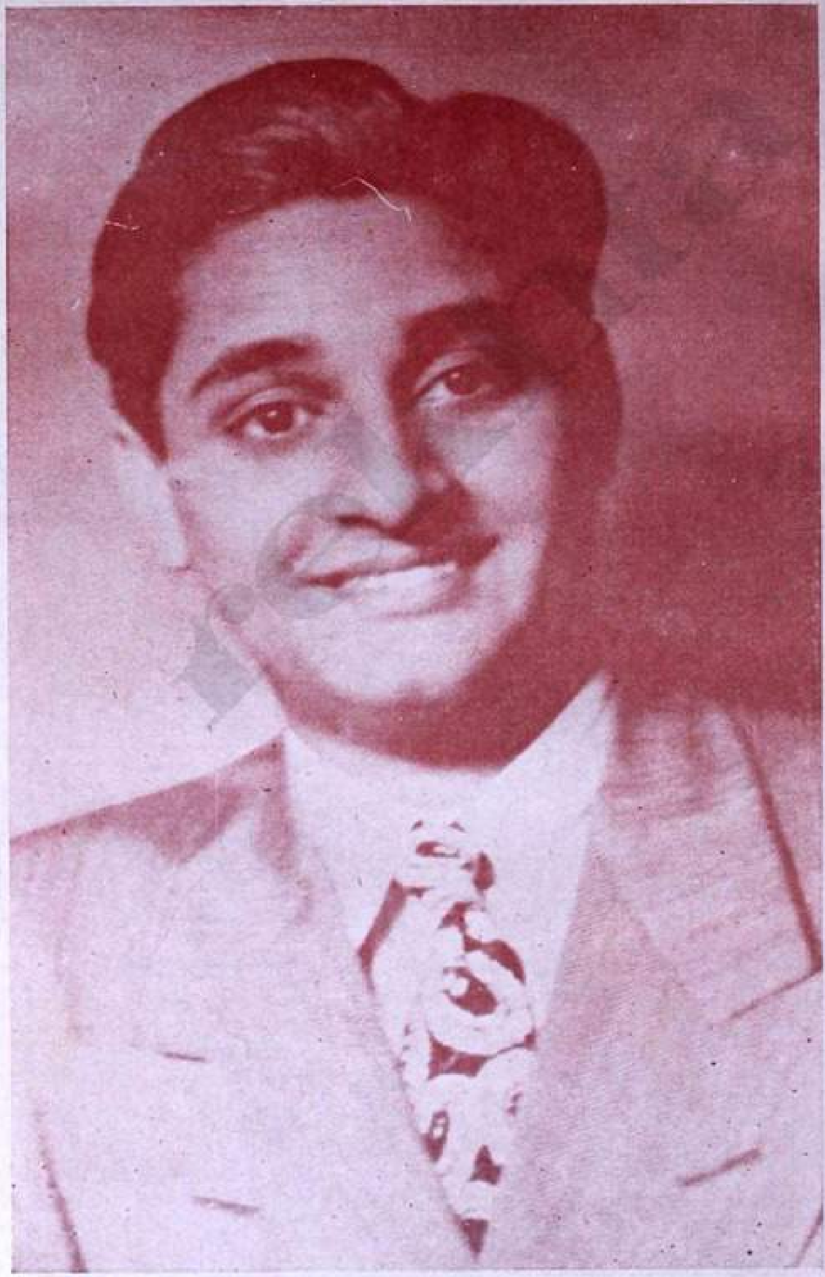


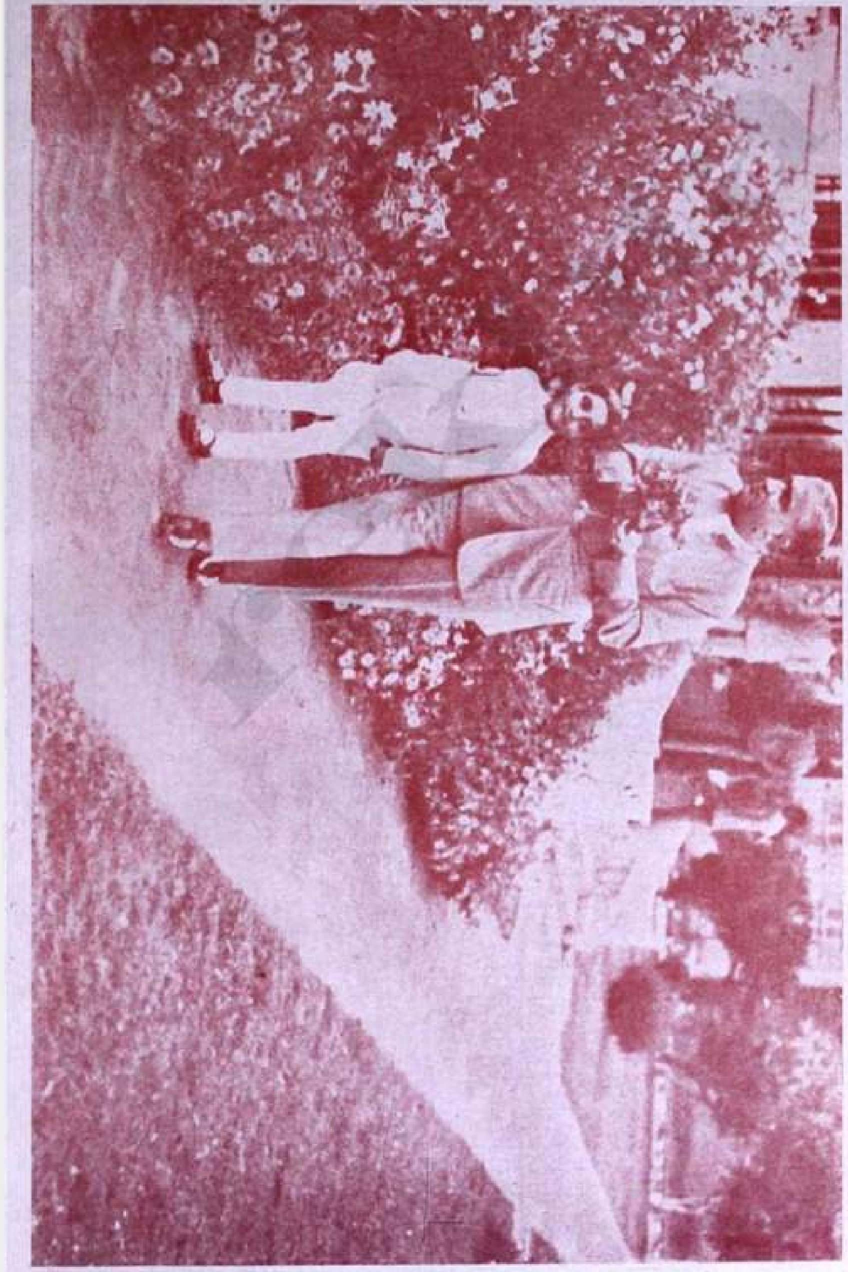
سرو جنی نائیڈو بھی تھیں۔ بمبئی سے ہمارا کاروان بذریعہ ٹرین جموں کے لئے روانہ ہوا۔ جہاں ۳ مئی کو ایک زبردست استقبال ہمارا منتظر تھا۔ میرے والدین ایک کھلی بگھی میں جموں شہر کے درمیان سے گذرے جبکہ میں ان کے پیچھے پیچھے موٹر میں اپنی انگریز نرس مس ڈورس ٹرانیچل کے ہمراہ آرہا تھا۔ پانچ دن کے بعد اس ہنگامہ کو سرینگر میں دہرایا گیا۔ دستاویزات اور بہت سارے لوگوں کے مطابق جن سے میں ملا ہوں، یہ بات عیاں ہے کہ کئی دن تک ضیافتوں، استقبالی چراغاں، مفت فلم شو، مٹھائیوں کی تقسیم، ساز و سنگیت اور متعدد جشنوں کا سلسلہ جاری رہا ۔ ۱۱ مئی کو باقاعدہ طور پر میرے نام رکھنے کی رسم انجام دی گئی۔ اور مسٹر واک فیلڈ نے سنجیدگی کے ساتھ اعلان کیا کہ میں شری یوراج کرن سنگھ کہلاؤں گا۔

تاریخی لحاظ سے جموں و کشمیر میں اسے ڈوگرہ شاہی کا عروج کہا جاسکتا ہے۔ جشنوں کے اختتام کے فوراً بعد ہی ریاست شدید سیاسی ہنگاموں میں ڈوب کے رہ گئی۔ اس کے بعد حالات کبھی نہیں سدھر سکے۔ بہت عجیب بات ہے کہ اتفاق سے میرے جنم کے ساتھ ساتھ ایک غیر معروف اسکول ماسٹر ریاست کی سیاسی اُفق پر نمودار ہوا جسکی آواز کی گونج آج تک جاری ہے۔ ان کا نام شیخ محمد عبداللہ ہے۔ ایک دلیل یہ ہے کہ افراتفری اور شیخ محمد عبداللہ کی حرکتیں برطانوی ذہن کی پیداوار تھیں۔


MARTINEZ



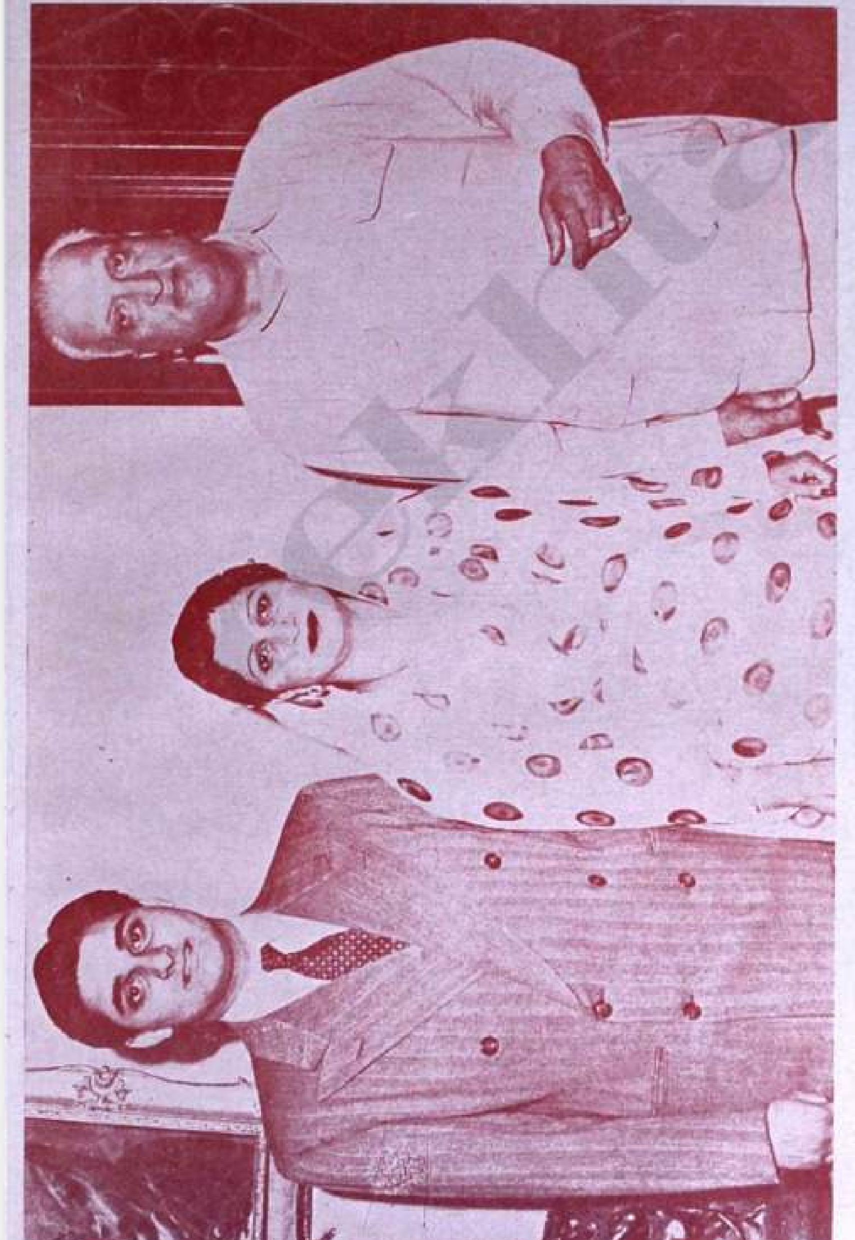


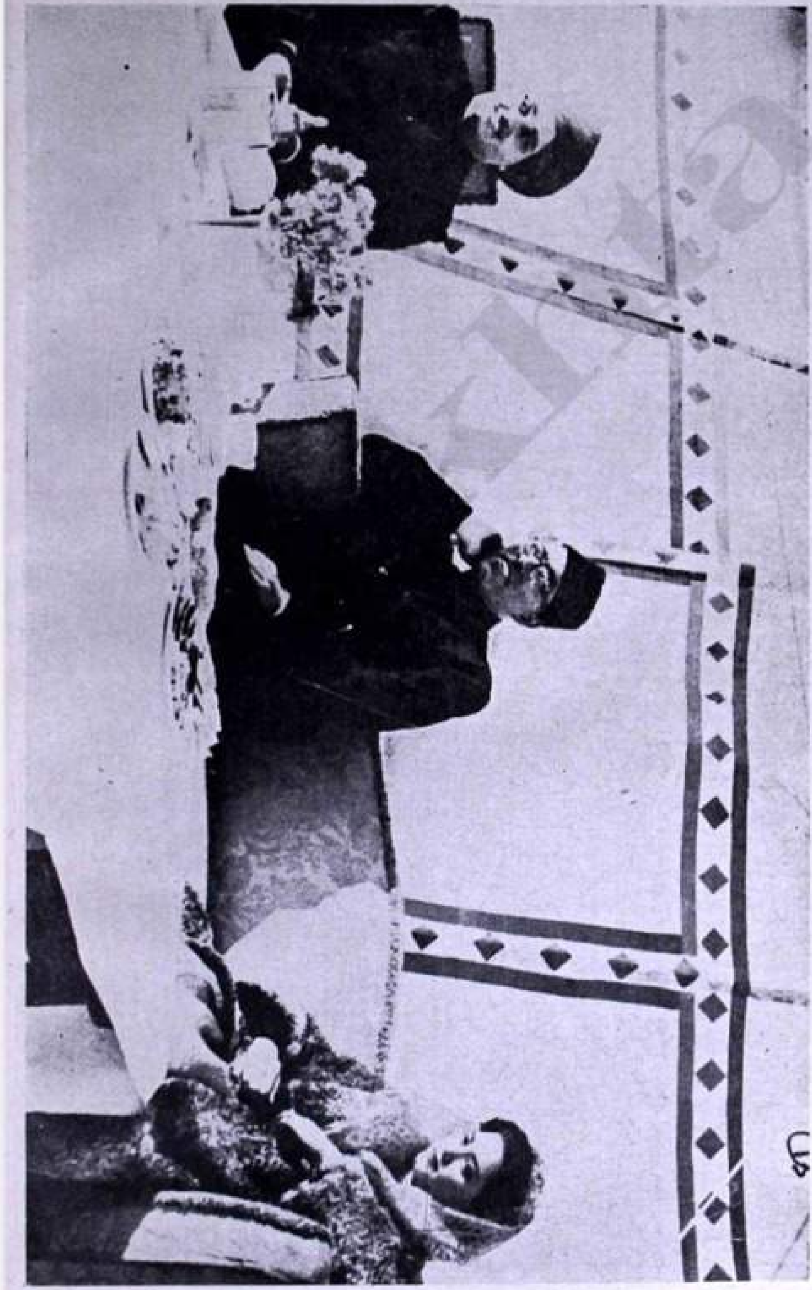




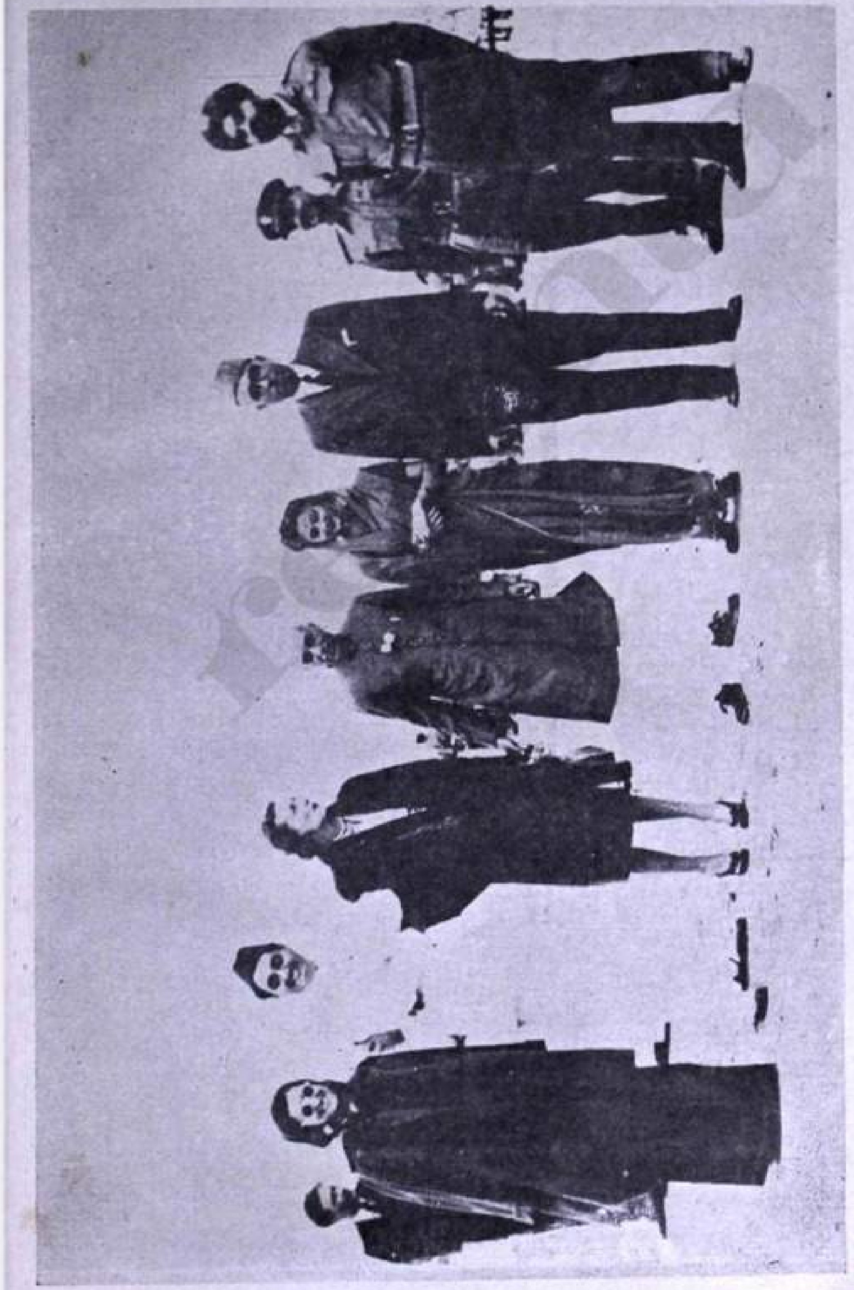




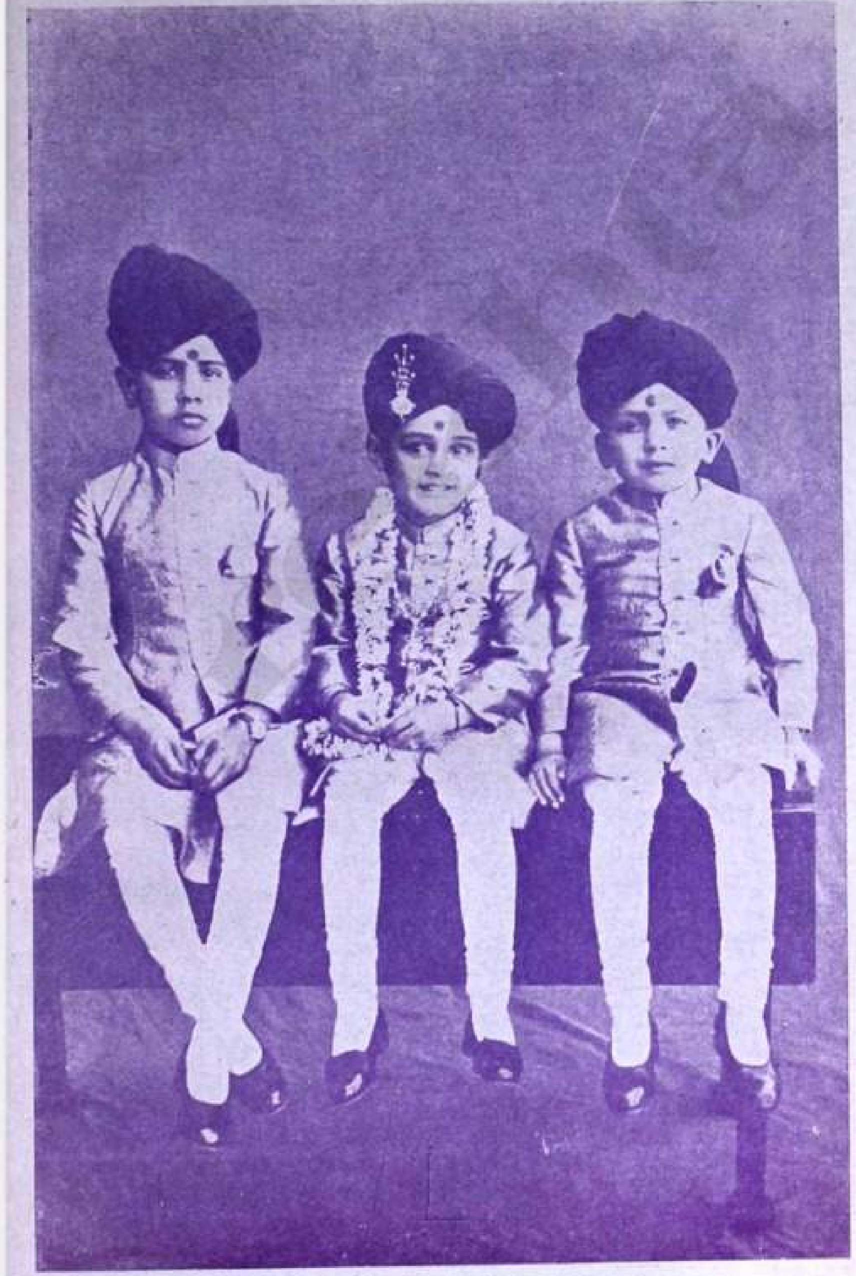


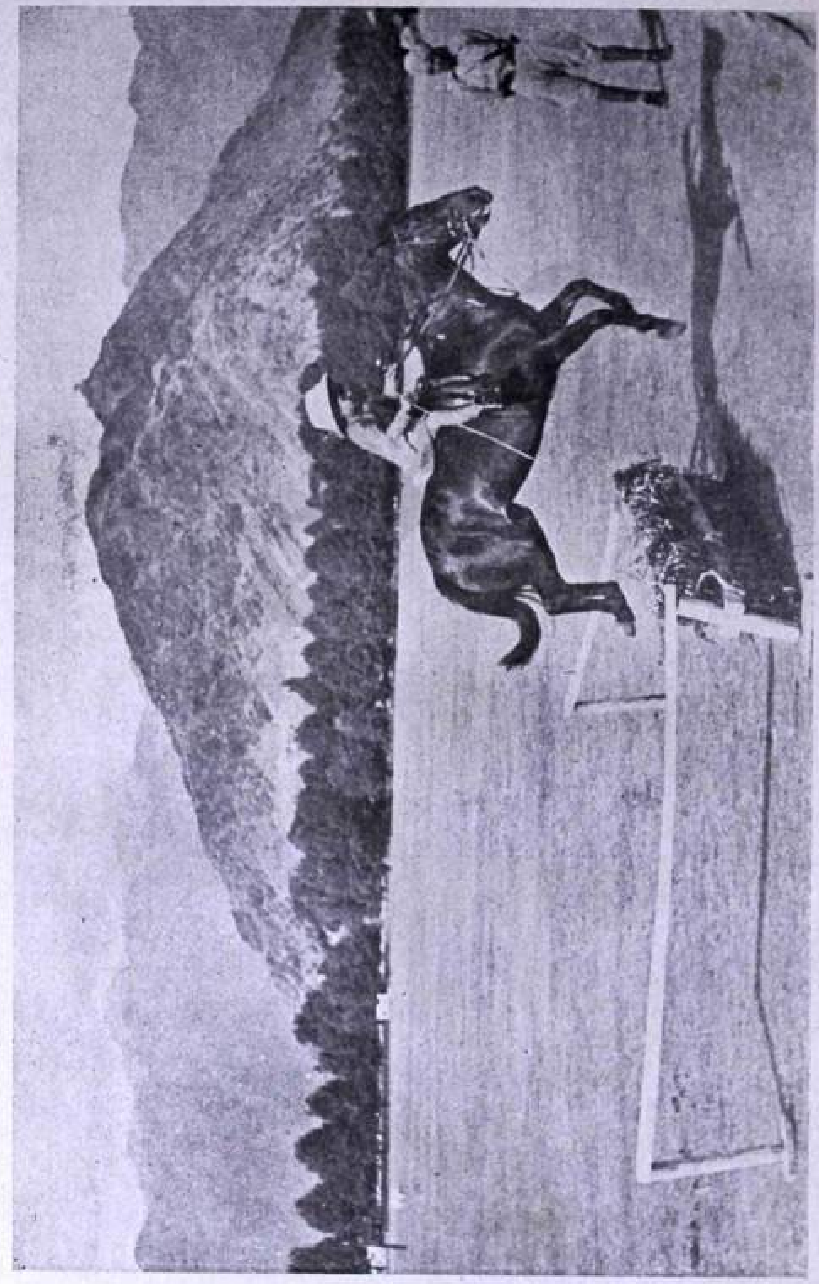




















کیونکہ میری پیدائش نے ان کے DOCTRINE OF LAPSE پر پانی پھیر دیا تھا۔ اور دوسرے یہ کہ وہ میرے باپ جنہوں نے اس سال کے شروع میں گول میز کانفرنس میں حب الوطنی پر مبنی ایک عمدہ تقریر کی تھی، جس میں برطانیہ سے ہندوستانی عوام کے جذبات کے احترام کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا، کو سبق سکھانا چاہتے تھے۔ اپنی تقریر کے دوران انہوں نے کہا تھا کہ بطور ہندوستانی اور اس سرزمین کے وفادار جہاں انہوں نے بچپن میں غذا حاصل کی تھی۔ ہندوستان کے شہزادے اپنے دیگر ہموطنوں کی مانند مکمل طور پر برطانوی متحدہ ہائے ریاستوں میں عزت اور مساوات کی نعمت کے خواہاں ہیں۔

بہرکیف جہاں تک میں پچھلے واقعات کو یاد کر سکتا ہوں اپنے جنم کے بعد کے جشنوں اور تقریبات جن میں میرے مستقبل سے متعلق علم نجوم کی غیر معمولی پُراسرار پیشگوئیاں بھی شامل ہیں ان کی ولولہ انگیز یادوں کے سبب میں بہت محظوظ ہوتا رہا ہوں۔ کچھ عرصہ بعد میں یہ سوچ کر حیران ہوتا کہ آیا جو کچھ میں نے اپنی زندگی میں کیا اس سے وہ خوشی یا امیدیں حق بجانب قرار دی جا سکتی ہیں جو میری پیدائش سے ظاہر ہوئی تھیں۔ اگر لوگوں کے ایک اعشاریہ نے رسمی وفاداری کے بجائے گہرے جذبہ کے تحت میرے جنم پر خوشی منائی تھی تو یہ ایک ایسا

قرض ہے جس کو آنے والے برسوں اور دہائیوں میں پوری طرح سے چکانا ہے۔ پہلے رنگ کے فائلوں کا مطالعہ کرنے پر مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میرے بچپن کی رسومات انتہائی احتیاط سے، جو کہ میرے والد کی خاص خصوصیت تھی، انجام دی گئیں۔ پروگرام صاف ستھرے طریقہ پر چھاپے گئے اور ہر ایک رسم اور معمولی بات کو بھی قلمبند کیا گیا تھا۔ اناج چکھنے کی رسم ۸۔ فروری ۱۹۳۲ء کو انجام دی گئی اور منڈن کی رسم ۹۔ دسمبر ۱۹۳۳ء کو۔ ۱۹۴۷ء تک میرا جنم دن عام تعطیل تصور کیا جاتا تھا۔ قلعہ سے سترہ توپوں کی سلامی دی جاتی تھی۔ شکار کھیلنے، مچھلیاں پکڑنے اور جانوروں کو ذبح کرنے پر پابندی رہتی تھی۔ غریبوں میں خیرات بانٹی جاتی تھی۔ اور تمام شاہی محلات اور سرکاری عمارتوں کو چراغاں کیا جاتا تھا۔ مذہبی رسومات کا انعقاد ہوتا تھا۔ جن میں مجھے لیجایا جاتا تھا۔ اور جن میں میرے والدین اور دیگر رشتہ دار شرکت کرتے تھے۔

میری پرانی یادداشت کے مطابق جموں کے امر محل جو ایک چھوٹا سا محل تھا اور جو اس وقت میوزیم اور لائبریری ہے کے باہر آسمان کو دیکھتا تھا۔ کوئی مجھے اُنگلی سے لامحدود نیلے آسمان میں اُڑنے والے ایک چھوٹے کالے پرندے چیل کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ بعد

میں اسی صحن کے اندر میں ایک چھوٹی سی عمارت میں اپنی صورت آئینہ میں دیکھتا جیسے کہ میں تقریباً اپنے آپ کو پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ تین برس کی عمر میں مجھے ماں سے دور کیا گیا۔ اور گرمیوں میں سرینگر اور سردیوں کے لئے جموں میں میرے لئے الگ قیام گاہیں قائم کی گئیں۔ مجھے ہر روز ماں سے صرف ایک گھنٹہ ملنے کی اجازت تھی۔ اور والد سے ہفتہ میں تین بار مل سکتا تھا۔ دیکھا جائے تو یہ ایک مثالی خاندان کا ماحول نہیں تھا۔ اور اسکی وجہ میرے والدین کے درمیان پائے جانے والی شدید ناموافقت تھی۔ میری والدہ کانگڑہ کی گاؤں کی ایک لڑکی تھی۔ جبکہ میرے والد ہندوستان کی پانچسو ریاستوں میں سے سب میں بڑی ریاست کے حکمران تھے۔ میری ماں بہت مذہبی تھیں جبکہ میرے والد زندگی کے آخری دم تک درحقیقت خدا کے منکر رہے۔ میری والدہ شفیق اور ملنسار تھیں۔ اور بچوں سے پیار کرتی تھیں۔ لیکن میرے والد بہت سخت قسم کے آدمی تھے۔ مخصوص درباریوں اور چند دوستوں میں گھومتے تھے۔ میری ماں گفتگو میں بہت ماہر تھیں۔ لیکن میرے باپ اس قدر خوفناک تھے کہ ان کی موجودگی میں عام نوعیت کی گفتگو اصل میں ناممکن تھی۔

میری والدہ توہم پرست، ہمدرد اور جذباتی تھیں۔ میرے والد صفائی پسند، باریک بین اور تنہائی پسند تھے۔ اس

نفسیاتی اور جذباتی ناموافقت نے ان کے اندر ایک اچھا خاصا تناؤ پیدا کر دیا تھا۔

یہ بات قابل فہم ہے کہ شروع میں میری پوری ہمدردی تقریباً ماں کے ساتھ رہی۔ ان کے ساتھ ملاقاتوں سے میں بہت محظوظ ہوتا۔ جبکہ وہ میرے اُوپر فریفتہ ہوتیں۔ اور میری دوبارہ آمد تک لمحہ لمحہ گنتی رہتیں۔ انہوں نے مجھے ان سے اس بہانہ کہ وہ مجھے خراب کر دیں گی، چھیننے پر اعتراض کیا۔ اور جب ہماری ملاقات کا وقت ختم ہونے کو آتا تو اکثر ان کی آنکھوں سے آنسو چھلکتے۔ برسوں بے قراری کے عالم نے مجھے شدید رنجیدہ رکھا۔ اور اکثر میں راتوں کو جاگتا۔ اور ان کو یاد کر کے سسکیاں بھرتا۔ وہ حسین تھیں، بڑی اور پُر معنی آنکھوں والی جو بحیثیت میرے والد کے دوست کے کہا کرتی تھیں کہ وہ انہیں استعمال کرنا جانتی ہیں۔ بے شک وہ میرے لئے محبت اور عنایت کا انتخاب تھیں۔

جب مجھے ان کے پاس لیجایا جاتا تھا تو پہلے وہ مجھے پوُجا کے کمرہ میں لے جاتیں جہاں وہ میرے ہاتھوں میں پھول اور چند سکے ڈالتیں تاکہ میں انہیں وہاں رکھے ہوئے بھگوانوں اور دیویوں کی تصویروں پر نچھاور کروں۔ تب ہم ان کی نوکرانیوں کے ساتھ کھیل کھیلنے بیٹھ جاتے۔ یا پھر ان کی بھانجیوں اور بھتیجیوں کے ساتھ کھیلتے جو میرے ہم عمر اور واحد رشتہ دار تھے۔ کیونکہ

والد کی جانب سے خاندان میں کوئی قریبی رشتہ دار نہ تھا۔

بعض اوقات ہم سب مسرور کرنے والی شاموں کو امر محل کے بڑے برآمدے میں جمع ہو جاتے۔ جہاں سے شوالک قطار کا عمدہ نظارہ دکھائی دیتا۔ اور جہاں سے ویشنو دیوی کے تین چوٹیوں والے آسمان کو چھونے والے پہاڑ اور دور تک میدانی علاقہ میں پھیلے ہوئے دریائے توی کے نظارے دیکھنے کو ملتے۔ تب چھوٹے مٹی کے دیئے جلا دئے جاتے تھے اور ہم مٹی کے گملے میں اُگائے گئے تُلسی کے پودے کے اردگرد چکّر لگاتے اور اپنی میٹھی مادری زبان ڈوگری میں بھجن گاتے۔ برسوں بعد میں نے ان میں سے ایک گیت کا ترجمہ کیا جس کو عظیم روشنی کی ماں کی نذر کیا

حالانکہ اس وقت میں الفاظ کے پورے معنی نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن مقدس اور دنیاوی بحروں کے امتزاج نے ہمیشہ میرے اُوپر گہرا اثر چھوڑا۔ میری والدہ کو لوک سنگیت پسند تھا۔ ان کی آواز شاندار تھی اور ڈھولک پر اپنی نوکرانیوں اور شہر سے آنے والی رشتہ دار عورتوں کے ساتھ گھنٹوں مل کر گاتیں۔ صریحاً میرا سنگیت کے ساتھ مستقل لگاؤ ابتدائے بچپن کی ڈوگری پہاڑی گیتوں کے سہارے بڑھتا گیا۔ کیونکہ باقی ماندہ زندگی میں سنگیت میرے ضمیر کا غالب رہنے والا بنیادی تصور رہا ہے۔

جبکہ ہر روز اور بعد میں ہفتہ میں صرف تین بار والدہ کے ساتھ ملاقاتوں کا بے چینی سے انتظار رہتا تھا۔ والد کے ساتھ میری ملاقاتیں باعث خوف ہوتی تھیں۔ اگرچہ وہ بہت شفیق تھے لیکن اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ اور میرا فوٹو ہمیشہ اپنے سونے کے سگریٹ کیس میں لگائے رکھتے تھے۔ لیکن ان کی موجودگی اور ان کی شہرت اس قدر ڈراونی تھیں کہ کچھ کہنے کے بارے میں سوچنا مشکل تھا۔ ماں کے ساتھ خوشیوں بھری ملاقات والی بات یہاں نہ تھی۔ اور کئی برس بعد میں نے محسوس کرنا شروع کیا تھا کہ میرے والد کا بیرونی ناگوار دکھاوا واقعی ایک دفاعی ہتھیار تھا۔ جو انہوں نے اپنی زندگی کے حالات کے ذریعہ پیدا کیا تھا۔ ایک اکلوتے بچے کے ناطے جس کو دربار اور خاندان کی چالوں کے بیچ شش پنج کے عالم میں پالا گیا ہو۔ ان کو بالغ ہونے تک خطرناک صورت حال سے گذرنا پڑا ہوگا۔ اور اس کے بعد انگلینڈ کے پہلے سفر میں ہی وہ ایک مکروہ بلیک میلنگ کی سازش کے شکار ہوئے جوان کے لئے ایک بڑی غیر مستحق ملامت کا باعث بنی۔ میری پیدائش کے وقت میرے والد چھتیس برس کے تھے۔ اور چھ برس سے تخت نشین تھے۔ انہوں نے میری پرورش کے رنگ ڈھنگ میں قریبی اور خاص دلچسپی لی۔ لیکن فطرتاً ظاہرداری سے دُور

انکے اور میرے درمیان تعلقات اتنے آزادانہ کبھی نہیں رہے جتنے میرے اور میری والدہ کے درمیان رہے۔ ایک مختصر سا عرصہ آیا جب تعلقات خوشگوار ہو سکتے تھے۔ لیکن مقدر اور سنگدل تاریخ کے جھٹکے نے بیچ میں آکر اس کی نوبت نہ آنے دی۔

باب ۲

ایک الگ قیام گاہ جو پندرہ نوکروں پر مشتمل تھی' میں گیارہ برس کی عمر تک میری دیکھ بھال میرے برطانوی سرپرستوں نے پبلک اسکول میں داخلہ لینے تک سلسلہ وار کی۔ میری سب میں پہلی سرپرست مسز وائٹ دھام تھیں۔ جن کے شوہر کرنل وائٹ دھام اسسٹنٹ ریزیڈنٹ تھے۔ ان کے بارے میں میری یادداشت یہ ہے کہ وہ ایک اُدھیڑ عمر کی خاتون تھیں۔ جو ایک بڑی ہیٹ پہنتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ کرنل نے مجھے ایک مرتبہ دھات کا بنا ہوا خالی سگار کیس دیا تھا۔ جس میں چمکنے والے کندہ المونیم کی لکیریں تھیں۔ جو ایک طرف چاندی سا تھا اور دوسری طرف گہرا سُرخ۔ وائٹ دھام کے بعد

ریچمیز آگئے۔ وہ ا جمیر کے مایو کالج میں استاد رہ چکے تھے۔ اور بظاہر اسکاٹ لینڈ کے رہنے والے تھے۔ کیونکہ میری واحد واضح یادداشت کے مطابق وہ ہم کو چند دلکش اسکاٹ لینڈ کے لوک گیت کی دھنیں اور گیت سکھاتے تھے۔ مسز وائٹ دھام کسی قدر ایک ناگن تھیں۔ جن سے ان کے شوہر سمیت ہم سب سہمے رہتے تھے۔

اسی دوران ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ جب میری عمر چار برس کی تھی' دو ساتھی میرے ساتھ رہنے کے لئے آگئے' جو میرے والد کے قریبی راجپوت درباریوں کے بیٹے تھے۔ وہ تھے دگ وجے سنگھ (ڈگ بی) جو ایک پُرانے ہوشیار منتظم جنہوں نے ریاست کے انتظامیہ میں ایک اہم رول ادا کیا تھا۔ راؤ بہادر کرتار سنگھ کے بیٹے تھے۔ اور دوسرے دگپال سنگھ (بلٹی) تھے۔ جن کے والد میجر فقیر سنگھ کئی برس تک میرے والد کے دربار میں ایک پسندیدہ افسر تھے۔ جب وہ میرے پاس رہنے کو آئے تو مجھے بار بار سخت ہدایت کی یاد دہانی کرائی جاتی تھی اگر میں نے ان کو ایک بار بھی چانٹا مارا تو انہیں مجھے دو چانٹے مارنے ہوں گے۔ اس قسم کی تنبیہہ غیر ضروری ثابت ہوئی' کیونکہ وہ دونوں اس وقت مجھ سے بڑے اور مضبوط تھے اور ہدایت پر عمل کرنے کی نوبت کبھی نہیں آئی۔

اسی دوران میرا نام "ٹائیگر" پڑ چکا تھا۔ ایسا ہوا کہ ایک دن میں اس کمرہ میں رینگتا ہوا چلا گیا۔ جہاں میرے والد اور ان کے قریبی دوست جودھپور کے حکمران مہاراجہ اُمید سنگھ جی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُمید سنگھ جی نے کہا کہ میں ٹائیگر کی طرح چار زانوں پر کھڑا تھا۔ اور اس طرح یہ نام میرے ساتھ چمٹ گیا۔ میرے والد اور ان کے دوست برابر میرا حوالہ ٹائیگر کے طور پر دیتے تھے۔ اور برسوں بعد جواہر لعل نہرو اور انکے ہمعصر والوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ مجھے ٹائیگر پروجکٹ کا صدر بنایا گیا۔ جس کا مقصد اس شاندار جانور کو نیست و نابود ہونے سے بچانا تھا۔ اور مجھے بورڈ آف وائلڈ لائف کا چیرمین بھی بنایا گیا۔ شیر ببر کی جگہ ٹائیگر کو قومی جانور بنوانے کا سہرا میرے ہی سر ہے۔

ہم تینوں، ٹائیگر، ڈگ بی اور بلٹی برسوں اپنی ایک الگ دنیا میں اکٹھے رہے۔ سرینگر میں ہم شنکر آچاریہ پہاڑی پہ ایک خوبصورت چھوٹے بنگلے جس کو اس زمانہ میں تالے منزل کے نام سے پکارا جاتا تھا' میں رہتے تھے۔ یہ نام اس کو میرے باپ کے ایک قریبی دوست پالنپور کے تالے محمد خان کے نام پر رکھا گیا تھا۔ یہاں سے دو طرفہ انوکھا نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے ایک طرف جھیل ڈل ہے۔ جس کے پیچھے بغیر درخت اونچے

پہاڑوں کی قطاریں ہیں۔ جن کے کندھوں کے اُوپر سے ہمیشہ برف سے ڈھکی ہوئی ہر مکھ کی چوٹی جھانکتی نظر آتی ہے۔ جبکہ دوسری جانب مشرق میں گلمرگ سے لیکر شمال میں بانہال تک پھیلا ہوا پیر پنچال کے پہاڑوں کا برف پوش سلسلہ ہے۔ جنھوں میں ہم ایک چھوٹی عمارت جس کا نام کرن نواس تھا' میں رہتے تھے۔ جو بنیادی طور پر ملازموں کی رہائش گاہ تھی۔ اور جو ایک بڑے محل کے ساتھ منسلک تھی۔ یہاں پر ہم کو نوکروں کی مکمل سہولیات حاصل تھیں۔ جن کے ساتھ ہم فٹ بال کھیلتے تھے۔ جبکہ میرے والد کا خانساماں فرنانڈیز ڈیسوزا کبھی کبھار ہمارے ساتھ بیڈ منٹن کھیلنے آتا تھا۔ کھانا پڑھنے اور تفریح کا ایک سخت لائحہ عمل بنا ہوا تھا۔ ہم کو کسی ہندوستانی کھانے یا مٹھائی کھانے کی اجازت نہ تھی۔ اسلئے ہم کو اسی انگریزی کھانے پر اکتفا کرنا پڑتا تھا جو ہمارے اس وقت کے سرپرستوں اور ان کی بیوی کو مرغوب ہوتا تھا۔ چائے ہماری بہترین خوراک تھی۔ جس کے ساتھ مکھن لگائے ہوئے سادہ کیک' میٹھے کیک' ہنٹ لے اور پال مارس کی بنائی ہوئی چھوٹی چھوٹی لذیذ روٹیاں اور سینڈوچز ہم کو چاندی کی رکابیوں میں پیش کی جاتی تھیں۔ بیشک ناشتہ اور چائے ہی انگریزی باورچی خانہ کی خاص چیزیں تھیں۔ جن کی سراہنا کیجا سکتی تھی۔

ہماری پڑھائی پر ایک ہندوستانی استاد شری امرناتھ کھوسلہ کو مقرر کیا گیا تھا۔ جو ہم کو انگریزی' ریاضی اور دوسرے مضامین پڑھاتے تھے۔ وہ بہت ہی خوشنویس تھے۔ اور ہر ماہ ہم تینوں کے بارے میں مکمل رپورٹ بناتے۔ جس میں ہماری پڑھائی' کھیل کود' اور عام برتاؤ درج ہوتا تھا۔ جو ہمارے سرپرست کے پاس جاتی تھی۔ اور انکے توسط سے میرے والد کے پاس جاتی تھی۔ یہ ماسٹر جی تھے جیسے کہ ہم ان کو پکارتے تھے۔ جنہوں نے ایک دن ہم کو سنگ مرمر کی ایک تختی لاکے دکھائی۔ جس کے اُوپر سیپی کے موتی پر بنے ایک دُبلے پتلے دھوتی میں ملبوس شخص کی تصویر بنی تھی۔ "یہ ہندوستان کے ایک عظیم رہنما گاندھی جی ہیں" انہوں نے کہا۔ اسے انہوں نے ہمیں صرف دکھایا۔ اور ہمارے پاس اسے ہمارے گارڈینس (سرپرستوں) کے ساتھ اُلجھنے کے ڈر سے نہیں چھوڑا۔ ہمیں ناشائستہ طریقہ پر چڑانے کی غرض سے کہا جاتا کہ اگر سب ہندوستانی مل کر پیشاب کریں گے تو یہ پورے برطانوی باشندوں کو سمندر میں بہانے کے لئے کافی ہوگا۔ کسی وجہ سے ہم تینوں برطانیہ کے خلاف تھے۔ اگرچہ ہم نے اس کا اظہار کھلم کھلا کبھی نہیں کیا۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں جبکہ میری عمر ساڑھے آٹھ برس کی تھی، مجھے اچھی طرح سے ریڈیو پر دوسری جنگ عظیم شروع ہونے کی خبر سننے کا واقعہ یاد ہے۔ اس کے بعد ہم خفیہ طور جرمنی کی مضبوطی کے خواہاں تھے۔ اور جب کبھی برطانیہ کی ناکامی کی خبر آتی تو ہم خوشی کے مارے اِدھر اُدھر اُچھلتے صرف ایک نوکر رگھوناتھ سنگھ ہمیں زور دیتے ہوئے یہ کہکر ابتدائی ناکامیوں کے باوجود برطانیہ کو کبھی نہیں ہرایا جاسکتا ہے' غصہ دلاتا تھا۔ ہم ان کا مذاق اڑاتے لیکن وہ غیر متزلزل طور پر اپنی رائے پر چرچل کے انداز میں آخری فتح کے بارے میں پُرامید تھا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ کچھ وقت کیلئے بھارتی فوج کی ایک رجمنٹ میں رہ چکا تھا۔ اپنے وقت پر ریچیز کی جگہ کیپٹین اور مسز ریفورڈ نے لی، جو ہمارے برطانوی گارڈینس میں سب میں پسندیدہ ثابت ہوئے۔ کیپٹن رگی ریفورڈ ریاست کے سابق مردم شماری کے کمشنر پہلی جنگ عظیم میں اپنا ایک بازو کھو چکے تھے۔ لیکن وہ اپنی ٹھنٹھ کو حیرت انگیز حد تک استعمال کرتے تھے۔ اور ایک عمدہ شکاری تھے۔ کیتھرائن ریفورڈ ایک خوبصورت اور خاموش طبیعت کی قابل خاتون تھیں اور ان کے بچے جان اور ڈگلس جو ہمارے مقابلے میں بہت

بڑے تھے' انگلینڈ میں زیر تعلیم تھے۔ اور ہر سال چھٹیوں میں آجاتے تھے۔ ریفورڈ کی ملازمت کے دوران ہم نے بیڈ منٹن، ٹینس، فٹ بال اور ہاکی سیکھنا شروع کیا۔ ہمیں کرکٹ سے بھی متعارف کیا گیا۔ اور ہم براڈمین' ہامانڈ اور ایسے ہی دوسرے مثالی کرکٹ ہیروز کو خطوط لکھتے۔ اس کے باوجود کرکٹ میرا پسندہ کھیل نہیں بنا۔ اور میری دلچسپی اس عجیب طویل کھیل میں بے ربط نوعیت کی رہی۔

کبھی کبھار ہم کو خریداری کے لئے جانے کی اجازت دیجاتی تھی۔ عام طور پر ہم چیزیں خریدنے کیلئے گلمرگ جاتے تھے۔ جہاں اس وقت چکا چوند کرنے والی دکانیں تھیں۔ اور جدید بیرونی مصنوعات سے بھری ہوئی تھیں تاکہ برطانوی لوگوں کی ضروریات کو پورا کیا جاسکے۔ جو گرمیوں میں بڑی تعداد میں یہاں جمع ہوتے تھے۔ سردیوں میں جب ہم جموں میں ہوتے تھے تو ہماری خریداری پابندی کے ساتھ پندرہ روزہ اپنے سرپرستوں کے ہمراہ سیالکوٹ میں ہوتی رہی۔ جہاں پہنچنے میں موٹر میں صرف ایک گھنٹہ صرف ہوتا تھا۔ وہاں ہم غلام قادر کے اسٹور میں چائے پیتے۔ اور دوسری طرف کونے کے ایک چھوٹے

ستمبر ۱۹۳۹ء میں جبکہ میری عمر ساڑھے آٹھ برس کی تھی، مجھے اچھی طرح سے ریڈیو پر دوسری جنگ عظیم شروع ہونے کی خبر سننے کا واقعہ یاد ہے۔ اس کے بعد ہم خفیہ طور جرمنی کی مضبوطی کے خواہاں تھے۔ اور جب کبھی برطانیہ کی ناکامی کی خبر آتی تو ہم خوشی کے مارے اِدھر اُدھر اُچھلتے صرف ایک نوکر رگھوناتھ سنگھ ہمیں زور دیتے ہوئے یہ کہکر ابتدائی ناکامیوں کے باوجود برطانیہ کو کبھی نہیں ہرایا جاسکتا ہے، غصہ دلاتا تھا۔ ہم ان کا مذاق اڑاتے لیکن وہ غیر متزلزل طور پر اپنی رائے پر چرچل کے انداز میں آخری فتح کے بارے میں پُرامید تھا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ کچھ وقت کیلئے بھارتی فوج کی ایک رجمنٹ میں رہ چکا تھا۔ اپنے وقت پر ریچیز کی جگہ کیپٹن اور مسز ریفورڈ نے لی، جو ہمارے برطانوی گارڈینس میں سب میں پسندیدہ ثابت ہوئے۔ کیپٹن رگی ریفورڈ ریاست کے سابق مردم شماری کے کمشنر پہلی جنگ عظیم میں اپنا ایک بازو کھو چکے تھے۔ لیکن وہ اپنی ٹھنٹھ کو حیرت انگیز حد تک استعمال کرتے تھے۔ اور ایک عمدہ شکاری تھے۔ کیتھرائن ریفورڈ ایک خوبصورت اور خاموش طبیعت کی قابل خاتون تھیں اور ان کے بچے جان اور ڈگلس جو ہمارے مقابلے میں بہت

بڑے تھے، انگلینڈ میں زیر تعلیم تھے۔ اور ہر سال چھٹیوں میں آجاتے تھے۔ ریفورڈ کی ملازمت کے دوران ہم نے بیڈ منٹن، ٹینس، فٹ بال اور ہاکی سیکھنا شروع کیا۔ ہمیں کرکٹ سے بھی متعارف کیا گیا۔ اور ہم براڈمین، ہامانڈ اور ایسے ہی دوسرے مثالی کرکٹ ہیروز کو خطوط لکھتے۔ اس کے باوجود کرکٹ میرا پسندیدہ کھیل نہیں بنا، اور میری دلچسپی اس عجیب طویل کھیل میں بے ربط نوعیت کی رہی۔

کبھی کبھار ہم کو خریداری کے لئے جانے کی اجازت دیجاتی تھی۔ عام طور پر ہم چیزیں خریدنے کیلئے گلمرگ جاتے تھے۔ جہاں اس وقت چکا چوند کرنے والی دکانیں تھیں۔ اور جدید بیرونی مصنوعات سے بھری ہوئی تھیں تاکہ برطانوی لوگوں کی ضروریات کو پورا کیا جاسکے۔ جو گرمیوں میں بڑی تعداد میں یہاں جمع ہوتے تھے۔ سردیوں میں جب ہم جموں میں ہوتے تھے تو ہماری خریداری پابندی کے ساتھ پندرہ روزہ اپنے سرپرستوں کے ہمراہ سیالکوٹ میں ہوتی رہی۔ جہاں پہنچنے میں موٹر میں صرف ایک گھنٹہ صرف ہوتا تھا۔ وہاں ہم غلام قادر کے اسٹور میں چائے پیتے۔ اور دوسری طرف کونے کے ایک چھوٹے

کتاب گھر سے تفریحی کتابیں COMICS خریدتے۔ ہم انگلینڈ کے تین کامکس کے خریدار بھی تھے۔ میرا ٹائیگر ٹم تھا۔ ڈونالڈ ڈک ڈگ بی کا اور پک بلٹی کی پسند تھی۔

میرے والد ایک عمدہ گھوڑ سوار تھے۔ جبکہ وہ بہت بھاری بھر کم ہونے کی وجہ اوّل نمبر بننے سے قاصر رہے۔ تاہم ان کا شمار پولو میں پانچویں نمبر پر تھا۔ انکی بہت خواہش تھی کہ میں بڑا ہو کر پولو کا کھلاڑی بنوں۔ تین سال کی عمر سے ہی مجھے ہر روز گھوڑے پر زبردستی بٹھایا جاتا۔ شروع شروع میں مجھے ایک بونے گھوڑے کے اُوپر ایک صندوق نما زین پر بٹھا دیا گیا اور آہستہ آہستہ مجھے بڑے گھوڑوں پر چڑھنے کی ترغیب دی گئی۔ کئی بار میں گھوڑے سے گر گیا۔ اور ایک ڈراونا موقعہ ایسا بھی آگیا جب جموّں کے پولو گراؤنڈ میں میرا گھوڑا بے قابو ہو گیا۔ میں سہما ہوا گھوڑے سے تب تک چمٹا رہا جب تک وہ تھک کر خود بخود نہ رک گیا۔

ان برسوں میں، میں نے دنیا کے بعض بہترین چوگان (چوگان کھلاڑی) دیکھے۔ جیسے کہ مشہور جے پور کی چالیس میں سے ۳۵ گھوڑ دوڑ پر مشتمل قابل تعریف تال میل رکھنے والی ٹیم ہر سال سرینگر آتی۔ ہم خواتین کے

مخصوص شامیانہ سے ماں، نانی اور دوسری بڑی عمروں کی خواتین جو سفید کپڑوں میں ملبوس ہوتیں، کے ہمراہ کھیل دیکھتے یہ بعض ایسے موقعے تھے جب میں اپنی بڑی عمروں کی رشتہ دار خواتین سے ملتا۔ حالانکہ ہر دوسرے یا تیسرے ماہ میری ماں مجھے ان سے زنانہ محلات میں ملوانے لے جاتیں۔

ایک واقعہ جو مجھے یاد ہے وہ ہے ۱۹۳۵ء میں۔ کوئٹہ کا زبردست بھونچال۔ ہفتوں تالے منزل کے اندر راتیں گذارنے کی اجازت نہ تھی۔ اور ہمیں اس بات کی خوشی تھی کہ ہم کو باہر باغ میں سونا پڑتا تھا۔ ایک واقعہ اور بھی ہے۔ جب میرے ٹانسل نکالنے مطلوب تھے۔ جموّں کے کرن نواس کے اندر ایک کمرہ کو آپریشن تھیٹر میں تبدیل کیا گیا تھا۔ اور مشہور سرجن کرنل ہارپر نلسن لاہور سے آپریشن کے لئے آئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب مجھے کلوروفارم دیا جانے لگا تو میں کس قدر خوف زدہ تھا اور اس کے بعد اپنے سرہانے ہاتھ میں جگسا GIGSA لئے خصوصی طور اپنے والد کو دیکھنا' مجھے خوش آئندہ حیرانی میں مبتلا کر گیا۔ وہ مسرت آمیز حیرت سے مجھے آئس کریم کھاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ آپریشن کے بعد آئس کریم میرے گلے کے لئے ایک اچھی چیز خیال کی گئی تھی۔ اس حقیقت کہ بھارت کی سرزمین سے میرا

پہلا واسطہ بمبی سے پڑا ' کے علاوہ یہ عظیم شہر میری ابتدائی زندگی میں ایک اہم تجربہ گاہ بنا۔ اگرچہ میرے والد ابتدائی زندگی میں پولو کے شیدائی تھے لیکن بعد میں انہوں نے گھوڑ دوڑ کو بڑے پیمانے پر اپنایا اور اس شوق نے لازمی طور پر ان کو بمبئی کھینچ لیا۔ جہاں ریس کا بہترین انتظام تھا۔ لہذا میرے والد گرمیوں کے چھ مہینے سرینگر میں گذارتے تھے۔ سردیوں میں جموں میں دو ماہ گذارتے اور چار چار ماہ بمبئی میں کاٹتے تھے۔ پہلی بار ہم بمبئی ۱۹۴۰ء میں گئے۔ تو میرے والد کا رمیچیل روڈ پر نشاط ہاؤس نام کی عمارت میں رہے۔ اس سفر کے بارے میں مجھے بس یہی یاد ہے کہ ہمیں سنترہ کا خوش ذائقہ شربت جس کا نام یپور گولڈ تھا ملتا رہتا۔ جو ہم نلکیوں سے افراط سے پیتے۔ واپسی سے ایک روز پہلے ہم تینوں کو بیٹھک میں صوفوں اور قالینوں پر جگہ جگہ سیاہی بکھیرنے پر ڈانٹا گیا تھا۔ دوسرے سال میرے والد ۴۹ نیپین سی روڈ پر فلیٹوں کی قطار میں منتقل ہو گئے جو انہوں نے خرید لیے تھے۔ وہ سب میں اوپر والی چھٹی منزل میں رہتے تھے۔ اور میرے لئے انہوں نے پہلی منزل مخصوص کی تھی۔ جس کے ساتھ چبوترے سے ملا ہوا باغ تھا۔ جو اس زمانہ میں ایک نادر چیز مانی جاتی تھی

ہم وہاں اپنے سرپرستوں کے ہمراہ چند ماہ رہے۔ اس دوران انگریز سرپرستوں کی چھٹی کی گئی تھی۔ اور ان کی جگہ کرنل کیلاش نارائن ہاکسر کو مقرر کیا گیا۔ یہ ایک کھلا راز تھا کہ میرے والد انہیں ایک سیاسی صلاح کار کے طور پر مقرر کرنا چاہتے تھے۔ اور کسی حد تک انکو ولی عہد کیلئے سرپرست مقرر کرنا ایک واضح چال تھی۔ یہ باتیں میرے والد کے عجیب قسم کے رجحان کو نمایاں کرتی ہیں۔ جو کہ آخر میں انکی سیاسی تباہی اور زیادہ دیر تک کسی پر بھروسہ نہ کرنے کی نااہلیت کو ثابت کرتی ہیں۔ وہ اپنے وزیر اعظموں کا انتخاب بہت احتیاط کے ساتھ کرتے تھے۔ لیکن جونہی وہ کسی کو وزیر اعظم مقرر کرتے تھے وہ کسی اور کو پاسنگ کے طور پر تیار کرنا شروع کر دیتے۔ این گوپالا سوامی آئنگر واحد شخص ہیں جو ۱۹۳۴ء سے لیکر ۱۹۳۹ء تک چھ برس کے لئے ریاست کے وزیر اعظم رہے اور اس خصوصی قسم کے برتاؤ سے بچے رہے۔ ان کے بعد آنے والے سبھی وزیر اعظموں راجا مہاراج سنگھ۔ بی۔ این۔ راؤ کرنل کے۔ ایس ہاکسر۔ پنڈت رام چند کاک اور جنرل جنک سنگھ سے لیکر ۱۹۴۷ء کے ہنگامی حالات تک صورت حال جوں کی توں رہی۔

کرنل ہاکسر ایک چوڑے چکلے آدمی تھے۔ انکی بھوئیں گھنی تھیں سونے کی حاشیہ دار عینک لگاتے اور فوجی انداز میں چلنا یہ سب چیزیں مل کر انکو بارعب بنا دیتی تھیں۔ لیکن ظاہری سخت گیری کے باوجود وہ مجھے بہت چاہتے تھے۔ اور مجھے اکثر پیار سے اپنے گھٹنوں

پر بٹھا دیتے۔ مجھے شک ہے کہ میرے والد ان سے فضول ہی خوف زدہ تھے
حالانکہ انکی غیر موجودگی میں وہ ہمارے ساتھ ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ لیکن
جب وہ (ہاکسر صاحب) کمرے میں ہوتے تو والد صاحب محتاط رہتے۔ اس
کے برعکس کرنل ہاکسر جبکہ میرے والد کے وفادار تھے کسی طور وہ سب
انہیں پسند نہیں تھا جو وہ (والد صاحب) کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ
ایک دن جب ہم والد کے ساتھ ایک میٹنگ کے بعد موٹر میں جا رہے
تھے تو مجھ سے سنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔ "فائیگر احتیاط کے ساتھ دیکھتے
رہنا۔ تاکہ جب تم بالغ ہو جاؤ گے تو تم کو معلوم ہوگا کہ کیا نہیں کرنا چاہئے"
کرنل ہاکسر کی بڑی صاحبزادی شاما واتل بچوں کیلئے بہت ہی کارگر تھیں
اور ان کے پھسلانے پر میں نے آٹھ صفحات کی اپنی پہلی کتاب لکھ
ڈالی جو نظموں اور مضامین کا مجموعہ تھا۔ بمبئی میں مجھ کو ڈگ بی اور
بلٹی کے ساتھ ۱۹۴۰ء میں کیتھڈرل ہائی اسکول میں داخل کیا گیا۔ اس
زمانہ میں اس اسکول میں انگریز، پارسی اور اینگلو انڈین لڑکوں کا غلبہ
تھا۔ ہم تین سنگھ نمبر ایک سنگھ نمبر دو اور سنگھ نمبر تین کے ناموں سے
جانے جاتے تھے۔ اس طرح کے مخصوص لقب کسی قدر ناپسندیدہ
تھے۔ حالانکہ دوسرے برس میں گرمیوں میں پھر واپس گیا۔ تاہم میں
کہہ نہیں سکتا ہوں کہ میں نے اس قابل ادارہ سے کوئی خاص فائدہ
حاصل کیا ہو۔ پیلو مودی جو ڈون اسکول میں اس وقت زیر تعلیم
تھے جب میں بعد میں وہاں داخل ہوا، لکھ چکے ہیں کہ ذوالفقار علی

بھٹو کیتھڈرل اسکول میں انکے ہم جماعتی تھے۔ جس کا مطلب ہے کہ ہم وہاں
ایک ہی وقت میں رہے ہونگے حالانکہ اسکول میں مجھے بھٹو کی کوئی یاداشت
نہیں۔ سبھی اساتذہ انگریز تھے۔ یہاں تک کہ اردو پڑھانے والے
استاد بھی ایک انگریز تھے۔ جو لگتا تھا کہ اس خوبصورت زبان کا
ٹھیک ڈھنگ سے ایک جملہ بھی بولنے سے قاصر تھے۔ ساتھی شہزادوں
کے علاوہ میرے والد کے دوستوں کا زیادہ تر تعلق رئیس کے دائرے
وابستہ لوگوں سے تھا۔ لیکن انکے دوستوں میں فرنگیوں کی ایک
چھوٹی ٹولی تھی۔ جن کو میں اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ وکٹر روزنتھل
ایک فرانسیسی جوہری تھے جن کو بہت ہی اتار چڑھاو اور افسانوی
زندگی ملی ہوئی تھی۔ راستہ میں دولت بناتے اور گنواتے، کھڑی
داڑھی والے دلچسپ اور گرم مزاج آدمی تھے۔ وہ میرے والد کو
برسوں سے جانتے تھے۔ اور ان کے زیادہ تر ہیرے جواہرات اور
بیرونی ممالک میں لگائے گئے ان کے روپے پیسے کا حساب و کتاب
رکھتے تھے۔ وہ گرمیوں میں پابندی سے کشمیر کی سیر کرتے، اور ہمیشہ
میرے لئے خوبصورت تحفے لاتے تھے۔ موپاسنت اور او۔ ہنری
کی کتابیں لاتے۔ جنہیں میں بہت شوق سے پڑھتا۔ بالوں کیلئے
پلاسٹک برش کا ایک سیٹ اور سوئٹزرلینڈ کے چاکلیٹوں کے
ڈبے لا دیتے۔ میں نے ان کو فرانسیسی اسلئے قرار دیا کیونکہ
وہ فرانس میں رہتے تھے۔ اور ہم سب یہی سوچتے تھے کہ یہی انکی

قومیت ہے۔ کئی برس بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ دراصل روسی باشندہ تھے۔ جو مکمل داڑھی سمیت باہر چلے گئے تھے۔ تقریباً اسی دوران جب لینن نمودار ہوئے۔ فریڈی اور سٹیلن ایک انگریز جوڑا میرے والدین کا اچھا دوست تھا۔ فریڈی برطانوی فرم کلک نکسن میں ملازم تھے۔ جبکہ بیرل ایک خوبصورت اور زندہ دل خاتون تھیں۔ اور تقریباً میرے والد کی ہم عمر تھیں جو میری یاداشت کے مطابق وہ واحد شخص تھیں جو میرے والد کو ستاتیں اور انکے ساتھ بالکل عام نوعیت سے بات چیت کرسکتی تھیں۔ اور یہ ایک ایسا فعل تھا جو اس زمانہ میں بہت ہی عجیب و غریب سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستانیوں میں ایم۔ ایچ۔ احمد بھولیؒ اور انکی بیوی رُضاؒ اکثر ہمارے گھر آتے، محض اسلئے نہیں کہ انکو ریس سے دلچسپی تھی بلکہ اس لئے بھی کہ وہ عمدہ گائک بھی تھے۔ محمود سیٹھ اگرچہ گاتے وقت عجیب حرکتیں کرتے تھے تاہم وہ بہترین فنکاروں میں سے ایک تھے۔ ان کے ہم پلہ کوئی دوسرا میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ٹھُمری ان کی خاص چیز تھی۔ اور میرے والد اکثر انکے ہمراہ موسیقی کی محفلوں کا اہتمام کرتے جن میں ہندوستان کے بہترین فنکار شرکت کرتے جن میں کیسر بھائی کرکر، سدھیشوری بائی، بیگم اختر منیکا شرو دکرشنا ل ہوتے تھے۔ میرے والد خود نہیں گاتے تھے لیکن انہیں اچھے گانے کی عمدہ پہچان تھی۔ قریب اسی دوران انہوں نے مجھے

کلاسیکی میوزک سیکھنے میں لگا دیا۔ یہ ایک ایسا فعل تھا جس کے لئے میں ابدی طور ان کا قرض دار ہوں۔ میرے پہلے اُستاد نیپال ترے سے بلراج سنگھ راوت تھے۔ وہ کوئی بہت مشہور سنگیت کار تو نہ تھے لیکن وہ ایک معقول اُستاد ضرور تھے۔ اور چند برسوں میں، میں نے کئی راگ سیکھ لئے۔ مشہور آگرہ گھرانے کے استاد ولایت حسین موسم گرما میں دو مرتبہ مجھے سکھانے کے لئے آتے۔ تقریباً تین سال بعد میرے والد نے میرے گانوں کے کچھ ریکارڈ پرائیویٹ طور تقسیم کرنے کے لئے تیار کرائے۔ جنہیں وہ فخر سے اپنے دوستوں کو بھیجتے۔

سنگیت میری زندگی کی ایک اہم قوت رہی ہے۔ پہلی دھن جو مجھے یاد ہے اس وقت کی تھی جب میری عمر چار پانچ سال کی تھی۔ بالک کرشن کی تعریف میں ایک ہر دلعزیز بھجن "سنا دی سنا دی، سنا دی کرشنا' تو بانسری دی تان سنا دی کرشنا" کچھ برس بعد سرینگر میں ایک نیا سینما ہال کھلا جس کا نام امریش تھا۔ سینما کے مالک پنڈت کرشن بل تھیٹر کا نام میرے نام پر رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن میرے والد نے اجازت نہیں دی۔ اسلئے انہوں نے اپنے چھوٹے بیٹے کے نام پر اسکا نام رکھدیا۔

رسمِ افتتاح کے موقعہ پر میں اپنے والدین کے ساتھ گیا۔ جس کے لئے مشہور و معروف اداکارہ اور ناچنے والی سادھنا بوس کلکتہ سے آئی ہوئی تھیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس موقعہ پر وہ

ایک مختصر سا لباس زیب تن کئے ہوئے ایک بڑے ڈھول کے اوپر زیادہ ترسنگ تراشی کے کئی اسٹائلوں کو مؤثر طور پر اجاگر کرتی ہوئی ناچ رہی تھیں تاہم یہاں ایک اور ناچ بھی دکھایا گیا جس میں ایک آدمی نے نیلے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ اور ایک لڑکی سبز رنگ کے کپڑوں میں ملبوس تھی۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے دلکش ناچ دکھائے۔ سنگیت میرے ساتھ تب تک رہے گا جب تک میں زندہ ہوں جیسے کہ پانچ سروں والا راگ بھوپالی۔ جوں ہی میں نے اس راگ کو سنا مجھے ایسا لگا جیسے میرے وجود کے اندر عجیب طریقہ پر کوئی چشمہ پھوٹا ہو اور سنگیت میری انگلیوں کے سروں سے بہنے لگا۔ ہفتوں ان عمدہ راگوں کا بہاؤ میری رگوں میں موجزن رہا۔ بعد میں، میں نے بلرام سنگھ سے اسی راگ پر کئی گیت سنے اور اس کے علاوہ دو اور ایسے ہی حیرت انگیز راگ، درگا اور مالکونا سنے۔ ایک بار میرے اندر راگ کا بیج بو یا جاتا۔ یہ پھلتا جاتا اور بڑھتا رہتا۔ یہاں تک کہ میں اپنے پورے وجود کو اس کے بحر پر تھرکتے ہوئے محسوس کرتا۔

میرے والد رائفل اور شارٹ گن دونوں کے عمدہ شکاری تھے۔ اور مرغابیوں اور کشمیری چکور کے شکار کا بین الاقوامی ریکارڈ قائم کر چکے تھے۔ انکی شکار پارٹیاں باریک بینی سے مرتب دی جاتی تھیں۔ ہر ایک مہمان کو کارتوس اور کھانے کے پیکٹوں کے ساتھ لال شراب مہیا کی جاتی تھی۔ سری نگر کے مغرب میں ہاکر سر اور

کی کھلی جھیلوں میں مرغابیوں کا شکار صبح سویرے شروع ہوتا تھا۔ ہم سب ایک جلوس کی صورت میں روانہ ہو کر جھیل کے کنارے پر جمع ہو جاتے اور وقت مقررہ پر کشتیوں میں سوار ہو کر اپنی اپنی مچانوں کی طرف چل دیتے۔ وہاں تمام دن مختلف قسم کی مرغابیوں کو موت کی گھاٹ اتارنے میں گذر جاتا۔ جن میں بعض اوقات جنگلی ہنس بھی شامل ہوتے تھے۔ ایک خصوصی برتاؤ کے پیش نظر میرے والد شکار کرتے وقت مجھے اپنے پیچھے بٹھا دیتے اور جب وہ کسی پرندہ کو گرا دیتے تو میں سونے کی میز کو کھٹکھٹاتا۔ وہ وبلے اور سارٹ گنز کی تین دونلیاں استعمال کرتے اور انکے دونوں طرف دونلیوں کو بھرنے کیلئے ایک ایک آدمی کھڑا رہتا تھا۔ پہلی بندوق چلانے کے بعد وہ اسے اپنے بائیں طرف کھڑے آدمی کو تھما دیتے اور دائیں طرف کھڑے آدمی سے بھری ہوئی بندوق لے لیتے۔ جب تک وہ دوسری بندوق چلاتے اتنی دیر میں پہلی بندوق بھر دی گئی ہوتی۔ اور یہ سلسلہ گھنٹوں جاری رہتا۔ ایسے کئی واقعات مجھے یاد ہیں۔ جب مرغابیاں جھیل کو پار کرتی ہوئی آتیں۔ اور نشانہ کی حدود میں آتے ہی میرے والد پہلی بندوق سے دو پرندے گرا دیتے۔ دوسرے دو پرندے سر کے اوپر سے دوسری بندوق سے اور مزید دو پرندے تیسری بندوق سے جب وہ انکے اوپر سے اڑتے ہوئے آگے پہنچ گئے ہوتے۔ لیکن نشانہ کی حد میں ہوتے۔ میں انکی مہارت کا بے حد قائل تھا۔

بڑے شکار میں بھی وہ بہت ماہر تھے۔ کشمیر کے ارد گرد ایک حصہ اور جموں کے علاقہ میں ادھمپور کی ہمسائیگی میں انہوں نے چند عمدہ شکار گاہوں کو بڑھاوا دیا تھا۔ کئی ایسے موقعوں پر میں انکے ساتھ تھا۔ جب انہوں نے کالے ریچھ، جنگلی سور، چیتے اور افسوس! کشمیر کی بے مثال بارہ سنگا (ہانگل) (جو اب قریب قریب نایاب ہیں) کا شکار کیا۔ صبح کے وقت اکتوبر کی سرد ہوائیں صاف اور بیدار ہوتی تھیں۔ پہاڑی اطراف بھورے اور سنہرے رنگ میں رنگے ہوئے اور اس پر ورثے میں ملا شکار کرنے کا روگ اور شوق یہ ایسی باتیں تھیں جو لوگوں میں خون کی رفتار کو تیز کر دیتی تھیں۔ شکار کرنے کے علاوہ کشمیر میں ٹروٹ مچھلیاں پکڑنا دنیا کے بہترین مچھلی شکاروں میں سے ایک ہے۔ ایک صدی پہلے میرے پردادا مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ملکہ وکٹوریہ کو تحفہ کے طور پر کشمیری پشمینہ دینے والے بکروں کا ایک جوڑا بھیجا تھا۔ اس آدمی نے جو انہیں لینے کیلئے آیا تھا۔ اس نے واپس جاکر ملکہ سے کہا تھا کہ کشمیر کی پہاڑی ندیاں ٹروٹ مچھلی کیلئے نہایت ہی موزوں ہیں۔ جس پر مہیب انگریز ملکہ نے واپسی تحفے کے طور پر چھوٹی چھوٹی ٹروٹ مچھلیوں کا ایک بھرا ٹینک بھیجا۔ کشمیر میں یہ مچھلیاں اس قدر پھلی پھولیں کہ انہوں نے اپنے اجداد پر سبقت لی۔ انگلینڈ میں ایک پونڈ سے اُوپر وزن کی مچھلی کو ایک اچھا شکار

تصور کیا جاتا ہے۔ مجھے وہ دن بھی یاد ہیں جب میرے والد ۲ دو پونڈ سے کم وزن کی مچھلیوں کو واپس پانی میں پھینک دیتے تھے۔ انہوں نے جو سب سے بڑی مچھلی پکڑی تھی اسکا وزن ساڑھے چودہ پونڈ تھا۔ لیکن ہریانہ کے مچھلی فارم میں حیرت انگیز طور پر ایک بھورے رنگ کی مچھلی کا وزن ۳۷ سنتالیس پونڈ تک بڑھ گیا۔ پہلگام سے نیچے کی طرف بہنے والے لدر دریائے جھر بچر اور سنبل کے مقامات پر والد کے ساتھ مچھلی شکار پر جانا میرے لئے باعث مسرت ہوتا تھا۔ ندیاں جیسے باغات سے گذرتی تھیں۔ آدمی صبح سویرے اُٹھ کر ناشتہ کے لئے مچھلیاں پکڑ لیتا۔ دن بھر ہم مچھلیاں پکڑنے میں باہر رہتے اور شام کو ٹھکانے پر واپس لوٹتے۔ اگر میرے والد اچھا شکار کرتے تو خوشی رہتی تھی لیکن اگر ان کا دن خراب گذر جاتا یا کسی بڑی مچھلی کو کھو دیتے تو وہ بہت برہم رہتے تھے۔ جس کا ہمیشہ یہ مطلب ہوتا تھا کہ کوئی بدقسمت نوکر یا شکاری آدھی رات کو نوکری سے نکال دیا جاتا تھا۔ ہم سب تب خاموشی سے بیٹھتے اور مٹی کے تیل سے جلنے والے لیمپوں اور باہر بہنے والی ندی کی آواز سنتے۔ ہم بولنے کی جسارت نہ کرتے۔ دراصل میرے والد میں جاگیردارانہ نظام میں عام پانے والی خصوصیات موجود تھیں۔ وہ بہت غصیلے تھے۔ شکار، مچھلی پکڑنے پولو یا گھوڑ دوڑ میں ایک معمولی سی ناکامی انہیں برہم کر دیتی۔ ان کا موڈ کئی روز تک خراب رہتا۔ اور اسکا لازمی نتیجہ۔ استاف

کے کچھ بے بس نوجوان یا نوکروں کی نااہلیت یا بُرے برتاؤ کے سلسلے
میں مقدمہ (لمبی پوچھ تاچھ) لکلتا تھا۔ جوں جوں میں بڑھتا گیا اس طرح
کی ظالمانہ تحقیقاتوں نے مجھے مشتعل کرنا شروع کیا۔ اور میرے اندر
اس ماحول سے متعلق بڑھتے ہوئے فرار میں اضافہ کیا، جس میں میرا
جنم ہوا تھا۔ جہاں حاکم تھا لیکن فیاضی نہیں تھی۔ جہاں طاقت تھی
لیکن ہمدردی نہ تھی۔

سرینگر سے محض بارہ میل دور داچھی گام میرے والد کا ایک
پسندیدہ اڈہ تھا۔ ہارون کے تالاب سے آگے (کہا جاتا ہے کہ
چوبیس سو سال پہلے یہاں بین الاقوامی بدھ مت کی کانفرنس ہوئی تھی)
سڑک ایک گہری وادی کی طرف مڑتی ہے۔ مخصوص جگہ کی ڈیوڑھی
سے چار میل آگے ایک کھلی جگہ ہے۔ جس میں میرے والد کی مشہور
شکاری قیامگاہ تعمیر کی گئی تھی۔ شکارگاہ کالے ریچھ اور جنگلی سوروں سے
بھری رہتی تھی۔ جبکہ موسم خزاں میں لاجواب ہانگل نیچے کو آنے والی برف کی
دھار سے ہوتے ہوئے نیچے کی طرف آتے تھے۔ قیام گاہ سادہ مگر خوبصورت
تھی جس میں سونے کے چھ کمرے ہیں جن کے ساتھ غسلخانے بھی ہیں۔
قیام گاہ میں دیوان خانے اور کھانے کا کمرہ بھی شامل ہے۔ دیواریں قدرتی
رنگ دار ریشم کے کپڑے سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ یہاں سے قابل دید نظارہ
نظر آتا۔ تین اطراف سے آسمان کو چھوتے ہوئے گھنے جنگل سے بھرے
پہاڑ ہیں۔ جبکہ قیامگاہ سے ذرا پیچھے گھاس اور چھوٹی چھوٹی کالی چٹانوں

سے گھری ہوئی ایک پست پہاڑی ایک مکمل توازن مہیا کرتی تھی۔ باغ میں
چار بڑے اخروٹ کے درخت اور گوناگوں رنگوں کے گلابوں کی کیاریاں اور
بہت سے سرسبز لان تھے۔

سرینگر میں اپنے قیام کے دوران ہم یہاں کم از کم چھ بار آتے۔
میرے والد کبھی کبھی ریچھ یا سور کا شکار کرتے۔ ایک بار انہوں نے قیام
گاہ کے برآمدے سے ایک ریچھ کو مارا۔ لیکن زیادہ تر یہاں پکنک ہی
رہتی تھی۔ ان کا شکاری سارس کی مانند بلدار ایک کشمیری، رحمان وانی
تھا۔ جس کا چہرہ ایک تراشے ہوئے سخت پتھر جیسا تھا اور جس کی
لال مونچھیں متاثر کن تھیں۔ بعض اوقات ہم یہاں والدہ انکی کنیز
وزیرنی سیتا، رشتہ داروں اور نوکرانیوں کے ساتھ آتے اور صحن
میں گلاب کی جھاڑیوں کے درمیان آنکھ مچولی کا کھیل کھیلتے۔ بڑے
درختوں میں سے ہوا کا گانا، وادی کے درمیان سے لگاتار نہر کا دھیرے
دھیرے بہنا، نیلا آسمان اور جنگلوں کی ہریالی (ایک خوش آہنگ
فرق کے باوجود) اکٹھی ہوکر داچھی گام کو سحر انگیز بنا دیتی تھیں۔ آدمی
یہاں ایک مختلف ہی نظارے میں داخل ہوتا۔ یہ ایک ایسی دنیا تھی
جہاں ایک طرح سے بنی نوع انسان وافر مقدار میں تھے۔ اور جہاں وقت
اور رفتار کا احساس مٹ جاتا تھا۔ دوسری نادر جگہ جھیل ڈل
کے جزیرے میں ایک چھوٹا مکان ہے۔ جو بنیادی طور پر میری دادی
کا کبوتر خانہ تھا۔ کشمیری میں اس کا نام کبوتر خانہ پڑ گیا۔ حالانکہ بعد میں

اس کا نام لیک پولین اور لکشمی کنیر رکھا گیا۔ لیکن شروع کا نام اس کے ساتھ چمٹ گیا۔ کبوتر خانہ سے ایک سو اسی ڈگری پر پھیلے ہوئے پہاڑوں کا منظر جو ایک بڑی تماشگاہ کی مانند ہیں' واقعی دلفریب ہے۔ پہاڑوں کے درمیان رہنا مجھے ہمیشہ پسند ہے۔ حالانکہ ان پر چڑھنے کی خواہش مجھ میں کبھی نہیں رہی۔ میں انہیں محض دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ انہیں اپنے شعور کے اندر شگفتگی کے طور پر محسوس کرتا ہوں۔ ان کا پرسکون اور جلد بازی سے مبرا توازن' روزمرہ کی گھما گھمی' حسد اور چالبازی کی زندگی کے برعکس فرحت مہیا کرتا ہے مجھے زمین کے ایک سرے سے دوسرے تک گھومنے کے مواقع ملے ہیں۔ اور میں نے یہی پایا کہ سبھی بڑے پہاڑی سلسلوں جیسے ہمالیہ' الپا' انڈس میں انسانی شعور کو بڑھاوا دینے کی یہ خوبی موجود ہے۔

یہ کشمیر کی غضب کی قدرتی خوبصورتی تھی جس نے مجھے راز پنہاں (زہر کا دوسرا نام زندگی ہے) کے دل میں اترنے والے گہرے سوالات پوچھنا سکھایا تھا۔ ابتدائے بچپن میں میرے مذہبی جذبات زیادہ تر میری ماں کی روایتی عبادت تک محدود تھے۔ جو عبادت سچی تو تھی لیکن محدود تھی۔ بیتے ہوئے دنوں کو دیکھتا ہوں تو یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کشمیر کی سادہ جسمانی خوبصورتی' اس کے پہاڑ اور وادیاں' دریا اور جنگلات' دھان کے کھیتوں اور پھیلے ہوئے پہاڑی راستوں نے میرے اندر خوبصورتی سے

واقفیت کو تقویت بخشی۔ مجھے جذبہ انسانیت کے نرم اور عمدہ پہلوؤں کے تئیں زیادہ مائل بنا دیا۔ اور یہ وہ پہلو ہیں جن کو موجودہ زندگی کے لگاتار تقاضے مٹی میں ملا رہے ہیں۔ قدرتی خوبصورت ماحول میں پرورش پانے کا ایک خاص اور انمول فائدہ ہے۔ یہ عجیب ہے کہ ہندوستان میں ہم کس طرح قدرتی خوبصورتی کو فراموش کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بچے اکثر اس منظر سے بے خبر رہتے ہیں۔ دراصل یہ میرے برطانوی سرپرست اور برلے سٹائل میں جیسے لوگ تھے جن پر خوبصورت مناظر اور غروب آفتاب کو دیکھ کر بے خودی طاری ہوتی تھی۔ اس وقت ہم کو یہ صورت حال محفوظ کرتی تھی اور ہم پوشیدہ طور اس خیال سے کہ ہندوستان بظاہر انگلینڈ سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے' اپنے آپ کو برتر محسوس کرتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ اپنی قدرتی خوبصورتی کو نئی آنکھوں سے جو پہلے کے مقابلہ میں زیادہ کھلی تھیں دیکھنا شروع کیا۔

سماجی شعور ایک شہزادے میں آسانی سے نہیں آتا ہے۔ میں ایک ایسی دنیا میں رہتا تھا جس میں ہر چیز موجود تھی۔ جہاں نوکر حکم بجا لاتے تھے۔ اور یہ کہ بعض لوگ حکمران کیوں ہیں اور دوسرے محکوم کیوں۔ اصولاً یہ سوال شاذ ہی پوچھا جاتا ہے۔ تاہم مجھے اپنے ہم مرتبہ لوگوں پر ایک فوقیت حاصل تھی۔ میری ماں ایک غریب گھرانے کی لڑکی تھیں۔ شاہی آرائش اور چمک دمک

چاہئے انہوں نے کتنی ہی پسند کی ہو، تاہم انہوں نے ہمیشہ غریبوں کی ضروریات کو پورا کرنے اور انکی تکالیف کو دور کرنے کو ایک مقدس فرض سمجھا۔ بطور مہارانی پورے تیس برس انہوں نے نہ صرف غریب رشتہ داروں پر بہت سارے روپے خرچ کئے بلکہ سینکڑوں غریبوں اور پریشان حال لوگوں کی انہوں نے مدد کی۔ یہ حساب لگانا ناممکن ہے کہ انہوں نے کتنی لڑکیوں کی شادیاں کرائیں۔ کتنے غریبوں کیلئے گھر بنوائے۔ مٹھائیاں اور کپڑے وہ ہمیشہ بانٹتیں۔ وہ مجھے ہمیشہ یہ حقیقت ذہن نشین کراتیں کہ مجھے ایک قرض ادا کرنا ہے۔ غریبوں کی مدد کرنا ہے۔ وہ کہتیں "اگر تم امیروں کی مدد کروگے۔ وہ صرف تمہارے خلاف ہو جائیں گے۔ غریبوں کی مدد کروگے تو وہ اس کی سراہنا کریں گے۔ تم کو دعا دیں گے" ایک طرح سے سوشلزم سے نہ سہی کم از کم تقسیم کاری کے انصاف کے تصور سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔ وہ ہمیں تاکید کرتیں کہ ہر ایک کے آداب کا میں ہاتھ جوڑ کر جواب دوں اور انکے بال بچوں کی خیریت دریافت کروں اور یہ کہ جو کوئی آئے چاہے وہ امیر ہوں یا غریب ان میں گھل مل جاؤں۔ وہ شکایت کرتیں "مصیبت یہ ہے کہ تمہارے والد کبھی لوگوں سے نہیں ملتے۔ وہ بس خوشامدی درباریوں اور دوستوں کے گھیرے میں رہتے ہیں اور انہیں درحقیقت کبھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔"

جموں و کشمیر فوج سے تعلق رکھنے والے دونوں ہندو اور مسلمان اے۔ ڈی۔ سیز کے علاوہ میرے والد کے بہت سارے مسلمان درباری تھے۔ ان میں سب سے بڑے حیدرآباد کے شریف آدمی نواب خسرو جنگ تھے۔ جن کی خدمات میرے والد نے نظام (محبوب علی خاں) سے مستعار لی تھیں۔ خسرو جنگ میرے والد کے برسوں ایک قریبی دوست اور فوجی سیکرٹری رہے۔ انکی آواز عمدہ تھی۔ درباری آداب میں وہ ماہر تھے اور بہت ہی متاثر کن شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک اچھے گھوڑسوار تھے۔ یہاں تک کہ ہم لڑکے تک جانتے تھے کہ وہ عورتوں کے بہت ہی پسندیدہ آدمی تھے۔ بلوچستان سے تعلق رکھنے والے ایک لحیم شحیم آدمی، صاحبزادہ نور محمد خان میرے والد کے اسٹاف میں برسوں رہے۔ اسکے بعد سردار عبدالرحمان آفندی (بھائی جان) میرے والد کے ایک نزدیکی دوست تھے جو ہمارے سرینگر کے محل کے دروازے کے باہر قریب ہی گپکار روڈ پر رہتے تھے۔ وہ شرنارتھی تھے اور بادشاہ امان اللہ کے رشتہ دار بھی، جنہیں معزول کرکے ملک چھوڑنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ آفندی کی دوسری بیوی کافی لمبی چوڑی تھیں۔ انکی پشتو اردو کا لہجہ دلکش تھا۔ وہ میری والدہ کے ساتھ ٹینس کھیلتیں۔ آفندی کی ساس جو کو جان کہلاتیں ایک یادگاری شخصیت تھیں۔ جب میں نے انہیں دیکھا تو انکی عمر تقریباً

اسّی برس کی تھی۔ پھر بھی وہ ہمیشہ پارٹی کی جان ہوتی تھیں بظاہر
انہوں نے اپنی جوانی میں افغان دربار میں ایک خاص رول ادا کیا
تھا۔ ہندو اور مسلمان درباریوں میں کبھی کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا
تھا۔ اور اگر کوئی بات ہوتی تو مسلمانوں پر زیادہ عنایت رہتی
تھی۔ جہاں تک دفتری کام کا تعلق تھا تو اسکی دیکھ بال زیادہ تر
ایک چھوٹی جسامت کا لیکن بہت ہی قابل کشمیری پنڈت
دینا ناتھ جلالی کرتا تھا۔ وہ میرے والد کے ساتھ (ناقابل اعتبار
کے طور پر) پچیس برس سے تھے۔ انکے ساتھ ایک لمبا ساتھی ....
شمبو ناتھ وانچو تھا۔

آج ہی کی طرح تب بھی کشمیر سیاحوں کیلئے مسرت کا مقام
تھا اور ہر سال گرمیوں میں شاہزادوں کا ایک مجمع اور دوسرے
نامور اشخاص کشمیر آتے۔ بعض میرے والد کے مہمان کے طور
پر۔ مجھے بلا کی حسین شہزادی نیلوفر یاد ہیں جو اس وقت نظام حیدرآباد
کے دوسرے بیٹے کے ساتھ شادی پر ناخوش تھیں

اور نیلوفر کی چچا زاد بہن قدرے کم خوبصورت در شہوار نظام
کے بڑے بیٹے شہزادہ برار کی بیوی یاد ہیں۔ ہر طرف مہاراجوں راجوں
اور نوابوں کا بڑا نظارہ رہتا تھا۔ خاصکر پالنپور کے نواب اور ان کی
آسٹریلوی بیگم سے قربت حاصل تھی۔ ان شہزادوں میں سے بعض
سے میں ملتا۔ مجھے ان کے پاؤں چھونے پڑتے اور انہیں ا نکل

پکارتا۔ ایسے ہی ایک موقع پر ایک شخص سے مل کر آیا جو بالکل بہرے
اور جن کے ساتھ گفتگو ایک لکھنے کی سلیٹ سے کیجاتی تھی۔ وہ تھے
جند کے مہاراجہ جو اپنے سگ خانہ کیلئے مشہور تھے۔ مجھے اس وقت
بھی خیال آتا تھا کہ جو جو رقم وہ فضول کتوں پر صرف کرتے تھے' وہ
اسے زیادہ فائدہ مند طریقہ پر عوام کی بہبودی میں خرچ کر سکتے تھے

انگریز بہت کم نظر آتے تھے۔ برطانوی ہندوستان کے
برعکس' جہاں انکی موجودگی مشکوک تھی' ہندوستانی ریاستوں میں وہ
کم ہی نظر آتے تھے۔ خاص طور سے ایسا ہماری ریاست میں تھا کیونکہ
میرے والد بجا طور پر ان پر بھروسہ نہیں کرتے تھے اور یہاں تک کہ
سردیوں میں ریذیڈنسی کو جموں کے بجائے سیالکوٹ منتقل کرنے
پر راضی کیا۔ گرمیوں کے مہینوں میں برطانوی ریذیڈنٹ بنڈ پر
واقع مکان میں قیام کرتے تھے۔ جس کو بعد میں گورنمنٹ ہینڈی
کرافٹس ایمپوریم میں منتقل کیا گیا۔ لیکن ہم انکو شاذ و نادر ہی دیکھتے
تھے۔ اور مجھے ایک واقعہ بھی ایسا یاد نہیں جب میں انہیں ملیں
میں ملا ہوں۔ تاہم وہ ہر سال فینسی ڈریس کی سال میں ایک بار
پارٹی منعقد کرتے۔ جس میں' میں ڈگ بی اور بلٹی کے ہمراہ شرکت
کرتا۔ ریذیڈنٹ کی بیوی کبھی کبھی انگریز عورتوں اور غیر کشمیری
افسروں کے ساتھ میری ماں سے ملنے آتیں۔ ان میں پارسی چیف
جسٹس بارچور دلال کی بیوی لیڈی دلال مجھے یاد ہیں۔ جو ایک

چھوٹی شریف عورت تھیں۔ جب بھی وہ آتیں تو مجھے چھوٹی
چھوٹی پنسلیں دیتیں۔ جنکو میں بڑی بیتابی سے جمع کرتا تھا۔
جہاں تک کشمیری مسلمانوں کا سوال تھا۔ ہمارا رابطہ زیادہ
تر باغبانوں، شکاریوں اور مچھلی گارڈس تک محدود تھا۔ ایکمرتبہ
میرے والد نے ایک نامور جوہری اور قالین کے بیوپاری غلام احمد
سے کہا کہ وہ مجھے شہر گھمانے لیجائے، جو انکے آرٹ صلاح کار بھی
تھے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور مجھے یاد ہے کہ مجھ کو دریائے
جہلم پر واقع خستہ حال عمارتیں دیکھکر تعجب ہوا۔ ایسا لگ
رہا تھا کہ یہ عمارتیں کسی بھی وقت دریا میں گر سکتی ہیں۔ "یہ
آپ کے لوگ ہیں"۔ احمد نے کسی حد تک ڈرامائی انداز
میں کہا۔ اس سیر نے میرے اُوپر پریشان کن اثر چھوڑ دیا تھا۔
اور اسکے بعد کئی دنوں تک دریائے جہلم کے رہنے والوں کی یاد
مجھے آتی جو محل کی باقاعدہ شان کے بالکل برعکس تھی۔ جو سچ مچ
ایک دوسری دنیا کا نقشہ پیش کرتی تھی۔ اس وقت ریاست
کے سیاسی حالات کے بارے میں جانتے تھے نہ عظیم تحریک
آزادی کے بارے میں جس نے پوری قوم کو اپنی لپیٹ میں لیا
تھا۔ ٹریبون، سول اور ملٹری گزٹ جو دونوں لاہور سے شائع ہوتے
تھے، گھر میں آتے تھے۔ لیکن اس وقت میری عمر دس برس
کی بھی نہ تھی اور انہیں پڑھنے اور سمجھنے کیلئے ابھی بہت چھوٹا

تھا۔ آل انڈیا ریڈیو کا ٹیون (جو خوش قسمتی سے آج تک نہیں بدلا) میری
بچپن کی یادوں میں سے ایک ہے۔ ہم کبھی کبھی خبریں سنتے تھے خاصکر
دوسری جنگ عظیم شروع ہونے کے بعد۔ لیکن ہمیں کوئی خاص سمجھ
نہ تھی کہ کیا ہو رہا ہے کیونکہ ہم ایک جدا دنیا میں جو بیرونی اقتصادی
اور سیاسی حقائق سے کوسوں دور تھی، رہ رہے تھے۔ ہمارے آرام دہ
قرب وجوار کے باوجود میں شاید ہی ایسے وقت کو یاد کرسکتا ہوں
جب بحیثیت بچہ میں خوش رہا ہوں۔ میرے لاشعور میں ایک خوف
سا بسا ہوا تھا جسکا اظہار میں نہیں کرسکتا تھا۔ تاہم اسے صاف طور
پر میں محسوس کرتا تھا۔ شاید ایسا والدین کے ناخوشگوار ماحول یا ماں
سے میری زبردستی دوری کی وجہ سے تھا۔ جو بھی وجہ ہو، اس صورت
حال نے میری بچپن کی زندگی کا ایک بڑا حصہ برباد کردیا تھا۔
میں ذکر کرچکا ہوں کہ کس طرح مجھے سنہ ۱۹۴۰ء اور سنہ ۱۹۴۱ء
کی سردیوں میں بمبئی کے کیتھڈرل ہائی اسکول میں داخل کردیا
گیا۔ گرمیوں میں اس دوران میں نے راج باغ سرینگر میں واقع
پریزینٹیشن کانونٹ اسکول جانا شروع کردیا تھا۔ امیرا کدل جو
سرینگر کے سات تاریخی پلوں میں سے پہلا پل ہے، کے راستے
سے ٹریفک سے بچنے کیلئے مجھے گاڑی پسٹن جی اور احمد وز
(دکانیں جو درحقیقت ادارے بن چکے ہیں) کے قریب دریا کے کنارے
جانا پڑتا تھا۔ یہاں سے میں دریائے جہلم کو شکارے (چھوٹی کشتی)

میں پار کرتے ہوئے دوسرے کنارے پر اسکول کے نزدیک ہی اترتا تھا۔
اتنی دیر میں کار پل سے ہوتے ہوئے آ کر دریا کے کنارے میرا انتظار
کرتی تھی۔ پچھلے حالات پر نظر ڈالتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ چونکہ شیخ
محمد عبداللہ کی قیادت میں ڈوگرہ حکومت کے خلاف نیشنل کانفرنس
کی تحریک نے زور پکڑنا شروع کر دیا تھا۔ اسلئے میرے والد شہر
سے گذرنے سے بچنے کے لئے یہ طریقہ محفوظ سمجھتے تھے۔ حالانکہ کبھی
بھی یہ وجہ ظاہر نہیں کی گئی۔ پریزنٹیشن کانونٹ صاف ستھرا تھا اور
اسے عمدہ طریقہ پر آئرلینڈ کی ننس پر مشتمل ایک گروپ جس کی
قیادت مادر پیٹر کر رہی تھیں چلا رہا تھا۔ ہماری کلاس ٹیچر سسٹر انونسیٹا تھیں۔ جبکہ مشن کے سربراہ خوش مزاج فادر شا لکس بار بار
اسکول آتے۔ وہ سب آئرلینڈ کے رہنے والے تھے۔ اور ایک منفرد
لہجے میں بولتے تھے۔ تعلیم کے علاوہ (آہ! مجھے شبہ ہے کہ پوری طور
پر قابلیت کی بناء پر نہیں) میں لگاتار اول آتا تھا) گانے، کھیل
اور ڈرامہ کئی دوسری خوش آئندہ تفریحی پروگرام ہوتے تھے۔
بی بی مریم اور حضرت عیسیٰؑ کی خوبصورت تصویریں دیواروں
سے لٹکی رہتی تھیں اور ننس اخلاق و حقیقی مذہبی لگاؤ کا نمونہ تھیں
مجھے ڈرامہ میں اپنی پہلی شمولیت یاد ہے جو رابن ہڈ سے متعلق
تھا اور سالانہ تقریب سے پہلے ہم نے اس پر کئی دن تک کام کیا۔
پہلے مجھے کنگ رچرڈ کا رول دیا گیا تھا۔ آخری لمحہ میرا رول

رابن ہڈ کے طور پر تبدیل کیا گیا۔ مجھے یقین ہے میرے والد نے
اسے پسند نہیں کیا۔ شہزادہ ہونے کے ناطے مجھے یہ نہیں فرض
کرنا چاہئے کہ مجھے ہمیشہ شاہی نوعیت کے رول ادا کرنے ہونگے
تاہم میرے والد چند ایک باتوں میں ہی جدید خیالات کے
تھے۔ میں ذکر کر چکا ہوں کہ میرے والد اور جودھپور کے مہاراجہ
برسوں نزدیکی دوست رہے۔ ہر سال اُمید سنگھ جی، انکی مضبوط قوت
ارادی رکھنے والی بیوی اپنے پانچ لڑکوں اور ایک لڑکی سوسن کے
ساتھ کشمیر آتے۔ مجھے شبہ ہے کہ میری اور سوسن کی سگائی کی
کوئی بات چلی تھی۔ کیونکہ بعد میں جو عجیب واقعات پیش آئے
انکی یہی ایک وجہ ہو سکتی تھی۔ کسی وجہ، جسکو میں کبھی دریافت
نہیں کر سکا، دو مہاراجوں کے درمیان دوستی ختم ہوئی۔ میرے والد
جو جاگیردارانہ روایات کے پابند تھے ایسے معاملوں میں انتہا پسند
تھے۔ درمیان رویہ کی انکے پاس کوئی گنجائش نہ تھی۔ آدمی یا تو
قریب ہوتا تھا یا پھر باہر۔ اور ایک طرح سے ردّ عمل کے طور پر
محض جودھپور والوں کو نیچا دکھانے کے لئے انہوں نے ایک
اور راٹھور شہزادی رتلام کے اس وقت کے حکمران مہاراجہ
سجان سنگھ جی کی بیٹی سے میری سگائی کرنے میں عجلت برتی
موجودہ قارئین یہ جانکر حیران ہونگے کہ دس برس کے ہونے پر
سنجیدہ سگائیاں ہوتی تھیں۔ ایسا ہندوستانی ریاستوں

میں ۱۹۳۰ء کے بعد شروع کے سالوں میں ہوتا تھا۔ اور ایک ولی عہد کی منگنی ایک زبردست تقریب ہوتی تھی۔ گلاب بھون کے صحن میں ایک مکمل دربار کا اہتمام ہوا تھا۔ بقول "رائٹر" عالیشان رنگ اور شان و شوکت جس کیلئے ہندوستان کے دربار مشہور تھے' دھوم کی نمائش تھی۔ مجھے کمخواب اور جواہرات پہنائے گئے تھے۔ اور مجھے اچھی طرح سے مجمع کے اندر چلے جانے کا واقعہ یاد ہے جب میں مکمل طور پر اپنے آپ کو ایک مسخرہ محسوس کر رہا تھا۔ رتلام کے دستے کے آگے آگے انکے ایک درباری وجے بہادر آئے۔ ایک پونڈ کو جو انہیں مجھے پیش کرنا تھا مجھے دینے سے پہلے ہی گرایا اور کانا پوسی کرتے ہوئے مجھے ایک خالی رومال اٹھانے کو کہا تاکہ انکی غلطی کو کوئی بھانپ نہ سکے۔ میں نے سنجیدگی کے ساتھ ایسا ہی کیا۔ وہ ایک اچھے کھلاڑی تھے۔ میں انکو مخجل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ رتلام کی شہزادی چندر کنور جنہیں شانتی کے نام سے پکارتے تھے اور انکو چھوٹے بھائی اپنے گارڈین مسز سٹیوارڈ کے ہمراہ سرینگر آئے اور یہاں انہوں نے کچھ ماہ گذارے۔ وہ اچھی لگ رہی تھیں۔ لیکن میں اس عمر کو نہیں پہنچا تھا کہ میں لڑکیوں میں کوئی خاص دلچسپی لیتا۔ کچھ برس بعد جب میں امریکہ میں تھا تو ہم نے ایکدوسرے کیساتھ خط و کتابت شروع کی۔ لیکن صورت حال صاف طور پر بے جوڑ تھی اور یہ

کیسے انجام پذیر ہوئی اسکا میں آگے ذکر کروں گا۔ میرے والد نے ۱۹۴۰ء میں ویسے ہی جلدی میں یہ سگائی بھی توڑ ڈالی۔ دونوں موقعوں پر میری ایک نہیں چل سکتی تھی۔ لیکن یہ بات عیاں تھی کہ اس معاملہ کو کچھ اس طرح سے نپٹایا گیا تھا جسکو بے عزتی ہی کہا جاسکتا ہے۔ زیادہ تر رتلام گھرانے کیلئے خاصکر شانتی کیلئے اور ہمیں بھی اس سے کوئی عزت نہیں ملی۔ مجھے معلوم ہوا کہ شانتی نے بعد میں اترپردیش میں شادی کی تھی اور کئی برس بعد ایک کار حادثہ میں جان بحق ہوئیں۔

باب ۳

کرنل ہکسر کا ایک پوتا وکی نہرو ڈیرہ ڈون کے ڈون اسکول میں زیرِ تعلیم تھا۔ جسے ۱۹۳۵ء میں مشہور برطانوی پبلک اسکول کے طور پر قائم کیا گیا تھا اور جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کا پہلا اسکول تھا۔ کرنل ہکسر نے میرے والد کو مجھے وہاں بھیجدینے پر راضی کیا۔ اس سے پہلے ہندوستانی شہزادے یا تو برطانیہ کے اسکولوں میں جاتے تھے یا پھر اجمیر، راجکوٹ، اندور اور دوسرے مقامات کو بھیجا جاتا تھا۔ جو شہزادوں کے اسکول سمجھے جاتے تھے۔ جہاں ہندوستانی امراء کے بیٹوں کو تعلیم دی جاتی تھی۔ جنہیں عام طور پر نوکروں اور بہت ساری رقم خرچ کرنے کی سہولیات بیسر ہوتی تھیں۔ اسلئے مجھے ڈون اسکول بھیجنا ایک دلیرانہ اور بلند خیال فیصلہ تھا۔ جس نے میری آئندہ زندگی پر ایک دیرپا اثر

ڈالا۔ اگر میں نے چار ناخوشگوار سال ڈون اسکول میں نہ گذارے ہوتے تو میرے لئے جاگیردارانہ زندگی سے جمہوری زندگی کی جانب روانگی جو کچھ ہی برس دُور تھی بے حد مشکل ثابت ہوتی۔ تاہم اس وقت فضا خاص طور سے کوئی پُرکشش نہ تھی۔ جب میں رخصت ہوا تو میری والدہ بے حد روئیں۔ اور نوکرانیوں کی گود میں بے ہوش ہوگئیں میں اُس انجانی زندگی سے جو ڈون اسکول میں میری منتظر تھی، مکمل طور پر خوفزدہ تھا جیسے کرنل ہکسر نے بار بار کہدیا تھا کہ مجھے اپنا بستر خود بچھانا ہوگا۔ جوتوں کی پالش خود کرنا ہوگی۔ اور ماہانہ پانچ روپیہ جیب خرچ پر ہی اکتفا کرنا ہوگا۔ گیارہ برس حفاظت اور بہت ہی آرام دہ ماحول میں گذارنے کے بعد قدرتی طور پر یہ تبدیلی کوئی خوشگوار تبدیلی نہ تھی۔ کرنل ہکسر بذاتِ خود ستمبر ۱۹۴۲ء میں میرے ساتھ ڈیرہ ڈون آئے۔ اور میں نے اسکول میں داخلہ لیا۔ اور توقع کے مطابق مجھے کشمیر ہاؤس کے ساتھ شامل کیا گیا۔ اور مجھے رول نمبر ۲۵۹ دیا گیا۔

اسکول میں میرے شروع کے دن تکلیف دہ تھے۔ مجھے بُری طرح سے گھر کی یاد ستاتی تھی۔ اور ہر رات سونے سے پہلے میں ہچکیوں کے ساتھ روتا تھا۔ ہر ہاؤس میں قریب بارہ کمرے تھے۔ ایک کمرے میں چار لڑکے رہتے تھے۔ ہر ہاؤس میں بیت الخلاء تھے۔ مجھے اندھیرے میں کبھی سکون نہیں ملتا تھا۔ اور مجھے

والی بچھائے گئی چادروں، نیلے رنگ کے کھُردرے کمبلوں اور نیچے لٹکی ہوئی مچھر دانیوں سے نفرت تھی۔ خوش قسمتی سے مجھے لڑکوں سے کبھی کوئی جسمانی تکلیف نہیں پہنچی لیکن یہ بات بھی نہ تھی کہ چونکہ میں شہزادہ تھا اسلئے وہ مجھے عزیز رکھتے تھے۔ ایک بڑی مشکل زیادہ تر سخت پڑھائی کی وجہ سے پیدا ہوئی جو مجھے داخلہ سے پہلے گھر پر دی گئی تھی۔ مجھے اپنے ہمعمر لڑکوں سے دو جماعتیں اُوپر رکھا گیا تھا۔ حالانکہ میرے والدین نے اسکی سراہنا میری غیر معمولی ذہانت کی صلاحیتوں کے اعتراف کے طور کی۔ لیکن اس بات نے مجھے ایک ایسی صورت حال سے دوچار کردیا جہاں قریب سبھی لڑکے مجھ سے دو برس بڑے تھے۔ اور میری عمر کے لڑکے مجھ سے دو جماعتیں پیچھے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نہ تو اپنے ہم جماعتیوں میں موزون تھا اور نہ ہی میں اپنے ہم عمروں کے ساتھ۔ اس پر ستم ظریفی یہ تھی کہ میں کچھ بزدل اور شرمیلا تھا اور اپنی خصوصی پرورش کی وجہ سے پبلک اسکول کی مشکلات اور الٹ پلٹ کی زندگی کیلئے ہرگز تیار نہ تھا۔

غذا حقیقت میں کھانے کے قابل نہ ہوتی تھی۔ جس میں زیادہ تر ایسی ترکاریاں شامل تھیں جن سے مجھے خاص طور سے گھن آتی تھی۔ جیسے کہ شلغم، کرم کلہ اور بھنڈی۔ اسکا مجموعی اثر جیسا کہ تصور کیا جاسکتا ہے بے تسکین، بے حد کراہت کا باعث تھا۔ عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ پبلک اسکول آسودہ حال طبقوں سے تعلق رکھنے والے لاڈلے بچوں کیلئے

عیاشی کے اڈے ہیں۔ بالکل غلط فہمی پر مبنی ہے۔ بے شک جب میں وہاں تھا تو پورا ماحول سخت تھا۔ اور میں احتیاط برتتے ہوئے اپنے خطوط میں اپنے والدین کو کوئی اشارہ دینے سے باز رہا۔ (وہ خطوط جو میں نے اپنے والد کو لکھے تھے، انکے انتقال کے بعد میرے قبضے میں آگئے۔) مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ پہلے دن سے ہی متذکرہ مدت ختم ہونے تک میں ایک ایک دن کو گنتا تھا۔ اور ہر بار چھٹیوں کے اختتام پر گھر چھوڑتے وقت میں اپنی سپردگی مایوسی کے عالم میں اپنے معدہ میں محسوس کرتا۔

اسکول کا دستور پڑھائی، کھیل کود اور مشاغل سے بھرا پڑا تھا۔ حالانکہ دستور میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ تاہم میں اسکا ذکر مختصراً کرونگا جو میری پچھلی زندگی کے بالکل برعکس تھا۔ اور میری اس میں بہت حد تک حالات سے سمجھوتہ کرنے کی بات شامل تھی۔ ہمیں اسکول میں رہنے والے چوکیدار اور ناشتہ (چھوٹا حاضری) کی بڑا گھنٹہ بجانے کی آواز پر چھ بجے اٹھنا پڑتا تھا۔ ایک پیالی دودھ اور روٹی کے ایک ٹکڑے کے تناول کے بعد بڑے میدان میں ڈرل شروع ہوتی تھی۔ جبکہ میں کسی نہ کسی طرح بہت ساری ڈرل کو نبھاتا تھا۔ ہفتہ کے روز جب اکھاڑے میں جاتے تو خاص طور سے میری جان نکل جاتی صندوق کے اوپر آگے کی طرف قلابازی کھانے کے سلسلے میں میرے اندر ایک نامعقول خوف پیدا ہوگیا تھا۔ جب میں صندوق کے

اوپر چڑھتا تھا تو میرا جسم جم جاتا اور قلابازی کھانے پر میں ہرگز راضی نہ ہوتا۔ بار بار میں اس بے ترتیب صندوق پر بیٹھے ہوئے اپنے آپ کو ایک عجیب صورت میں پاتا۔ پوری کلاس میرے اضطراب کو دیکھ کر چپکے چپکے ہنستی یہاں تک کہ ہیڈ ماسٹر بارعب مسکرائے۔ ای۔ فٹ کی بات چیت بھی کارآمد ثابت نہ ہوتی اور اسکول کی پوری مدت کے دوران مجھے اس مخصوص صورتِ حال سے چھٹکارا پانے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ڈرل کے بعد جس میں پورا اسکول ایک ساتھ شامل ہوتا تھا، لڑکے اپنے اپنے ہاؤسوں میں واپس آتے۔ یہاں چار ہاؤس تھے۔ یعنی کشمیر، حیدرآباد، جے پور اور ٹاٹا۔ اور اپنے ہاؤسوں کے اندر ہی ہم زیادہ وقت گذارتے تھے۔ پہلے ہم نہاتے، کپڑے بدلتے ناشتہ کرتے اور تب ہم اسکول کی عمارت میں پرارتھنا کی مجلس اور پڑھائی کیلئے جاتے جہاں ہر استاد کیلئے مخصوص کمرہ ہوتا تھا۔ صبح کی پڑھائی کے بعد ہم اپنے ہاؤسوں میں دوپہر کے کھانے کیلئے آتے۔ کچھ دیر آرام کرتے۔ اور دوبارہ دوپہر کے بعد کی پڑھائی کیلئے چلے جاتے چائے کے بعد کھیل کود کا پروگرام رہتا۔ جس میں ہر لڑکے کو شرکت کرنا پڑتی تھی۔ تب ہاؤس میں نہاتے رات کا کام کرتے (جسے عجیب وجوہات کی بناء پر ٹائی ٹائم کہا جاتا تھا) رات کا کھانا تناول کرتے اور پھر سو جاتے۔

اسکول کا تعلیمی معیار بہت بلند تھا۔ میں معقول طور پر تیز سیکھنے والا تھا۔ اور کم عمری کے باوجود میں تسلی بخش طریقہ پر مقابلہ کرنے کے قابل تھا۔ سینیئر کیمبرج میں ہمیں نو مضامین تھے۔ جس کے لئے ہمیں اسکول تیار کر رہا تھا۔ درس کا معیار عام طور پر تسلی بخش تھا۔ لیکن چند ہی اساتذہ ایسے تھے جنہوں نے مستقل طور پر مجھے متاثر کیا۔ سب سے زیادہ قابل تعریف مسٹر وی۔ ایس۔ چاری تھے۔ جو بعد میں انڈین فارین سروس میں وی سدھارتا چاری کے نام سے مشہور ہوئے۔ اور ہم کو (میرا سب سے زیادہ پسندیدہ مضمون) انگریزی پڑھاتے تھے۔ انہوں نے ہی مجھے سب سے پہلے انگریزی شاعری سے متعارف کرایا حالانکہ گھنٹہ بجتا جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ وقت ختم ہو چکا ہے، کوئی بھی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرتا۔ جب تک وہ ختم نہ کر لیتے۔ لڑکے سب اساتذہ کے ساتھ عمدہ برتاؤ نہیں کرتے تھے۔ اور اس سے مجھے ایک مفید سبق مل گیا۔ کہ اپنی خود اعتمادی اور شان کو برقرار رکھ کر ہی آدمی دوسرے سے عزت پا سکتا ہے۔ زیادہ نرم اور فیصلہ کرنے کی قوت نہ رکھنے والا لگاتار خاص کر لڑکو اور باتونی لوگ استحصال کرتے ہیں۔

پبلک اسکول کے بارے میں جسمانی موزونیت کا خیال بجا ہے۔ یہاں کھیل کود، ٹولیوں کے ساتھ اور انفرادی مہمات میں بہتری پانے پر زور دیا جاتا تھا۔ چاروں ہاؤس کھیل کود میں

ایک دوسرے کا شدید مقابلہ کرتے تھے۔ اور ڈیرہ ڈون میں سالانہ کھیل کے مقابلہ میں پورا اسکول حصہ لیتا تھا۔ میں شطرنج کے علاوہ جس کا میں دو سال کپتان رہا۔ اسکول کی کسی دوسری ٹیم میں کبھی شامل نہیں رہا۔ جب کہ کھیل سے مجھے بہت کم دلچسپی تھی اور وادی کے آرپار دوڑ لگانا تھا جو ایک خوفناک مصیبت تھی جس میں ہم کو اسکول کے اردگرد میلوں پہاڑیوں اور گھاٹیوں کے اوپر سے کرنا پڑتے تھے۔ جس سے جسم کے اعضاء دکھتے اور پھیپھڑے پھٹتے محسوس ہوتے تھے۔ اسکول کئی طرح کے مشغلے بھی مہیا کرتا تھا۔ جن میں سے ہم کو دو چننے پڑتے تھے۔ میں نے میوزک اور بڑھئی کا کام اپنے لئے چنے۔ بڑھئی کا کام اس لئے میں نے چنا کیونکہ ہر کوئی اسے کرتا ہوا دکھائی دیا۔ ہر لڑکے کا ایک رپورٹ کارڈ ہوتا تھا۔ جسے ہر ماہ اسکے اساتذہ کو بھرنا ہوتا تھا۔ سزا کا طریقہ دلچسپ اور غیر معمولی نوعیت کا تھا۔ جسمانی سزا ممنوع تھی۔ اور شدید ترین سزا (جسمیں اسکول سے خارج کرنے کی سزا شامل تھی) جو واقعی شدید جرم کرنے پر ملتی تھی پیلا کارڈ تھا۔ اسکا اشتہار اسکول کے نوٹس بورڈ پر چسپاں کیا جاتا تھا ایک ماہ تک کینٹن شاپ میں جانے سے باز رکھتے تھے۔ (جو ایک قیمتی رعایت تھی) اور دو مرتبہ سینما (جہاں ہم کو کبھی کبھی لیا جاتا تھا) نہ لے جانا وغیرہ وغیرہ سزائیں ملتی تھیں۔ لال کارڈ کا مطلب پڑھائی میں مسلسل خراب کارکردگی ہوتا تھا۔ اور

اس میں کئی سزائیں شامل ہوتی تھیں۔ نیلا کارڈ ہاؤس کے ناظم سے معمولی جرم کی پاداشت میں دیا جاتا تھا۔ اپنے پورے اسکول کیریئر کے دوران مجھے صرف ایک مرتبہ پیلا کارڈ ملا۔ کیونکہ تاریخ کے امتحان کے دوران میرے ساتھ بیٹھے لڑکے نے میرے ناقص جواب کی نقل کی تھی۔ جسکے نتیجے میں ہم دونوں کو پکڑا گیا۔

ہر سال درمیان میں تین دن کی چھٹی ہوتی تھی جس کے دوران ہم سب کئی دلکش مقامات کے سفر پر جاتے تھے۔ جنکی ڈون وادی میں بہتات تھی۔ جیسے ڈوئی والا' لا چھی والا' رائی والا۔ بڑی عمر کے لڑکے جو زیادہ مہم پسند تھے پہاڑوں کی مہم پر جاتے تھے۔ لیکن میری مہم قریب کے دریاؤں میں کھیلنے تک محدود رہتی تھی یا یہ کہ میں محض پکنک کے مناظر کے معاملات سے چمٹا رہتا تھا۔ اسکول میں داخلہ لیتے وقت مجھے تیرنا نہیں آتا تھا اور کچھ برس پہلے کی بات ہے کہ میں نے پانی اور ڈوبکی لگانے کے ڈر پر قابو پایا۔ ایک پبلک اسکول کے اندر بزدلی کوئی اچھی بات نہیں ہے اور ماضی کو دیکھتے ہوئے مجھے صاف لگ رہا ہے کہ اسی بات نے مجھے اسکول میں اس حد تک لطف اندوز ہونے سے باز رکھا جتنا کہ میں ہو سکتا تھا۔ بدقسمتی سے کشمیر لنب کا ہاؤس استاد جیک جبس نے اسی سال سجہ یہ کی نوکری اختیار کر لی جب میں نے داخلہ لیا اور اسکول میں میرے آخری سال کے دوران واپس لوٹے

ہیڈ ماسٹر مسٹر فُٹ الگ تھلگ اور نفرت انگیز آدمی تھے - بہرصورت اسکول کو اسطرح ترتیب دیا گیا تھا کہ ہاؤس کو ہی لڑکے کی زندگی کا مرکز بنایا گیا تھا۔ نتیجہ کے طور پر جہاں عُمر کے فرق کی وجہ سے دوستوں کے وسیع دائرے سے محروم رکھا تھا۔ مجھے کسی قابل ہاؤس ٹیچر کی قربت کا فائدہ بھی نصیب نہ ہوا۔ اس پرستم ظریفی یہ تھی کہ میرے والد نے ہر کسی کو اسکول میں مجھ سے ملنے آنے سے منع کر رکھا تھا اور کوئی ایسا نہ تھا جس کے ساتھ میں اپنے مسائل اور تذبذب پر بحث کر سکتا تھا۔

تاہم دو مرتبہ چھٹیوں کی صورت میں یعنی گرمیوں میں اڑھائی ماہ اور سردیوں میں چھ ہفتوں کی تعطیل خوشی کا موقع فراہم کرتی تھی۔ ڈون اسکول میں داخلہ لینے کے بعد گھر میں میری الگ قیام گاہ کو بند کیا گیا۔ ڈگبی اور ملٹی واپس اپنے اپنے گھروں کو بھیجے گئے۔ اور میں نے چھٹیاں اپنے والدین کے ساتھ گذارنا شروع کیں بچپن میں ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۶ء تک یہی تین سال میں نے معمول کے مطابق گھریلو ماحول میں گذارے۔ کیونکہ اتفاق سے انہی برسوں میں میرے والدین کے درمیان نسبتاً خوشگوار تعلقات رہے۔ گرمیوں کی چھٹیاں سرینگر میں گذرتی تھیں۔ جہاں ہم سب بڑے محل جسے کو گلاب بھون کہتے تھے میں رہتے جو اب اوبرائے پیلس ہوٹل ہے۔ یہ خوبصورت دو منزلہ عمارت جسے ایک مستطیل پر تین جانب تعمیر

کیا گیا تھا۔ یہاں سے جھیل ڈل کا نظارہ کیا جاتا ہے۔ اور یہ بات میرے والد کی فن تعمیر میں گہری دلچسپی کا اظہار کرتی ہے۔ اُس وقت کے بہت سارے شہزادوں کے برعکس جن کے محل ملکہ وکٹوریہ کے عہد کی وسیع اور عجیب وغریب عمارتوں سے مشابہہ تھے۔ ہماری صاف سُتھری تیامگاہ بیرونی شور وغل سے دو پہاڑوں کے بالکل درمیان واقع تھی۔ پیچھے عمارت کے بالکل جنگل ہے۔ میرے والد نے ایکمرتبہ بڑے صحن سے چیتے کو مارا تھا جبکہ بیکانیر کے آنجہانی مہاراجہ سُرد ول سنگھ نے اپنے حمام کی کھڑکی سے ریچھ کو گولی مار کر ہلاک کیا تھا۔

سامنے کے صحنوں کو بہت احتیاط کے ساتھ تراشا جاتا تھا۔ اور کیاریاں گوناگوں رنگوں کے ہوتے۔ جو کشمیر کی تازگی بخشنے والی ہوا میں چمکتے تھے۔ آج کئی دہائیوں کے بعد کے مقابلہ میں اس وقت کی ہوا تازہ گی بخش تھی۔ محل کو عمدہ طریقہ پر یورپ اور چین کی نفیس نوادرات اور سبھی کمروں اور برآمدوں کو قالینوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ وقفہ وقفہ سے انگلینڈ سے مسز سودھرلینڈ کے ذریعہ بہت سا فرنیچر آتا تھا۔ مسز سودھرلینڈ ایک انگریز خاتون تھیں جو میری پیدائش کے لگ بھگ جب اس نازک دور میں مُسلم کانفرنس نے شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں ڈوگروں کے خلاف پہلی بار تحریک کا آغاز کیا تھا" انسپکٹر جنرل رہ چکے تھے کی بیوہ تھیں۔ قالینوں کے علاوہ جو کشمیر میں بنائے جاتے تھے دوسرا سبھی آرائشی سامان، پارچہ جات، فٹنگ کا سامان یورپ

کا ہوتا تھا۔ میرے والدین پہلی منزل پر جنوب میں اس سے ملنے والے حصے میں قیام کرتے تھے۔ جبکہ زمین سے لگنے والی منزل پر میرے لئے ایک خوبصورت سیوٹ تھا۔ جہاں سے براہ راست جھیل کو دیکھا جاسکتا تھا۔ ڈون اسکول کے مہیب قرب وجوار سے سابقہ پڑنے کے بعد ہی میں نے اپنے محلات کے خاموش حُسن اور خوبصورتی کی سراہنا شروع کی۔ جبکی پہلے میرے سامنے کوئی اہمیت نہ تھی۔

یہ بات ظاہر ہوچکی تھی کہ میرے والد کو بھی میری چھٹیوں کا انتظار رہتا تھا۔ ہم باہر مچھلی پکڑنے جاتے اور دلچسپی گام شکار اور پکنگ کے لئے جاتے اور سامنے کے صحن میں ایک چنار کے درخت کے نیچے بہت دیر تک رمی، چوسر اور لوڈو کھیلنے کی محفلیں رہتیں۔ وکٹر روز نتھل اور سٹیل مین عام طور پر اس دوران سرینگر میں ہوتے۔ جو ہماری تفریح کو دوبالا کرتے۔ لنچ اور ڈنر پارٹیوں کے سلسلہ میں نشستوں کے انتظام اور فہرست طعام پر ہم گھنٹوں صرف کرتے تھے۔ میرے والدین دونوں عمدہ باورچی تھے۔ اور ہفتہ میں کم سے کم ایک بار پکانے کی پارٹی ہوتی تھی۔ ہم سب باہر بڑے دالان، بڑے بلاک کے درمیان سنگ مرمر کی دہلیز پر بیٹھ جاتے اور تب پکانے کا کام شروع ہوجاتا تھا۔ وردی پوش نوکر جو پیلی پگڑیاں باندھے ہوئے تھے، پست قسم کے چھ انچ لمبے رقبہ کے لحاظ سے ۵×۳ فٹ آگ سے چلنے والے اسٹینڈ لادیتے۔ ان پر کوئلے کی انگیٹھیاں رکھی جاتیں اور ان پر

چاندی کی مختلف سائز کی پتیلیاں جو اس چیز پر منحصر ہوتا تھا کہ کونسی چیز کتنی مقدار میں پکانا مطلوب تھی۔ سبھی جز احتیاط کے ساتھ ناپ تول کر اور صاف ستھرے طریقے سے تہہ ہوئی والی میزوں کے اوپر لائی جاتی تھیں۔ میرے والدین سمیت تین یا چار آدمی پکاتے تھے۔ جبکہ دوسرے تماشہ دیکھتے اور باتیں کرتے۔ تیج رام جو ایک تجربہ کار درباری تھے، میرے والد سے عمر میں بڑے تھے سب سے زیادہ خوش خوراک شخص تھے۔ اور فقیر سنگھ کے ساتھ ساتھ محل میں ہر ضیافت پر مدعو ہوتے تھے۔

وہسکی چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں پیش کی جاتی تھی لیکن میں نے اپنے باپ کو بہت کم مقررہ تین ڈبل سے زیادہ پیتے ہوئے نہ دیکھا تب وہ ذرا کھُل کر بات کرتے اور ستاتے اور اگر نوکروں سے متعلق کوئی مسئلہ درپیش نہ ہوتا تو ماحول نسبتاً تناؤ سے بچا رہتا۔ پکانے کھانے اور گپ شپ کی محفلیں گھنٹوں جاری رہتیں۔ کھانا رات کے گیارہ بجے سے پہلے پیش نہیں کیا جاتا۔ میں شروع کے چند گھنٹے یہاں بیٹھتا۔ تب نو بجے میرے لئے کھانا ایک تشتری میں رکھکر پلیٹ میں لایا جاتا میں کھانا کھاتا اور دوسرے لوگ محفل میں مصروف رہتے۔ کھانے کے بعد مجھے چند منٹ رُکنے کی اجازت تھی۔ تب ساڑھے نو بجے والدین کے پاؤں چھوکر اور باقی محفل کی طرف جھک کر وہاں سے رُخصت ہوجاتا تھا میں اپنے کمرے میں چلا جاتا تھا اور اطمینان بخش طریقہ پر سوجاتا

تھا۔ لان کے اُس پار محفل سے دھیمی سی آواز تیرتی ہوئی آتی رہتی۔

میرے کوئی ہمعمر دوست نہ تھے لیکن میرے ماموں زاد بھائیوں کو میرے ساتھ آکر کھیلنے کی اجازت تھی۔ لڑکیوں سے میں ماں کے کمروں میں ملتا تھا۔ جبکہ لڑکے میرے کمرے میں آتے یا ہم لان میں کھیلتے۔ سب میں بڑا لڑکا جو مجھ سے چند برس بڑا تھا نصیب چند میرا پسندیدہ اور قریب ترین صحیح معنی میں میرا دوست تھا۔ گرمیوں کی چھٹی میں کبھی کبھی سرکاری تقاریب ہوتی تھیں جن سے میرے والد کو نفرت تھی۔ وہ ایک عجیب شخص تھے۔ بہت ہی ذہین اور کئی معاملوں میں باصلاحیت لیکن شرمیلے اور لوگوں میں گھبراتے تھے۔ دراصل وہ اکثر دوستوں سے یہ کہتے کہ وہ اس انتظار میں ہیں کہ کب میں اکیس برس کا ہوں گا تاکہ وہ ریاست کی ذمہ واریاں مجھے سونپ کر اپنے من پسند مشاغل، شکار، مچھلی پکڑنے، پکانے، گھوڑ دوڑ اور تعمیرات جیسے کاموں میں جو انہیں عزیز تھے معروف ہو جائیں۔ یہ عجیب ستم ظریفی تھی کہ اکیس برس کی عمر میں میں نے اُن سے بچی کچی حکومت حاصل کی۔ لیکن ان حالات میں جن حالات کا اُس وقت وہم و گمان بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

میرے والد نے مجھے عوامی زندگی کیلئے بچپن سے ہی تربیت دینا شروع کی تھی۔ عوام کے سامنے میں نے پہلی بار تقریر گیارہ برس کی عمر میں کی۔ جب میں نے سرینگر میں سالانہ نمائش کا افتتاح

کیا۔ یہ تجارت اور صنعت و حرفت سے متعلق نمائش تھی۔ تفریح گاہ اور عام خوشی ہنسی کی نمائش تھی۔ جس نے ایک سالانہ تقریب کی صورت اختیار کرلی تھی۔ اس کا افتتاح میری گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران ہوا۔ اسلئے افتتاحی رسم کو انجام دینا میرے لئے ایک مستقل مصروفیت بنگئی تھی۔ اپنی پہلی تقریر پڑھنے کا واقعہ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے۔ اگرچہ اندر سے دل کانپ رہا تھا لیکن کسی طرح سے میں نے بیرونی طور سکوں کی نمائش کرنے میں کامیابی پائی۔ تقریر کے بعد کرنل ہاکسر مجھے دا چھی گام لے گئے۔ جہاں میرے والد فخر کے ساتھ میرا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ہر چند اپنے جذبات کا اظہار کرنے والے شخص نہ تھے۔ لیکن کسی خاص موقع پر اُنکے احساسات کا اندازہ کرنا مشکل نہ تھا۔ کچھ برس بعد سنہ ۱۹۴۵ء میں گوپالا سوامی آہنگر نے اس واقعہ کو یاد کیا۔ جب انہوں نے میری ماں کو ایک خط لکھا۔ "ٹائیگر اب بالکل جوان ہوگئے ہونگے۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے جب انہوں نے پہلی عوامی تقریر کی تھی جب میں ریاست میں تھا۔ اور صحیح تلفظ اور خود اعتمادی کے ساتھ انہوں نے بڑے مجمع کے سامنے تقریر کی تھی۔ جس کی کسی قدر سراہنا کی گئی تھی۔"

جبکہ گرمیوں کی چھٹیاں سرینگر میں گذاری جاتی تھیں۔ سردیوں کی چھٹیاں بمبئی میں گذاردی جاتیں جہاں میرے والدین سال میں کئی ماہ کیلئے جاتے۔ بمبئی میں ہماری پوری زندگی گھوڑ دوڑ کے گرد گھومتی میرے والد برسوں گھوڑ دوڑ کے مشہور سرپرست تھے اور عمدہ ریس

کے گھوڑوں کا ایک گلہ پالتے تھے۔ انہیں ریس کورس کے نزدیک مہالکشمی علاقہ میں اصطبلوں میں رکھا جاتا اور ہر شام میرے والد اصطبل میں جاتے اور احاطہ میں انہیں گول گول پھرتے دیکھتے رہتے۔ گھوڑوں کو سرپٹ دوڑایا جاتا۔ گھوڑ دوڑ سے متعلق چھوٹی اور بڑی کتابیں تھیں۔ چابک سواروں اور تربیت دینے والوں کے ساتھ گفتگو ہوتی اور حریف رئیس کے گھوڑوں کے مالکان کے ساتھ پوشیدہ طور جلن رہتی۔ اور آخر میں سنیچر اور اتوار کو دوڑ ہوتی۔ ایسا لگتا تھا جیسے پورا ہفتہ اس تقریب کی تیاری میں صرف ہوتا تھا۔ میرے والد کے لگاتار کم سے کم دو گھوڑے اور کبھی کبھی چار گھوڑے دوڑ میں حصہ لیتے تھے۔ اُنکے نہایت سُرخ اور سنہرے رنگ والے گھوڑوں سے بمبئی گھوڑ دوڑ میں شامل ہونے والا ہر شخص واقف تھا۔ اور برسوں وہ دوڑ کے گھوڑوں کے مالک کے طور پر مشہور رہے۔ اور بہت سی عظیم شہرت والی ریس انہوں نے جیت لیں۔ انہیں گھوڑوں کی عمدہ پہچان تھی اور بمبئی میں سالانہ بکری کے موقع پر وہ کم عمر گھوڑوں کے انتخاب میں بہت محنت کرتے، اسکا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے جموں سے باہر چند میں ناگبنی میں اپنا ایک گھوڑوں پر مشتمل فارم قائم کیا۔ اور اپنی رحلت تک انہوں نے ملک کے بعض بہترین گھوڑے اور کم عمر گھوڑیاں جمع کر لی تھیں۔ صاف ظاہر ہے کہ میرے والد ریاست کے نظام چلانے کے بجائے کہیں زیادہ خوش گھوڑ دوڑ میں تھے۔ یہ کام وہ زیادہ تر احتیاط سے چُنے گئے

وزیر اعظموں اور تھوڑے منسٹروں کے ذمہ جو اکثر ریاست سے باہر کے باشندے ہوتے، پر چھوڑ دیتے تھے۔ حقیقت میں اگرچہ وہ حاکمِ کل تھے لیکن وہ ایک آئینی بادشاہ کے طور پر کام کرتے تھے اور شاید ہی کبھی انہوں نے اپنے منسٹروں کے انتظام میں مداخلت کی ہو۔ اس سلسلہ میں وہ ہندوستان میں اپنے بیشتر ہمعصر شہزادوں سے روشن خیال تھے۔

چھُٹیوں کا مجھے بے چینی سے انتظار رہتا تھا۔ سال میں جو دن اسکول میں گذرتے وہ ایسے لگتے جیسے وہ ختم ہی نہیں ہو نگے۔ اس کے برعکس چھُٹیاں بہت جلدی ختم ہوتی تھیں۔

میں نے جلد ہی جانا کہ وقت یکساں رفتار سے نہیں چلتا ہے۔ خاص کر ایسے لڑکوں کیلئے جنہیں گھر کی یاد ستاتی ہو۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ میں نے آہستہ آہستہ اسکول کی زندگی سے سمجھوتہ کرنا شروع کر دیا۔ حالانکہ میں نے کوئی بہت ساری پائیدار.... دوستیاں نہیں کی تھیں، حقیقت میں عام طور پر اسکول جانے کو میں نے پسند نہیں کیا۔ لیکن میں بالکل واضح دیکھ سکتا ہوں کہ اگر میں گھر پر رہا ہوتا یا کسی جاگیرانہ ادارے میں گیا ہوتا تو شاید میں بُری طرح سے تباہ ہو گیا ہوتا اور ان خطروں کا مقابلہ کرنے کا بالکل قابل نہ ہوتا جن سے میں ناواقف تھا اور مجھ سے چند ہی برس دُور

تھے۔ مجھے صرف اس بات کا دُکھ ہے کہ باپ کی سختی اور کسی ممتاز ہاؤس ٹیچر کی غیر موجودگی کی وجہ سے میرے پاس کوئی مضبوط شخص نہ تھا۔ جس پر میں اُن تربیت والے برسوں کے دوران انحصار کرتا۔ کوئی ایسا شخص جو میری اندرونی بے چینی اور عدم تحفظ کے خلاء کو پُر کرسکتا جس نے مجھے مصیبت میں ڈالا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ کس طرح ایکبار پنڈت رام چند کاک (جنہیں کرنل ہاکسر کے بعد میرا دوست مقرر کرلیا گیا تھا) کے ایک اتفاقیہ جملے نے 'کہ انہیں بحیثیت یُوراج میرے مستقبل سے بڑی توقعات تھیں' طویل عرصہ مہینوں تک شدت سے قوت بخشی۔ پنڈت کاک کئی معنی میں ایک قابل آدمی تھے۔ مغرور، گھمنڈی لیکن جن اصولوں کے وہ معتقد تھے ان میں غیر متزلزل طریقہ پر قائم رہتے وہ مجھے بتاتے کہ انسان جو بہترین خوبی اپنے اندر پیدا کرسکتا ہے وہ توازن قائم رکھنا ہے۔ ہر حالت میں سکون رکھنا۔ تاہم اسکا مظاہرہ انہوں نے اُس دوران کیا جب انکو چند برس بعد غیر اطمینانی اور مصیبت سے سابقہ پڑا۔

اسی اثناء میں میں نے جوانی میں قدم رکھا تھا۔ انسانی جسم کے ابدی بھید آشکارا ہونے شروع ہوئے تھے۔ جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔ ویسا ہی ہے لیکن پھر بھی نیا ہے۔ ایک لڑکے کیلئے یہ حیرت کُن سال ہوتے ہیں۔ بالغ زندگی کے بارے میں پہلی آزمائشی کھوج انسانی جسم کی وسعتوں سے متعلق حیران کُن دریافتیں جن کا مجھے

ہنوز تصور بھی نہیں ہوتا ہے۔ اس قسم کی بیداری کیلئے کشمیر ایک بے مثال جگہ ہے۔ تازہ اور سرد ہوا ہو۔ دُور فاختہ سُریلی آواز میں کُو کُو کرتی ہو۔ شاندار چنار نیلے آسمان میں سر اُونچے کئے ہوئے ہوں اور ایک لڑکا سن بلوغیت کی دہلیز پر حیران، خوف زدہ اور وجد آفرین حالت میں کھڑا ہو۔

جب میں بہت چھوٹا تھا تب سے مجھے مطالعہ کی عادت اور اسکول کی پڑھائی ختم کرتے وقت میں کثرت سے مطالعہ کرنے والا بن چکا تھا۔ اس وقت میری پسندیدہ بارونیس کے سکارلٹ پمپرنل سنسنی خیز ناول اور پی۔جی وُڈ ہاؤس کی پُرسرور حسبو پر کہانیاں تھیں۔ اسکے علاوہ ڈکنس، ہارڈی اور دوسرے برطانوی ادب پارے تھے۔ فرانسیسی لکھنے والوں میں مادیاسنت ڈیوماس اور وکٹر ہیو اور رُوس کے ٹالسٹائی، چیکوف اور گورکی میرے پسندیدہ تھے۔ شاعری مجھے سب سے زیادہ پسند تھی اور ایک زمانہ میں مجھے پال گریو کی گولڈن ٹریجری میں سے درجنوں نظمیں زبانی یاد تھیں۔ جلد ہی مجھے احساس ہوا کہ میری قوت یادداشت دوسرے اکثر لڑکوں سے تیز تھی۔ خاص کر خصوصی اشعار کے سلسلے میں۔ میرے خیال میں ایسا شاعری میں وزن بحر کے پہلو کی وجہ سے ہے جو سنگیت کے ساتھ بہت قریب سے جُڑا ہوا ہے۔ مجھے اداکاری سے بہت دلچسپی تھی۔ اور اسکول اور ہاؤس میں کھیلے

جانے والے ڈراموں میں کافی سرگرم حصہ لیتا تھا۔ میری خاص بات یہ تھی کہ میری آواز میں کڑک پیدا ہونے سے پہلے "ٹوویلتھ نائٹ" میں "اولیویا" کا کردار نبھانا تھا۔ اور بعد میں میں نے ان ڈراموں کی ہدایت دینا شروع کردی جن میں چھوٹے لڑکے کام کرتے تھے۔

اسوقت فلمیں بھی میری زندگی میں ایک اہم جُز تھیں۔ مشرق کی انوکھی فلموں جن میں جان مل، ماریا مونٹنز اور سابو کام کرتے تھے۔ کے علاوہ ہندوستان کی قابل دید فلمیں تھیں۔ جیسے "بھارت ملاپ" اور "رام راج"۔ وجے بھاٹیہ کی مشہور تاریخی فلم جس نے راماٹن کو پوری نسل کیلئے زندہ جاوید بنا دیا۔ "سکندر" جس میں سہراب مودی اور پرتھوی راجکپور کام کرتے تھے۔ "پکار" جس میں نسیم اور سہراب مودو تھے۔ "شکنتلا" جس میں جے شری اور چندر موہن تھے۔ "راجپوتنی" جس میں بین گپتا نے رانا پرتاپ کی شاندار طریقہ پر عکاسی کی تھی۔ "چندرگپتا" جس میں نیا میلی نے ناقابل فراموش چانکیہ کا رول ادا کیا۔ اور بہت سی دوسری فلمیں بھی تھیں۔ نو عمر ذہنوں پر فلموں کے ابدی اثر کا بڑوں کو اکثر اندازہ نہیں ہے۔ جس کا نتیجہ حسد ہے۔ جسکا اظہار وہ خود کرتے رہے ہیں۔

چند ایک ناخوشگوار باتوں کے باوجود میں پڑھائی میں اچھی کارکردگی دکھانے کے قابل تھا۔ اور جوں جوں سالانہ امتحان قریب آتا گیا میری پڑھائی میں بہتری آئی اور میں زیادہ پُراعتماد بن گیا

میں سینیئر کیمبرج امتحان میں دسمبر ۱۹۴۵ء میں بیٹھا۔ یہ وہ سال تھا جب دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی۔ مرکز ہمارے اسکول میں ہی تھا۔ نگران باہر کے تھے۔ اس زمانہ میں ہندوستان کے بجائے پرچے انگلینڈ میں تیار اور درست کئے جاتے تھے۔ اس دوران میں نے پچھلی کئی مزاحمتوں کو پیچھے چھوڑا تھا۔ اور صحیح معنی میں پہلی بار اسکول میں رہنے کو پسند کرنا شروع کیا تھا۔ اس زمانہ میں ڈون اسکول مزید ایک امتحان کا اہتمام کرتا تھا۔ یعنی یو۔ پی بورڈ آف ایجوکیشن کا انٹرمیڈیٹ امتحان۔ یہ دو حصوں یعنی انٹر آرٹ اور انٹر سائنس میں تقسیم ہوتا تھا اور قریب قریب لگاتار ذہین طلباء سائنس کو چُنتے تھے۔ تاہم مجھے واضح طور پر معلوم تھا کہ عوامی زندگی کیلئے آرٹ ہی میری زندگی میں لکھا ہوا تھا۔ جسمیں اقتصادیات سیاسیات اور تاریخی مضامین شامل تھے

۱۹۴۶ میں جب میں سینیئر کیمبرج کرنے کے بعد لوٹا تو میں نے انٹر آرٹس میں داخلہ لیا۔ اور میں نے اپنے آپ کو پوری کلاس سے آگے پایا۔ ان تمام لڑکوں سے بھی آگے جنہوں نے سائنس کو چُنا تھا۔ سال کے دوران سینیئر کیمبرج کے نتائج کا اعلان کیا گیا اور میں نے اوّل درجہ حاصل کیا۔ میں نے گھر یہی بار تار دیا۔ پھر کیا تھا؟ مبارکباد کے تاروں کا تانتا بندھ گیا۔ جو صرف میرے والد کی طرف سے تھے بلکہ اُنکی بہت ساری وفادار رعایا کی طرف سے تھے۔ اسکول دفتر کو پہلے کبھی اتنی تار نہیں ملے تھے۔ اور اس بات نے ایک اضطرابی کیفیت پیدا کردی تھی۔ مجھے یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ میں خود بھی

خوش تھا۔ خصوصاً اسلئے کہ میں دو برس عمر کی رکاوٹ پر قابو پانے میں کامیاب ہوا تھا۔ اور خود کو اپنی کلاس میں اپنے سے بہت سارے بڑے لڑکوں سے امتحان میں بہتر کیا تھا۔

یہ ہمارے اسکول کی برصغیر کے آرپار گذرنے والی تبدیلی لانے والی ہواؤں سے علیحدگی کا اثر تھا۔ کہ تقریباً آخری سال تک ہم ان سیاسی تبدیلیوں سے بے بہرہ رہے جو زور پکڑ رہی تھیں۔ اور جو ایک برس کے اندر ہندوستانی کو آزادی سے ہمکنار کر رہی تھیں۔ مگر تقسیم کی صورت میں۔ حالانکہ ہم نے پہلے کرپس مشن اور بعد میں کیبنٹ مشن جسکی قیادت قابل قدر اشخاص جنہیں ہم ترنگ میں لارڈ پیتھیٹک لارنس پکارتے تھے۔ ہمیں ان زبردست قوتوں کی کوئی واقفیت نہ تھی۔ جو جدید تاریخ میں ایک نیا سن ERA پیدا کرنے کے کام پر لگے ہوئے تھے۔ میری ہمدردیاں قدرتی طور پر گاندھی جی کے ساتھ تھیں لیکن طلباء زیادہ تر بھارت کی انڈین سول سروس کے افسروں اور امیر تاجروں کے فرزند تھے۔ جن سے یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی تھی کہ وہ قومی تحریک کے دھارے میں شامل ہو سکیں گے۔

بالکل اسی عرصہ میں میرا جواہر لعل نہرو کی سوانح حیات سے واسطہ پڑا۔ مجھے مسرت ہوئی۔ ایک ذہین اور حساس آدمی جو آرام کیلئے پیدا ہوا تھا لیکن جو اپنے آپ کو مکمل طور پر لاکھوں عوام کی امیدوں اور اُمنگوں کے ساتھ وابستہ کر رہا تھا۔ اس مخصوص موقع پر کتاب کا

مطالعہ ایک نئی دریافت تھی۔ اس کتاب نے پہلی بار مجھے تاریخی قوتوں کی اہمیت، ناگریز تبدیلی، قومی تحریک آزادی کی شان و شوکت کی کچھ واقفیت ذہن نشین کرائی۔ اسکے فوراً بعد میں نے انکی "Discovery of India" پڑھی جس نے میرے لئے ذہن کی ایک نئی دنیا کھول کے رکھدی۔ مجھے بیشک ہندوستانی ہونے پر فخر تھا۔ لیکن اس سے قبل کبھی ہماری تاریخ کے طویل اور آنکھوں کے سامنے گھومنے والے قیمتی مناظر میرے سامنے آشکارا نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی میں نے زرخیز گوناگونیت اور تقریباً جاودانی یکجہتی کی سراہنا کی جو بنی نوع انسان کی تاریخ کی ابتداء سے ہندوستان کی خاصا رہی ہے۔ جواہر لعل نہرو کی دو کتابوں کے مطالعہ نے مجھے ایک نئی بیداری عطا کی۔ اور جاگیرداری سے میری نفرت کو مزید تقویت پہنچی جو میرے اندر پہلے سے ہی پیدا ہو رہی تھی۔ میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ پُرانا جاگیردارانہ ڈھانچہ زمین بوس ہونے کے قریب تھا اور کسی بھی طرح میرے والد کی زندگی میری زندگی نہ تھی۔ متبادل راستہ کیا تھا؟ یہ میں نہیں جانتا تھا البتہ اندر سے میں تبدیلی کیلئے تیار تھا۔

باب ۴

درحقیقت طوفان تقریباً آنے ہی والا تھا۔ صدیوں کی مغربی نوآبادیت خاتمہ کے قریب تھی۔ بنی نوع انسان کی اپنی نوعیت کا طویل تاریخی منظر اور نوآبادیات کے عوام کی تحریک آزادی کامیاب انجام سے ہمکنار ہونے والی تھی۔ اور بھارت کی حیثیت اس تحریک میں ہراول دستے کی تھی۔ ہمارے وسیع اور قدیم ہندوستان میں کوئی گہری چیز حرکت کررہی تھی۔ بھارت پھر اُبھر رہا تھا۔ بھارت کی احیائے نو کی کرامت ایک بار پھر ظہور پذیر ہونے والی تھی۔ سب سے زیادہ تباہ کن جنگ بنی نوع انسان نے پہلے کبھی نہیں لڑی تھی۔ ابھی ابھی ختم ہوچکی تھی۔ میرے والد جنگ کے دوران بحیثیت ونسٹن چرچل کے وار کیبنٹ کے ممبر کے طور پر انگلینڈ گئے تھے۔ جو بظاہر ان غور وخوض سے بنائے

گئے سوانگوں میں سے ایک تھا جس میں برطانوی شہنشاہیت سبقت لیتی تھی۔ انکا مقصد سلطنتِ برطانیہ کے ممبران کو مملکت کے معاملات میں برائے نام مداخلت کی اجازت دینی تھی حالانکہ فیصلہ جات پر اثر ڈالنے کا انہیں کوئی حقیقی اختیار نہ تھا۔ جرمنی کی ایک شدید ترین بمباری کے دوران وہ کچھ عرصہ کیلئے لندن میں تھے۔ اور اپنی واپسی پر ہمیں بتایا کہ کس طرح ہوائی حملہ کے سائرن کے باوجود ایک بھی شخص تھیٹر کی نشست پناہ لینے کی غرض سے نہیں چھوڑتا تھا۔ اس لئے پہلے مشرق وسطیٰ میں سٹیٹ فورس کو دیکھنے گئے تھے اور واپسی پر لوگوں نے ان کا شاندار استقبال کیا تھا۔

جنگ کے دوران میری والدہ بھی بہت سرگرم تھیں۔ انہوں نے وار ایڈ کمیٹی WAR AID COMMITTEE بنائی تھی اور وہ سرینگر کی ممتاز خواتین سے پابندی سے ملتیں اور سلائی اور بُنائی کا کام کرتیں۔ اور سرحدوں پر تعینات فوج کیلئے اچار تیار کرتیں۔ بے شک انہوں نے یہ کام اتنی عمدگی سے کیا کہ انہیں "کراؤن آف انڈیا" کے لقب سے نوازا گیا یہ لقب ممتاز عورتوں کے لئے مخصوص تھا۔ اور اس سے پہلے صرف دو یا تین ہندوستانی عورتیں پاچکی تھیں۔ وہ اس سب پوری صورتحال پر بہت خوش تھیں، خاص طور پر اس لئے کہ اُسی سال شاہی خطابات کی فہرست میں میرے والد کو تمغہ ملا۔ جو ترتیب میں آداب و رسوم کے لحاظ سے ذرا سا کم تھا۔ ہماری رسومات کے بارے میں اُنکے بعض

نظریات کی بناء پر وہ کافی روشن خیال بھی تھیں ۱۹۴۷ء میں انہوں نے ایک نئی تاریخ کو جنم دیا۔ جب انہوں نے اُن نو لڑکیوں میں ہریجن لڑکیوں کو بھی شامل کیا۔ جن کی پوجا مقدس نوراتر کے دوران کیجاتی ہے۔ اور جو اس وقت عام طور سے اچھوت مانی جاتی تھیں۔

سابقہ برسوں کے مقابلہ میں انٹرمیڈیٹ میں میرا پہلا سال بہت خوشگوار رہا۔ جس میں صرف ایک غیر متوقع صورت حال نے خلل ڈالا۔ جیسے مری زندگی کو کوئی بُری طرح سے متاثر کرتا تھا۔ جب کبھی دھیرے دھیرے میرے دائیں کولے میں تیز اور کاٹنے والا درد اٹھنا شروع ہوتا تھا۔ جب کبھی سوتے میں میری ٹانگ باہر کی طرف رہتی۔ مجھے کبھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ایسا کس وجہ سے ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ ماضی میں گھوڑ سواری کے دوران گرتے وقت چوٹوں کا نتیجہ تھا۔ لیکن جونہی بار بار درد اٹھنے میں اضافہ ہوا مجھے زیادہ سے زیادہ تشویش ہونے لگی۔ میں نے اس بارے میں مہینوں کسی کو نہیں بتایا جیسے آسانی سے پندرہ سال کے لڑکے کی غلطی سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ ایک ایسی غلطی تھی جس نے مجھے باقی ماندہ زندگی کو ایک سخت کولہا دیا۔

سال ختم ہوا تو ہم اپنے اپنے گھروں کیلئے روانہ ہوئے۔ پوری طرح سے اس توقع کے ساتھ کہ جب اگلا سال شروع ہوگا تو ہم واپس لوٹیں گے۔ ۱۹۴۶ء کے وسط میں ہندوستان کے اندر فرقہ وارانہ ماحول بہت زیادہ ابتر ہو چکا تھا۔ ہندو مسلمان فسادات رونما ہوئے تھے۔

جن میں شدت سے لگاتار اضافہ ہو رہا تھا۔ اور برطانیہ کی واپسی کی تیاری کے ساتھ ساتھ کانگریس اور مُسلم لیگ اس مہلک لڑائی میں مصروف تھے اس آخری سال کے دوران میرے امکانی اغوا کرنے یا اسکول کے اندر نقصان پہنچانے کی بے ہودہ افواہیں پھیلنا شروع ہوئی تھیں۔ لیکن ہم اس سارے معاملے کو ہنسی مذاق میں اڑاتے تھے۔ تاہم میرے والد جنہیں بیشک میری ماں نے بھی 'اُکسایا' نے فیصلہ کیا کہ انکے اکلوتے بیٹے اور وارث کو اتنی دور اسکول بھیجنا بہت خطرناک تھا۔ جب ملک ایک عظیم انقلاب کے دہانے پر کھڑا ہو۔ شاید وہ حق بجانب تھے لیکن گرمیوں کی چھٹیوں میں سرینگر آنے کے فوراً بعد مجھے اس فیصلے کا پتہ چلا تو میں بہت سٹ پٹایا۔ میں نے سوچا کہ یہ عجیب ستم ظریفی تھی کہ جن برسوں میں 'میں' اسکول جانے سے نفرت کرتا تھا تب مجھے بہت بے دردی سے یہاں روانہ کیا گیا۔ اور جب میں نے اس سے لطف اندوز ہونا شروع کیا تو مجھے تحکمانہ انداز میں وہاں سے نکال دیا گیا۔

تاہم حسب معمول میری رائے کی اس معاملہ میں کوئی اہمیت نہ تھی اور جب میری ماں نے وجد آمیز لہجہ میں مجھے اس کی اطلاع دی تو مجھ میں ہنگامہ کھڑا کرنے کی ہمت نہ تھی۔ لہٰذا ڈون اسکول سے میرے چار سال اختتام کو پہنچے۔ یعنی تکلیف دہ سمجھوتہ اور بے بھوک کے چار سال۔ لیکن جو خود اعتمادی کے سلسلہ میں قیمتی تربیت کے سال بھی تھے۔ جو میری باقی ماندہ زندگی میں بہت کام آئے۔ میں پرانی اسکول

کی وابستگی کے بارے میں کچھ زیادہ جذباتی نہیں ہوں لیکن میں باپ کے اس قرضہ کو ضرور مانتا ہوں جو انہوں نے مجھے ڈون اسکول بھیجا۔ ایک ایسے اسکول میں جس کے اندر سخت گیری تھی۔ جس نے مجھے جاگیردارانہ ماحول میں پروان چڑھنے سے بچا لیا اور جس نے مجھے فائدہ مند دانشورانہ بنیادیں بخشیں۔

حالانکہ ڈون اسکول میں میری پڑھائی میں خلل پڑ چکا تھا۔ میں پڑھائی جاری رکھنے کے بارے میں بے چین تھا اور میں نے والد صاحب کو مجھے لوکل سری پرتاپ کالج بھیجنے پر آمادہ کیا۔ انہوں نے یہ مان لیا۔ یہ ایک ایسا واقعہ تھا جس کو اس وقت ترقی پذیر اور جمہوری قدم قرار دیا جاتا تھا، میں ہر روز اے۔ ڈی۔ سی کے ہمراہ کالج جاتا تھا۔ لیکن کلاس میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ بیٹھتا تھا۔ میں نے انگریزی، سیاسیات، تاریخ اور اقتصادیات کے مضامین چُنے اور بحث و مباحثہ اور مقرری میں بھی حصہ لیا۔ ایک موقع پر میں نے مقرری میں انعام پایا۔ جو مجھے سالانہ انعامات تقسیم کرنے کی تقریب پر مجھے ماں نے پیش کیا۔ بدقسمتی سے کالج میں میری موجودگی بہت مختصر ثابت ہوئی جو ۱۹۴۶ء کے موسم گرما تک محدود رہی۔ اس وقت میرے استاد پروفیسر بی۔ کے مدن تھے جو ایک خوشدل، ہوشیار کشمیری پنڈت تھے۔ حالانکہ وہ غیر معمولی قابل نہ تھے لیکن بہت چوکنا اور کافی باخبر تھے۔ انکے کردار کے عین مطابق، ان کا خاص سبق مجھے یہ تھا کہ مواد سے زیادہ پیش کرنے کا انداز امتحان میں

زیادہ ضروری تھا۔ وہ کہتے باریک کاغذ اور کُنڈٹین ہی اہم ہیں۔ یہ کسی چیز کو پیش کرنے کا انداز ہے۔ جو لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔ بہت کم لوگ یہ زحمت اٹھانا گوارہ کرتے ہیں کہ حقیقت میں اس کے اندر کیا ہے جو بے شک روکھا اصول ہے۔ لیکن اس نامکمل دنیا میں فائدہ سے خالی نہیں۔

اسی اثناء میں ہماری گرہستی میں ایک عجیب صورت حال پیدا ہو گئی۔ کوئی سوامی سنت دیو، جو کئی دہائیوں تک سابقہ حکمران مہاراجہ پرتاب سنگھ کے زمانہ میں ریاست میں رہے تھے، اور جن کے بارے میں کہا گیا تھا کہ میرے والد نے تخت نشین ہونے پر انکو ریاست بدر کیا تھا، وہ حیران کن طریقہ پر واپس آگئے تھے۔ وہ لگ بھگ ۱۹۴۴ء میں نمودار ہوئے اور ۱۹۴۶ء تک اپنے لئے راج گرو کا محفوظ مقام حاصل کیا۔ اور میرے والد نے سرینگر میں انکو چشمہ شاہی کے خوبصورت گیسٹ ہاؤس میں اور جموں میں اس مکان میں جس میں، میں بچپن میں رہتا تھا، ٹھہرایا۔ میرے والد مذہب سے کوسوں دور تھے لیکن اچانک سوامی جی کا شاگرد بن کر انہوں نے ہر کسی کو حیران کر دیا۔ وہ دیر تک انکے سامنے زمین پر بیٹھتے اور انکی موجودگی میں کبھی سگریٹ نہیں پیتے۔ سوامی جی کو انہوں نے خوبصورت ریشمی پیرہن، ایک چاندی کا حقہ اور کار سمیت اور بہت سی سہولیات

فراہم کیں۔ کئی طرح سے وہ قابل تعریف شخص تھے۔ علم کے
کئی شعبوں میں وہ عالم و فاضل تھے اور بڑھاپے میں
بھی ان کا رنگ گلابی تھا۔ وہ کبھی اپنی عمر نہ بتاتے
تھے لیکن افواہ یہ تھی کہ وہ اسی سے اوپر تھے۔ بعض
کہتے کہ وہ سو برس کے تھے۔ وہ پابندی سے افیون
کھاتے اور سر ہلا کر سونے کا اشارہ کرتے۔ اس
حرکت کو انکے شاگرد انکے ایشور کے ساتھ براہ راست
رابطہ سے تعبیر کرتے۔

بعد میں اگرچہ انہیں بہت زیادہ بدنام
کیا گیا، میں سمجھتا ہوں میرے والد کی ذاتی
زندگی پر ان کا اثر اچھا ہی پڑا۔ انہوں نے
میرے والد کو سگریٹ اور شراب کم کرنے
کی تاکید کی اور عام طور سے انکی جارحانہ فطرت
کو کسی مذہبی وعدہ کے طور پر اعتدال پر
لایا۔ اسکے علاوہ وہ میرے والدین کو ایک دوسرے
کے قریب لانے کا ذریعہ تھے۔ میری والدہ چونکہ
مذہبی تھیں اسلئے وہ اس بدلتی صورت حال
پر بے شک خوش تھیں۔ اور میری والدہ کے
بڑے بھائی ٹھاکر نانچنت چند، جو کئی سال تک دیو

ہری افسر تھے وہ میرے والد اور سوامی جی کے درمیان
ایک رابطہ تھے۔ اسلئے دربار میں انکی اہمیت بڑھ
گئی۔ مجھے بھی لگاتار سوامی جی کے پاس جانا پڑتا
تھا۔ کولہے کے درد کی وجہ سے فرش پر
دوزانو ہو کر بیٹھنا مشکل ثابت ہو رہا
تھا۔ اسلئے میں وہاں جانے سے دور بھاگتا تھا

سوامی جی ہمیشہ میرے ساتھ شفقت سے پیش آتے تھے۔ وہ کلاسیکی سنگیت
کے ماہر نقاد تھے۔ اور مجھے اپنے پسندیدہ راگ جے جے ونتی کو گاتے
ہوئے دیکھ کر محظوظ ہوتے تھے۔

یہ سیاسی میدان تھا جس میں سوامی جی کا اثر تباہ کن ثابت ہوا۔
ہندوستان کی کئی بڑی ریاستوں کی طرح انگریزوں کے چلے جانے کے بعد
خود مختار بننے کا امکان میرے والد کو للچا رہا تھا۔ انہوں نے برطانیہ کی
حکمرانی کو کبھی پسند نہیں کیا تھا۔ اور اسی کے ساتھ جاگیردارانہ رسومات
میں بری طرح سے پھنسے ہوئے تھے اور خود ریاست کے اندر جمہوری قوتوں کے ساتھ
صلاح سے دور تھے۔ جو زور پکڑ رہی تھی۔ جاگیردارانہ نظام کی ایک بڑی خامی
یہ ہے کہ حکمرانوں کو وہی کہا جاتا ہے جو انکے درباریوں کے خیال میں حکمران
سننا پسند کرتے ہیں۔ جو اکثر بہت کم اسکے ساتھ مطابقت رکھتا
ہے۔ جو حقیقت میں ہو رہا ہے۔ اس جاگیردارانہ خواہش کو دیکھ کر

سوامی جی نے چالاکی کی۔ میرے والد کے ذہن میں ایک وسیع سلطنت کا خیال ڈالا جو لاہور تک پھیلی ہو' جہاں ہمارے جد مہاراجہ گلاب سنگھ اور اُنکے بھائی راجہ سچیت سنگھ نے ایک صدی پہلے ایک رسم ادا کر چکے تھے۔ اس خیال میں کچھ جوازیت موجود تھی۔ کہ سوامی کا چند کانگریس لیڈروں کے ساتھ رابطہ تھا۔ اور ۱۹۴۷ء کے شروع میں آچاریہ کرپلانی کا ریاست کا دورہ ان کی براہ راست مداخلت کا نتیجہ تھا۔

جو کچھ بھی ہو' ڈوگرہ شاہی کے دن تیزی سے پورے ہو رہے تھے۔ حالانکہ میرے والد گمن ان زبردست قوتوں سے بے خبر تھے جو برصغیر میں سرگرم عمل تھیں۔ ریاست میں شیخ محمد عبداللہ نے مسلم کانفرنس جسکی بنیاد ۱۹۳۱ء میں پڑی تھی کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کیا تھا اور انہوں نے ذاتی اور نظریاتی رابطہ پنڈت نہرو کے ساتھ قائم کیا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ ریاست کی عوامی تحریک میں سرگرم تھے۔ یہ تحریک ہندوستان کی ریاستوں میں انگریزوں کے خلاف انڈین نیشنل کانگریس کی وسیع تحریک کے موافق تھی۔ حالانکہ شیخ محمد عبداللہ سردار پٹیل جیسے زیادہ تنگ نظر کانگریس لیڈر پر دراصل کبھی بھروسہ نہیں کرتے تھے۔ تاہم وہ پنڈت نہرو کا قریبی اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے جو شاید بنیادی طور کشمیری ہونے کی وجہ سے کشمیر کو اپنی دلچسپی کی ایک خصوصی جگہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔

محمد علی جناح کو شیخ صاحب اور انکے ساتھیوں کا کوئی

خاص فائدہ نہ تھا کیونکہ ایک تو شیخ محمد عبداللہ انکے نقش قدم پر چلنے کیلئے تیار نہ تھے اور اسلئے بھی کیونکہ جناح کا مسیحائی عقیدہ کہ وہ اور ان کی مُسلم لیگ برصغیر میں مسلمانوں کے مفادات کے واحد محافظ تھے۔ شیخ محمد عبداللہ کی تدبیریں سادہ مگر مؤثر تھیں۔ جیسے کہ وہ ہمیشہ ڈوگروں کے خلاف جذبہ سے پُر ہوتے تھے۔ انہوں نے مؤثر طریقہ پر نہرو کے جاگیردارانہ نظام کے خلاف نظریہ کا فائدہ اپنی سیاسی حملہ کا میرے والد کو خاص نشانہ بنا کر اٹھایا۔ مئی ۱۹۴۶ء میں شیخ محمد عبداللہ اور اُن کی نیشنل کانفرنس نے "کشمیر چھوڑدو" تحریک کا آغاز اُسی طرح کیا جسطرح گاندھی جی نے چار سال پہلے بھارت چھوڑدو کا مشہور نعرہ دیا تھا۔

اس سے پہلے میرے والد نے ریاست میں مقبول حکومت کی جانب کچھ قدم اُٹھائے تھے۔ جسمیں ۱۹۴۴ء کا دو قوتوں پر مشتمل حکومت کا تجربہ بھی شامل تھا۔ ایسا انہوں نے جانبدارانہ انتخاب کے ذریعہ پرجا پرشد کو قائم کر کے کیا لیکن اس بات نے نیشنل کانفرنس کی ریاست کے اقتدار میں مکمل حصے کی مانگ کو مطمئن نہیں کیا۔ ۱۹۴۵ء میں سوپور کے پارٹی اجلاس میں جواہر لعل نہرو اور خان عبدالغفار خان نے شرکت کی اور انڈین نیشنل کانگریس نے جو عام طور پر اسٹیٹ پیپلز پارٹی کی حمایت کرتی تھی۔ سر پر چھائی ہوئی تقسیم اور جواہر لعل نہرو اور شیخ محمد عبداللہ کے درمیان قریبی ذاتی دوستی کے پیش نظر کشمیر میں خاص دلچسپی دکھائی تھی۔ بدقسمتی سے میرے والد تاریخی تبدیلیوں کی

وسعت کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ جو قریب ہی تھی۔ اسکا واضح ثبوت اس حقیقت سے ملتا ہے جب ۲۰ مئی کو شیخ محمد عبداللہ اور بہت سارے نیشنل کانفرنس کے کارکن گرفتار کئے گئے تھے اور جواہر لعل نہرو نے ریاست میں اپنے داخل ہونے کا اعلان کیا۔ اُنکے داخلے پر پابندی لگادی گئی۔ عادت سے مجبور، جواہر لعل نہرو نے پابندی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پنجاب کی طرف سے کوہالہ پُل سے ہوتے ہوئے کشمیر میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔ گورکھا افسر میجر بھگوان سنگھ کی قیادت میں ریاستی فوج کی ایک کمپنی سنگین ہاتھ میں لئے ہوئے کے اس پار بیچ راستے میں کھڑی ہوئی۔ جواہر لعل ہمیشہ کی طرح بے خوف ہو کر سنگینوں کو ایک طرف دھکیلتے ہوئے اس پار چلے آئے۔ خوش قسمتی سے بھگوان سنگھ ایک موقعہ شناس اور ذہین آدمی تھے۔ اور نرمی سے جواہر لعل کو پُل کے اُس پار آنے کو کہا گیا۔ اور انہیں مطلع کیا کہ وہ گرفتار کئے گئے ہیں۔

ہمیں یہ خبر گلاب بھون میں ملی اور پنڈت کاک اس وقت کے وزیر اعظم نے مدہم، فخر اور جوش کے ساتھ میرے والد کو اطلاع دی کہ جواہر لعل نہرو گرفتار کئے جا چکے ہیں۔ میں سکتے میں آگیا۔ قومی تحریک آزادی کے سب سے زیادہ پُرکشش رہنما' "سوانح حیات" اور "ڈسکوری آف انڈیا" کے مصنف اور جمہوریہ بھارت کا مستقبل کا اعلانیہ وزیر اعظم کا استقبال کرنے اور انکی مدد کرنے کے بجائے انکو ہم نے قید کیا تھا۔ مجھے کوئی شبہ نہیں کہ انکی گرفتاری ریاست کی تاریخ میں ایک انقلابی واقعہ ثابت

ہوا۔ جواہر لعل نہرو کو سرینگر لایا گیا اور تین دن بعد کانگریس ورکنگ کمیٹی نے انہیں واپس بھارت آنے پر آمادہ کیا۔ جولائی کے آخیر میں ریاستی سرکار نے اُنکے داخلہ پر عائد پابندی کو ہٹا دیا۔ اور وہ یہاں آئے اور شیخ محمد عبداللہ سے جیل میں ملاقات کی۔ لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ نقشہ بدل چکا تھا۔ اور تباہی برپا ہونے میں صرف وقت کا انتظار تھا۔

مجھے ہمیشہ یہ افسوسناک دکھائی دیا کہ میرے باپ جیسا ذہین اور کئی معنوں میں آئینی اور ترقی پسند خیالات رکھنے والے آدمی کو ان آخری برسوں میں ملک کے اندر سیاسی صورت حال کا اسقدر غلط اندازہ ہوا۔ عام طور پر وہ روشن خیال حکمران تھے۔ مثال کے طور پر انہوں نے ۱۹۳۲ء میں ہی ریاست میں ہریجنوں کیلئے مندروں کے دروازے کھلے چھوڑ دئے تھے۔ اس موقعہ پر راج گرو، جو ہمارے گھریلو مندر رگھوناتھ مندر کے بڑے پُجاری تھے، نے اس اقدام کی مخالفت کی تھی۔ میرے والد نے بے مروتی سے اُنکو اس عہدہ سے ہٹا دیا۔ اور اُنکی جگہ انکے بھائی کو مقرر کیا جنہوں نے بغیر کسی چُون وچرا کے ہریجنوں کو قبول کیا۔ اسی طرح زمین کی حقِ ملکیت اور انتظامیہ کے متعلق میرے والد نے ہندوستان کی باقی ریاستوں کے مقابلے میں بہت پہلے اصلاحات لاگو کئے تھے۔ اپنے منسٹروں کی تقرری کے بعد (جن میں عام طور پر اکثریت یوپی کے مسلمانوں کی ہوتی تھی) انکے کام میں ہرگز مداخلت نہیں کیا کرتے تھے۔ بے شک ایک کیس تھا جبکہ جموں کے باشندہ نے جو

بالکل ہمارے محل کے باہر رہتا تھا میرے والد کے اس فیصلے کو چیلنج کیا۔ جسکے ذریعہ انہوں نے انکی جائداد حاصل کی تھی۔ اور کامیابی کے ساتھ اس کاروائی کو روکا۔ حقیقت یہ ہے جب وہ تیس برس کی عمر میں ۲۳ ستمبر ۱۹۲۵ء میں تخت نشین ہوئے تھے۔ انہوں نے اعلان کیا تھا کہ "انصاف میرا مذہب ہے۔ اور صرف قابلیت ہی ہرطرح کی نوکریوں کیلئے فیصلہ کن جز تصور کیا جائے گا۔ ذات پات، مذہب یا جنس کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی"۔ اپنی حکومت کے دوران انہوں نے بہت سارے انتظامیہ کے متعلق اور سیاسی اصلاحات رائج کئے۔ جس کا آخری نتیجہ ۱۹۴۴ء میں دو قوتوں پر مشتمل سرکار نکلا۔ اس کے تحت دس سال پہلے قائم کی گئی پرجا سبھا کو چھ وزیر نامزد کرنے کا اختیار دیا گیا۔ ان میں سے میرے والد نے کابینہ میں شمولیت کیلئے دو اشخاص چنے۔ اس طرح سے پہلی بار حکومت میں... جمہوری اصول کی شروعات ہوئی۔ اور ۱۹۴۴ء کے آخر میں ایسے ہی دو منسٹروں کی تقرری عمل میں لائی گئی یعنی مرزا محمد افضل بیگ اور وزیر گنگارام جنہوں نے بالترتیب مسلمانوں اور ہندؤں میں سب سے زیادہ ووٹ حاصل کئے تھے۔

اسکے علاوہ دوسرے بیشتر حکمرانوں کے برعکس میرے والد نے جواہرات سمیت اپنی ذاتی اور ریاست کی جائداد میں واضح طور پر فرق کیا۔ انہوں نے ریاست کے توشخانہ (خزانہ) میں کروڑوں روپے کی مالیت کے گھریلو جواہرات، شال، قالین اور شاہی ساز و سامان...

چھوڑا۔ جو بیشتر لوگ جو انکی جگہ ہوتے، کسی کو کانوں کان خبر ہوئے بغیر ہتھیا لیتے۔ محل میں وہ خاموش اور الگ تھلگ زندگی گذارتے۔ اور ذاتی مفادات کی خاطر عوام کو کبھی پریشان نہ کرتے۔ موجودہ غیر جانبدار شاہدین نے اس بات کو تسلیم کیا کہ ان کا انتظامیہ اور انصاف کا نظام ۱۹۴۷ء کے بعد کے حکمرانوں کے انتظامیہ اور انصاف سے کہیں بہتر تھا۔ کرپشن بہت ہی کم تھا اور جہاں کہیں اسکا پتہ لگتا سخت سزا دیجاتی تھی۔

روشن خیال حکمران ہونا ایک بات تھی۔ لیکن ہزار برس کی ایک بھی تاریخی سیاسی صورت حال سے سمجھوتہ کرنا دوسری بات تھی۔ اس وقت برصغیر میں چار قوتیں کام کر رہی تھیں۔ اور میرے والد ان سب سے برسرپیکار تھے۔ انگریز تھے جو بالآخر اپنی سلطنت کے سب سے زیادہ چمکدار ہیرے سے دستبردار ہونے کیلئے تیار تھے۔ حالانکہ آخری وقت تک حقیقت میں انہیں کبھی یقین نہیں آیا۔ کہ وہ سچ مچ چلے جائیں گے۔ لیکن میرے والد بہت زیادہ محب وطن تھے اور انکے ساتھ کسی قسم کی خفیہ سودا بازی نہیں کر سکتے تھے۔ گاندھی جی سے تحریک پائی ہوئی انڈین نیشنل کانگریس تھی۔ اور جسکی قیادت جواہر لال نہرو، ولبھ بھائی پٹیل، مولانا آزاد اور دوسری عظیم شخصیتیں کر رہی تھیں۔ اس جماعت سے میرے والد اس لئے خائف تھے کیونکہ پنڈت نہرو کے میرے والد کے پرلے درجے کے دشمن شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ قریبی تعلقات تھے۔ مسلم لیگ جس کی قیادت محمد علی جناح کر رہے تھے۔ حالانکہ اس جماعت نے حکمرانوں

کو اپنی اپنی ریاستوں کی قسمت کا فیصلہ کے حق کی حمایت کی اور کشمیر میں شیخ محمد عبداللہ اور انکی نیشنل کانفرنس کی مخالفت کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ میرے والد ایک ہندو تھے اور مسلم لیگ کی مسلم فرقہ پرستی کو برداشت کرنے سے قاصر تھے اور اس بات نے انہیں پاکستان کی طرف سے دلفریب پیشکشوں کو ٹھکرانے پر آمادہ کیا۔ آخر میں ریاست میں خود بھی ایک بڑی سیاسی جماعت نیشنل کانفرنس تھی۔ جسکی قیادت شیخ محمد عبداللہ کر رہے تھے۔ جن کے ساتھ وہ برسوں برسرِپیکار تھے کیونکہ وہ اسے انہیں اپنے تخت اور ڈوگرہ حکومت کے لئے خاص خطرہ سمجھتے تھے۔ جسکا ٹھوس نتیجہ یہ نکلا کہ جب نازک گھڑی آن پڑی۔ تو سبھی اہم قوتیں انکے مقابلہ میں صف آرا تھیں۔ اس پر میرے والد کی کسی ایک طرف کے حق میں فیصلہ کے لئے راغب نہ تھے۔ پس انہوں نے اپنے آپ کو تنہا اور بے یار پایا اور ڈوگرہ اقتدار کی عمارت جسکو ایک صدی سے زیادہ عرصہ میں تکلیفیں اٹھا کر تعمیر کیا گیا تھا' زمین بوس ہوگئی۔

اگر میں دس برس بڑا ہوتا میں نے محسوس کیا کہ میں نے تاریخ کو بدل دیا ہوتا۔ لیکن اگر میں دس بڑا ہوتا تو کیا میں جاگیردارانہ نظام کی وباء کا شکار نہیں ہوا ہوتا؟

نہرو کی گرفتاری سے پیدا شدہ کھلبلی کے باوجود حالات تھوڑی دیر کیلئے معمول پر آئے ہوئے دکھائی دئے۔ وہ موسم گرما میں نے

سرینگر میں کالج جانے اور ہفتہ کے روز اپنے والدین کے ہمراہ مچھلی کا شکار کرنے اور شکار کھیلنے کی مہمات میں گذارا ۔ مجھے پہلی بار ایک بڑے شکار پر نشانہ آزمانے کی اجازت دیگئی۔ میرے باپ نے مجھے ۳۱۸ رائفل دی اور پہلے بڑے شکار کے لئے مجھے ایک ماہر شکاری ٹھاکر ہرنام سنگھ پٹھانیا جو ہمارے محکمہ جنگلات میں ایک بڑے آفیسر تھے اور جو بعد میں چیف کنسرویٹر کے عہدہ تک پہنچے' کے ہمراہ داچھی گام بھیجا گیا۔ ہم صبح سویرے روانہ ہوئے اور سورج طلوع ہونے سے پہلے مخصوص جگہ میں داخل ہوگئے۔ سرد ہوا جنگل کی ہوا سے معطر تھی۔ اور جنگل اس صبح کاذب میں زندہ جاوید دکھائی دے رہا تھا۔ اس شگفتگی کے ذائقہ کی جو میں نے ہاتھ میں بندوق لئے ہوئے محسوس کیا وہ میں اب بھی محسوس کرسکتا ہوں۔ ہم جنگل سے گذرتے رہے۔ کچھ دیر بعد سورج طلوع ہوا اور اردگرد کے پہاڑوں کی ڈھلوانوں پہ لگے جنگلوں کو موسم خزاں کے رنگ میں آتشین بنا دیا۔ ہم شاندار بارہ سنگا کا شکار کرنا چاہتے تھے۔ لیکن مجھے ایک بھی نظر نہیں آیا۔ معصوم اور بھیگی آنکھوں والی ہرنیاں ساکت کھڑی رہیں۔ جب تک ہم بالکل قریب پہنچے وہ جنگل میں تیزی سے بھاگ گئیں۔

دس بجے کے قریب جب ہم شکارگاہ میں بہت گھومے تھے ہرنام سنگھ نے میرا ہاتھ پکڑا اور دھیرے دھیرے میرے کان میں کہا۔ "کیا تم بالُو پر گولی چلانا چاہو گے؟" تقریباً سو گز دُور درختوں میں

آدھا چھپا ہوا ایک بڑا کالا ریچھ کھڑا تھا۔ میں نے اپنا رائفل اٹھایا اور گولی چلائی۔ گولی ریچھ کو اچھی طرح سے لگی۔ لیکن یہ سخت جان مخلوق ہے اور جب تک اسکو کاری ضرب نہ لگے یہ بچ جاتے ہیں۔ ہم احتیاط کے ساتھ اس جانب چلے جہاں ریچھ گر چکا تھا۔ ہرنام سنگھ نے اپنی بندوق تیار رکھی تھی۔ ہم نے خون دیکھا لیکن ریچھ کا کوئی اتہ پتہ نہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ریچھوں کی خفیہ جگہیں محفوظ ہوتی ہیں۔ جہاں وہ بیمار یا زخمی ہونے پر جاتے ہیں۔ اور یہ کہ وہ اپنے زخموں کو جنگل کی شفا بخش جڑی بوٹیوں سے علاج کر سکتے ہیں۔ بہرحال جو بھی ہو، ہم نے اُسے کہیں نہیں پایا۔ شاید یہ اشارہ تھا کہ میری قسمت میں شکاری بننا نہیں لکھا تھا اور اچھا ہوا کہ چند سال بعد میں نے مچھلی پکڑنا اور شکار کھیلنا ترک کر دیا۔

موسم گرما اختتام پذیر ہوا اور اسکی جگہ کشمیر کے شاندار خزاں نے لے لی۔ چنار کے پتے لال سُرخ ہونا شروع ہوئے۔ دھان پک گئے اور سنہری رنگ کے کھیت وادی کے سبزہ زاروں کے مقابل میں چمک اُٹھے۔ تازگی بخش ہوا پُر امید تھی۔ برصغیر میں بہت کچھ ہو رہا تھا۔ کیبنٹ مشن آیا اور چلا گیا۔ جناح کے بٹوارے کی مانگ نے برصغیر کی بنیادیں ہلا دیں۔ چوڑے چکلے ایک آنکھ والے واتش رائے کی جگہ خوبصورت لارڈ مونٹ بیٹن اور انکی حسین بیوی ایڈونیا آگئے

تاریخ ڈرامائی صورت اختیار کرنے کو تیار بیٹھی تھی۔ اور پھر بھی ہم تقریباً مکمل طور معمولی باتوں میں اُلجھے ہوئے تھے۔ میرے والد

کے دربار میں چھوٹی چھوٹی منحوس سازشیں تھیں، تنگ نظر آدمیوں نے انہیں حلقہ میں لے رکھا تھا۔ وقت کاٹنے والے اور جی حضور کرنے والے آدمیوں کی ٹولی ہمیشہ ان سے چمٹی رہتی تھی۔

سوامی جی کا اثر بڑھتا جا رہا تھا۔ اور اسکے ساتھ دربار میں میری والدہ کے بڑے بھائی ٹھاکر ناجنت چند کی طاقت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ جب میری ماں کی شادی ہوئی تو وہ ڈوگرہ ریجمنٹ میں ایک بغیر کمیشن افسر تھے۔ اور شادی کے بعد حسب دستور انہیں بڑی جاگیر دی گئی تھی اور خاص درباری بنا گئے تھے۔ وہ والد کے برسوں دیوان رہے۔ چونکہ وہ ان سے عمر میں کئی برس بڑے تھے اور ایکبار جب وہ بچی تھیں۔ بچے پور کے پانی کے تالاب میں ڈوبنے سے بچایا تھا۔ اسلئے ان کا میری ماں پر بہت اثر تھا۔ جبکہ وہ ہوشیار اور ایک وفادار شخص تھے۔ انکی ذہنی اپیچ محدود تھی۔ اور انکے ذمہ زیادہ تر سوامیوں اور سادھوؤں کی جادو بھری مہربانیاں حاصل کرنا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میری والدہ نے شادی کے بعد بہت مشکل سال گذارے۔ جب ایک گاؤں کی لڑکی کو دربار کے سازشی بھنور میں داخل کیا گیا تو وہ اُن کے لئے ایک عظیم قوت تھے۔ اور شاید ہی انہوں نے کوئی موقع کھو دیا ہو۔ جب انہوں نے میری ماں کی راہنمائی نہ کی ہو۔ ایسا نہ ہوتا تو میرے پیدا ہونے سے بہت پہلے وہ سازشوں کا شکار ہو کر ختم ہوئی ہوتیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے دربار کے مخالف جتھے کی ناراضگی مول لی اور

میرے والد کے جو عزیزوں، جموال برادری میں عام طور پر مقبول نہ تھے اور وہ نفرت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ تاہم سوامی جی کے ظہور ہونے کے ساتھ انہیں اچانک شہرت ملی اور وہ انکے اور میرے والد کے درمیان خاص ایلچی تھے

ہم حسب معمول نومبر کے پہلے ہفتہ میں موسم سرما کیلئے جموں چلے گئے۔ میرے معلم پروفیسروں نے معلومات کر کے پتہ لگایا تھا کہ میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان بطور پرائیویٹ امیدوار الہ آباد یونیورسٹی سے دے سکتا تھا۔ میرے والد کو اس خیال سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ خود بھی وہ میاؤ کالج میں میٹرک سے آگے کبھی بھی نہیں گئے۔ لیکن مدن اور میری ماں انہیں راضی کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اسکے لئے مدن صاحب کا مجھ پر بھاری قرض ہے۔ کیونکہ اگر اس بات پر میری تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوا ہوتا تو میرے لئے اسکو دوبارہ جاری رکھنا (جیسا کہ میں نے بعد میں کیا) ناممکن ہوتا۔ جموں میں ملازموں کے مکانوں کے لئے ایک میں خصوصی امتحانی مرکز کھولا گیا۔ اور ۱۹۴۷ء کے شروع میں، میں امتحان میں شامل ہوا۔ میرے مضامین انگریزی، سیاسیات، اقتصادیات اور ہندی تھے۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہ سینئر کیمرج کے بعد ڈون میں میری تعلیم ایک موسم تک جاری رہی۔ ایک موسم سرینگر کالج میں رہی اور عجلت سے جموں میں پرائیویٹ طور پر چند ماہ پڑھائی ہوئی۔ اسلئے درجہ دوم میں کامیابی پانے پر میں کافی... خوش تھا۔

میں تیزی کے ساتھ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں دیکھ سکتا ہوں کہ زنگ آلودہ جاگیردارانہ درباری اثر نے عیارانہ طور پر میرے برتاؤ کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ نوکروں کے ساتھ میرا سلوک متکبرانہ ہونا شروع ہو رہا تھا۔ کتوں کے ساتھ سختی سے پیش آتا اور عام طور پر میرے اندر وہ خصوصیات پیدا ہونا شروع ہوئی تھیں جو نامعقول، دلپسند جاگیردارانہ زندگی کے خدوخال قائم کرتی ہیں۔ چونکہ اپنی ہمعمر رفاقت سے مجھے واقعی محروم کیا گیا تھا، نصیب لکھنو کالج میں تھا۔ میں زیادہ سے زیادہ وقت نوکروں کے ساتھ گذارتا۔ میرے ماں باپ کسی قدر ایک دوسرے کے قریب آتے دکھائی دئے۔ حالانکہ بنیادی تناؤ موجود تھا۔ جو اکثر جلا دینے والے منظرین پھوٹ پڑتا تھا۔ اور صورت حال نے مجھے مجروح (دق) کر رکھا تھا۔ اس زمانہ میں میری والدہ امر محل میں رہتی تھیں جو اینٹوں کا ایک بڑا محل ہے۔ جسے میرے دادا نے جموں میں تعمیر کرانا شروع کیا تھا۔ لیکن کبھی اسے مکمل نہ کیا۔ جبکہ میرے والد اسکے قریب ہی بھورے رنگ کی ایک پست عمارت میں قیام کرتے تھے۔ جہاں میرا بھی ایک کمرہ تھا۔ میری والدہ ادھر کھانے پر آتیں تو ہم سب بہت دیر تک رمی اور چوسر کھیلتے۔ جموں میں ہماری زندگی سرینگر سے زیادہ تنہا تھی۔ جموں سے چالیس میل دور واحد جگہ جہاں ہم جاتے تھے، 'ادھمپور' تھی، جہاں میرے والد نے چند عمدہ شکار گاہیں قائم کی تھیں۔ انہوں نے وہاں ایک قیامگاہ تارانواس میری والدہ کے نام پر بنوائی۔ جسپر مجھے خوشی بھی

تھی اور حیرت بھی۔ یہاں ہم سب رکھوں میں شکار پر جانے سے پہلے قیام کرتے۔ اگرچہ یہاں کشمیر کے پہاڑوں کی شان وشوکت کی کمی تھی لیکن اُدھمپور کے اردگرد پہاڑیاں چیتے اور سور سمیت طرح طرح کے چھوٹے بڑے شکار کی پرورش کر رہی تھیں۔

ان مہینوں کے دوران میرے دائیں کولھے کے جوڑ میں درد آہستہ آہستہ بڑھتا رہا۔ رات کو سوتے وقت پیش آنے والے شدید درد کی وجہ سے میں خوفزدہ ہوتا۔ میرے دائیں کولھے کے پٹھے اور ٹانگ کمزور ہونا شروع ہوئے۔ جس کے نتیجہ میں' میں نے معمولی سا لنگڑانا شروع کیا۔ جب کبھی میری ماں اس طرف اشارہ کرتیں تو میں معاملہ کو ٹال دیتا۔ لیکن ایک روز میرے والد نے اسے ٹال لیا اور محل کے معالج ڈاکٹر ایس۔ کے۔ شنگلو کو میرا معائنہ کرنے کو کہا۔ تب جاکر انہوں نے پٹھوں کی کمزوری کا پتہ لگایا۔ انہوں نے کئی ہفتے میری تیل مالش کرائی لیکن اسے کوئی فرق نہیں پڑا۔ آخر میں میرے والد نے فیصلہ کیا کہ مجھے بمبئی خصوصی معائنہ کیلئے جانا چاہئے۔ گرہستی کے ناظر برگیڈیر این۔ ایس۔ راوت میرے ہمراہ آئے۔ اور مجھے بہت سے معائنوں اور ایکسرے سے گذرنا پڑا۔ ٹاٹا کینسر ادارہ کے بانی ڈاکٹر خانولکر کے پاس بھی جانا پڑا ربطاً کر کسی نے کینسر کا خدشہ ظاہر کیا تھا۔ لیکن اسکو مسترد کیا گیا۔ ہمیں یہ مشورہ دیا گیا کہ اگر تین مہینے میں درد غائب نہ ہوا تو پھر جوڑ کو کچھ دیر کیلئے غیر متحرک بنانے کیلئے مجھے پلاسٹر چڑھانا پڑے گا۔

اس مایوس کن خبر کے ساتھ میں جموں لوٹ آیا۔ میرے والد اپریل سے آگے کا بیشتر وقت حسب معمول شومینگ پولز میں گذارتے تھے۔ جہاں وہ شام کو اپنے اسٹاف کے ممبران اور چیدہ چیدہ نوکروں کے ساتھ واٹر پولو کھیلتے۔ میں کوئی خاص تیراک نہ تھا اور ان کاروائیوں میں سطحی طور حصہ لیتا تھا۔ میں گھومتے ہوئے ماں کے ساتھ کچھ وقت گذارنے کے لئے امر محل چلا جاتا پھر نیچے کرن نواس چلا جاتا جہاں سوامی جی رہتے تھے۔ درحقیقت میں مایوس تھا اور کولھے کے درد اور عام ماحول سے شدید پریشان تھا۔ موسم سرما ہمارے سر پر آیا لیکن میرے والد نے سرینگر کیلئے روانگی کی تاریخ مقرر کرنے کے بارے میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ بالآخر میری والدہ نے یہ کہتے ہوئے کہ جموں میں ناقابل برداشت گرمی پڑ رہی ہے' مداخلت کی۔ ماضی پر نظر ڈالتے ہوئے مجھے حیرت ہوتی ہے کہ آیا انہیں پہلے سے ہی آگاہی تھی کہ بحیثیت حکمران کے یہ انکی کشمیر کی آخری سیر تھی۔

بالآخر ہم مئی کے آخیر میں سرینگر چلے آئے اور فوراً ہی نئے وائسرائے لوئیس لارڈ ماونٹ بیٹن اور لیڈی لارڈ ماونٹ بیٹن کے عنقریب دورہ کے سلسلے میں معروف سرگرمیوں میں اُلجھ گئے۔ برطانوی حکمرانی میں وائسرائیوں کے بھارتی ریاستوں کے دورے معمول کی باتیں تھیں۔ اور مجھے دُھندلا سا یاد ہے کہ جب میں چھوٹا سا لڑکا تھا' لارڈ لنلتھگو آئے تھے۔ اور مجھے سونے کی انگوٹھی گھڑ سواری کی چھڑی تحفہ میں دی تھی۔ لیکن اب کا دورہ خاص تھا' نہ صرف اسلئے کہ برطانیہ پہلے ہی اعلان کر چکا تھا۔

کہ وہ جلد ہندوستان کو چھوڑ دے گا اور حکمرانی سے دستبردار ہو جائیگا لیکن کم سے کم میرے خیال میں اسلئے بھی اہم تھا کیونکہ اہم شخصیات لوٹ چکی تھیں۔ وہ لارڈ واول جیسے خشک اور غیر دلکش وائسرائے کے فوراً بعد آئے۔ سحر انگیز مؤنٹ بیٹن بالکل برعکس تھے۔ اور میں ان سے ملنے کے لئے بے تاب تھے۔

میرے والد رسمی انتظامات کرنے میں بہت محتاط تھے۔ پروگرام صاف ستھرے طریقہ پر چھاپے گئے تھے اور سنہری کاغذ جس پر قرمزی رنگ کی تیر کمان بنی ہوئی تھی۔ (سنہری اور قرمزی اسٹیٹ کے رنگ تھے) میں بندھے ہوئے تھے۔ اور فہرست طعام سمیت ہر تفصیل کا خاکہ کھینچا گیا تھا۔ اور پوری گرہستی ایک مستقل تناؤ کی سی کیفیت سے دوچار تھی۔ کیونکہ اگر کوئی غلطی ہو گئی تو ضرور کسی کا سر کٹ جائیگا۔ چونکہ اس وقت میں کوئی مخصوص کام کر نہیں رہا تھا۔ اسلئے اسٹاف کے کاموں میں' میں بھی ہاتھ بٹاتا۔ حالانکہ میری مدد' کہنا چاہئے' کوئی قابل ذکر نہ تھی۔ آخر کار وہ بڑا دن آ ہی گیا۔ اور وائسرائے اور انکی اہلیہ توپوں کی گرج کے درمیان تشریف لائے۔ (مجھے نہیں معلوم کتنی توپوں کی سلامی دی گئی تھی' لیکن میرے والد ۲۱ توپوں کی سلامی کے مستحق تھے' میرے خیال میں وائسرائے کو ۳۱ توپوں کی سلامی دی گئی تھی) میں اپنے والدین کے ساتھ ڈیوڑھی پر انکے استقبال کرنے کیلئے کھڑا تھا۔ میری پہلی نظر نے تصدیق کی اور میری توقعات کو درست ثابت کر دیا وہ سر سے پاؤں تک شاندار جوڑا تھا' ایکدم

اور ناقابل تنسیخ طور پر میں نے انکو ہاروئین اور کنزی کے ناولوں کے کرداروں سر ہرسی بلیکے لی اور انکی خوبصورت بیوی مارگیوریٹ سے ملا دیا۔ ایسا لگا جیسے وہ ناولوں میں سے کسی ایک ناول کی صفحات سے باہر آئے تھے۔

مرد لمبا' خوبصورت اور شاندار تھا اور عورت حسین' مہربان اور دلفریب تھی۔ میرا لڑکوں جیسا تخیل' جو طویل عرصۂ سے ہمارے اپنے دربار کے سخت ماحول سے چھٹکارا چاہتا تھا' اس نے ماؤنٹ بیٹن کی جوڑی میں ایک شاندار کھڑکی پائی جہاں حقیقت اور افسانہ کا ملاپ تھا۔

اُنکے امیرانہ پس منظر کے باوجود' انکی خفگی یا تکلف کی کوئی بات نہ تھی اور میں انکی بے تکلفی اور ذوق ظرافت کو دیکھ کر خوش تھا۔ میرے والد نے مجھے ٹائیگر کے نام سے اُنکے ساتھ متعارف کرایا تھا۔ اور پورے دورے کے دوران اور یہاں تک کہ اسکے بعد بھی انہوں نے مجھے اسی نام سے پکارا۔ باغوں میں دعوتوں' ضیافتوں اور استقبالوں کا پورا سلسلہ تھا۔ دو دلچسپ واقعات پیش آئے۔ ضیافت کے موقع پر میز کے نیچے گھنٹی تھی۔ جسے میرے باپ کو دعوت کے اختتام پر دبانا تھا اور بینڈ (خدا بادشاہ کو محفوظ رکھے) کی دھن بجاتا۔ مؤنٹ بیٹن اُنکے قریب ہی بیٹھے تھے۔ لمبے تھے اور کھانے کے دوران ہی غلطی سے اُن کا گھٹنا گھنٹی سے ٹکرایا اور اس پر بینڈ

نے سعادتمندی سے ترانہ گانا شروع کر دیا اور ابھی چکن کری ختم نہیں ہوئی تھی

ہم سب دل لگی سے پاؤں پر کھڑے ہونے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ میرے والد غصے سے سرخ ہو گئے۔ لیکن خوش قسمتی سے وہاں کوئی ایسا نہ تھا جسکو وہ الزام دیتے۔ جب ماؤنٹ بیٹن کو پتہ چلا کہ کیا ہوا تھا۔ تو وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے اور میرے اوپر بھی ہنسی کا دورہ پڑا۔ اور میز کی اس طرف سے ماں کی گھورتی ہوئی نظروں کے باوجود میں تقریباً فرش پر لوٹ رہا تھا۔ دوسرا واقعہ اس وقت پیش آیا جب باغ والی دعوت سے پہلے میرے والد کو اسٹاف کے معزز افسروں کا وائسرائے سے تعارف کرانا تھا۔ انہوں نے ہر کسی کو قطار میں کھڑا کر دیا تھا اور احتیاط سے ناموں کی فہرست کو زبانی یاد کر رکھا تھا۔ تاہم کسی غلطی سے کوئی افسر غلط جگہ کھڑا ہو گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پوری ترتیب غلط ہوئی۔ جب میرے والد نے بے تحاشا تعارف کرایا۔ تو انہوں نے اچانک محسوس کیا کہ وہ غلط نام استعمال کر رہے تھے۔ یا یہ کہ وہ ہر شخص کا غلط نام سے تعارف کرا رہے تھے۔ میں کبھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتا ہوں کہ زیادہ بدحواس وہ تھے یا افسران۔

لیکن ایسا لگا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے محسوس نہیں کیا کہ کوئی غلطی ہو رہی تھی یا اگر محسوس کیا بھی تو بہت زیادہ نرم دل

ہونے کی وجہ سے انہوں نے اس طرف کوئی اشارہ نہ دیا۔

تماشا اور چہل پہل کے علاوہ تاہم ماؤنٹ بیٹنوں کے دورہ کا ایک سنجیدہ سیاسی مقصد تھا۔ انگریزوں کے رخصت کا دن تیزی سے قریب آ رہا تھا۔ اور بیشتر ہندوستانی ریاستیں کچھ نہیں محض جغرافیائی مجبوریوں کی وجہ سے دو میں سے کسی ایک ملک کے ساتھ شامل ہونے کے لئے ذہن تیار کر رہی تھیں۔ چند ایک ریاستیں ایسی تھیں جنہیں ابھی فیصلہ کرنا باقی تھا۔ ان میں ہندوستان کی سب سے بڑی دو ریاستیں حیدرآباد اور کشمیر شامل تھیں

جبکہ حیدرآباد مکمل طور سے اس علاقے سے گھرا ہوا تھا جو متحدہ ہندوستان تھا۔ جموں و کشمیر کی سرحدیں دونوں بھارت اور تجویز شدہ نئی مملکت پاکستان سے ملتی تھیں جس میں مسلمان... (دونوں شیعہ اور سنی) ہندو، بدھ اور دوسرے مذہبی گروہ بس رہے تھے۔ مجھے شک ہے کہ دل میں میرے والد اس وقت بھی یقین نہیں کر رہے تھے کہ انگریز سچ مچ چلے جائیں گے فطرتاً وہ تولہ ماشہ ہو کر محض وقت گذار رہے تھے۔

حقیقت میں دیکھا جائے تو جس ماحول کا انہیں سامنا تھا وہ پیچیدہ تھا۔ اور انکے سامنے کوئی آسان حل نہ تھا۔ اگر وہ پاکستان کے ساتھ الحاق کرتے تو انکے مکمل ڈوگرہ سہارہ سمیت لوگوں کی ایک بڑی تعداد مشتعل ہو جاتی۔ اگر وہ ہندوستان کے ساتھ جاملتے تو انہیں

مسلمان رعایا کی اکثریت کے ایک بڑے حصے سے ہاتھ دھونے کا اندیشہ تھا۔ آزادی شاید دلکش تجویز ہو سکتی تھی۔ لیکن اسے حاصل کرنے کے لئے محتاط تیاری اور متعلقہ پارٹیوں کے ساتھ طویل گفت و شنید کی ضرورت تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ زبردست سیاسی اور سفارتی قابلیت درکار تھی۔ دراصل لارڈ مونٹ بیٹن میرے والد کو ۱۵ اگست سے پہلے ہی ذہنی طور آمادہ تیار کرنے کیلئے آئے تھے اور ہندوستانی راہنماؤں کی یقین دہانی لائے تھے۔ کہ وہ چاہئے جس کسی طرف کا فیصلہ مناسب سمجھیں انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ چاہئے وہ پاکستان کے ساتھ الحاق ہی کیوں نہ ہو

اس دشوار صورت حال کو دیکھتے ہی خاص جاگیردارانہ عمل یہ ہے کہ اس کا سامنا کرنے کے بجائے اُسے ٹالا جائے اور میرے والد خاص طور سے اسی طرف مائل تھے۔ بجائے اسکے کہ لارڈ مونٹ بیٹن کے دورہ کا فائدہ اُٹھا کر ساری صورتِ حال پر مثبت طریقہ پر بات چیت کرتے اور کسی معقول نتیجہ پر پہنچتے۔ انہوں نے پہلے وائسرائے کو مچھلیوں کے طویل شکار پر بھیجا (یہاں پر مونٹ بیٹن نے ہمارے نوکروں کو دھوپ میں ننگے نہا کر صدمہ پہنچایا تھا۔) اور بعد میں اُنکے رخصت ہونے سے کچھ ہی دیر پہلے اُن کے ساتھ ملاقات کا وقت مقرر کر دیا۔ اور یہ بہانہ کر کے ملاقات سے اُٹھ کر چلے آئے کہ انہیں اچانک قولنج (پیٹ درد) کا شدید حملہ ہوا ہے۔ جیسا کہ مونٹ بیٹن کے صلاح کار کامبیل جانسن تحریر کر چکے ہیں کہ مونٹ بیٹن بہ آسانی

اس دھوکہ کو تاڑ گئے اور واپس دلی چلے گئے۔ اسلئے آخری بار با مقصد سیاسی تصفیہ کا حقیقی موقع کھو دیا گیا تھا۔

باب ۵

اسی اثناء میں میرے کولھے میں کوئی بہتری نہیں ہوئی ۔ اور
بالآخر لاہور سے مشہور سرجن کرنل مراجکار بلائے گئے ۔ انہوں نے مشورۃ
دیا کہ کولھے کے جوڑ کو پلاسٹر چڑھا کر غیر متحرک بنانا چاہیئے ۔ بستر میں قید
ہونے کا تصور بہت ہی ناگوار کن تھا ۔ لیکن درد میں اضافہ ہو رہا تھا ۔
لہذا ڈاکٹر کا مشورہ ماننے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا ۔ جون میں مراجکار
نے خود پلاسٹر چڑھایا ۔ اور ایک ہی جھٹکے میں' میں نے اپنے آپ کو
ایک اچھے بھلے عام انسان سے واقعی بے بسی میں تبدیل ہوتے ہوئے
پایا ۔ کوئی شخص جسکو اس قسم کے تجربہ سے سابقہ پڑا ہو' وہی پلاسٹر لگا کر
طویل مدت تک بستر میں قید رہ کر جسمانی اور نفسیاتی مسائل کا
اندازہ کر سکتا ہے ۔ سخت پلاسٹر جو میری کمر سے شروع ہو کر میری دائیں
ٹانگ سے لیکر انگوٹھے تک چڑھا ہوا تھا' اسکی وجہ سے محض جسمانی

بے چینی ہی خوفناک تھی ۔ اور بستر میں تک بغیر سہارے کے ہلنے کی لاچاری
پلاسٹر کے اندر کی کھجلی جس سے نجات ممکن نہ تھی اور سب سے زیادہ
بیت الخلاء جانے سے معذوری اور یہ سب باتیں مل کر پاگل کر دینے
والی تھیں ۔

راتیں سب سے زیادہ دشوار کن تھیں ۔ دن میں مجھے بستر سے
اُٹھا کر پہیہ والی کرسی پر بٹھا کر والدین کے ساتھ بٹھانے لیجایا جاتا تھا ۔
وہ سب مجھے بہلانے کی بہت کوشش کرتے اور رمی اور لوڈو کھیلتے ۔
شام کو میرے کچھ ماموں زاد بھائی میرے پاس آتے یا میں کتابیں پڑھتا ۔
لیکن جب رات آتی اور میں خوفناک پلاسٹر چڑھائے ہوئے تنہا بستر
میں ہوتا ۔ میرا دل ڈوب جاتا اور مایوسی میں گرفتار ہونے کا ہیبت
ناک احساس ہوتا ۔ تسکین صرف پوجا سے ملتی ۔ میری والدہ نے
مجھے ایک تسبیح اور درگا کی تصویر دی تھی ۔ گھوڑے پر سوار عظیم دیوی
جسکو میں نے بستر کے پاس رکھا تھا ۔ اکثر میں گھنٹوں تسبیح کے دانے
شمار کرنے میں گذارتا ۔ اور بعض اوقات تسبیح ہاتھ میں لئے ہی سو جاتا
تھا ۔ کبھی کبھی میں خواب میں دیکھتا کہ یہ سب کچھ وہم تھا اور جب میں
جاگ جاؤں گا تو اپنے آپ کو دوبارہ مکمل طور پر ٹھیک ٹھاک پاؤں
گا ۔ لیکن صبح میں اس احساس کے ساتھ جاگ جاتا کہ میری بیماری
ایک ٹھوس حقیقت تھی ۔ میں سوچتا ہوں کہ اسی عرصہ میں حقیقت
سے سمجھوتہ کرنے کی صلاحیت میں نے اپنے اندر پیدا کی جو تاہم ...

ناخوشگوار تھی۔ میں ہمیشہ مشاہدہ نفس کا عادی تھا لیکن اس کھلنے والی اور طویل قید نے، جب میری عمر کے لڑکے اپنی سرگرم زندگی کے عروج پر ہوتے ہیں، میرے ذہن نے مجھے مزید گہرائی میں کھینچ لیا۔

مجھ سے کہا گیا کہ پلاسٹر تین ماہ تک لگا رہے گا۔ جسکے بعد میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جاؤں گا۔ اور معمول کی زندگی کو دوبارہ شروع کرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔ دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے گئے۔ یہ ۱۹۴۷ء کا وہ سال تھا جب ہندوستان کو خون کے سمندر اور تباہی سے گذر کر آزادی پانا تھا۔ ہماری عدم تشدد پر مبنی تحریک آزادی کی جدوجہد کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے اور کس طرح ہتھیاروں کی جنگ پر اترے بغیر ہم آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس حد تک یہ بیشک درست ہے کہ کاروائی کے دوران برطانوی باشندوں کا ایک قطرہ خون بھی نہیں بہایا گیا۔ اور گاندھی جی واقعی ایک لاجواب رہنما تھے۔ لیکن ہندوستان نے ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۷ء کے وحشی اور افسوسناک فرقہ دارانہ فسادات کی صورت میں تحریک آزادی کی بھاری قیمت ادا کی جس نے برّ صغیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ مذہب کی نفرت انگیز اور جنون خیز آگ میں ہزاروں مرد، عورتیں اور بچے قربان کئے گئے۔ کیونکہ ہندو مسلم آپس میں سخت اور بے مثال لڑائی میں مصروف تھے۔ بے مثال اسلئے کہ بروارداتت میں کسی خاص شہر یا علاقہ میں وہ اقلیت میں تھے

جس کو سب سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ پناہ گزینوں کا ایک سیلاب پڑوسی پنجاب سے ریاست میں داخل ہونا شروع ہوا۔ عرصۂ دراز سے جموں وکشمیر آپسی بھائی چارے کا گہوارہ تھا۔ اور اس وقت جب پورا ہندوستان جل رہا تھا تو ایسا لگا جیسے ریاست امن اور بھائی چارہ کا گہوارہ رہیگی۔ گاندھی جی کا یہی مطلب تھا جب انہوں نے کہا کہ "گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی واحد کرن انہیں کشمیر میں نظر آئی"

درحقیقت گاندھی جی نے اس سال اگست میں سرینگر کا دورہ کیا۔ جب ہمیں پتہ چلا کہ وہ آرہے ہیں تو بہت جوش وخروش پیدا ہوا۔ اور اس جوش وخروش میں ڈرامائی انداز میں اضافہ ہوا۔ جب ہم نے سنا کہ اپنے معمول کے دستور کی پرواہ کئے بغیر وہ میرے والد سے پیلس ملنے آئیں گے۔ یہاں تک کہ میرے والد بھی بے چین نظر آئے اور میں نے اصرار کیا کہ مجھے بھی ان سے ملنا چاہیئے۔ کچھ بحث ومباحثہ کے بعد اس پر اتفاق کیا گیا کہ میرے والد، میری والدہ اور میں گلاب بھون کے سامنے بڑے لان میں گاندھی جی سے چنار کے پیڑ کے نیچے ملیں گے۔ بکری کے دودھ اور پھلوں کے مخصوص انتظامات کئے گئے تھے۔ اور انکی آمد سے ایک گھنٹہ پہلے ہم نے چنار کے نیچے اپنی جگہیں سنبھالیں۔ اگر میری یادداشت صحیح ہے تو مقررہ وقت یعنی یکم اگست کو بعد دوپہر پانچ بجے سہ پہر گاندھی جی تشریف لائے۔ میرے والد برساتی تک ان کا استقبال کرنے گئے۔ اور وہ باغ میں اس درخت تک

چلے آئے جہاں میری والدہ اور میں اُنکے منتظر تھے۔ اس نازک مجسّم کو اپنے والد کے طویل قد و قامت کے ساتھ ساتھ اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ کر میرے دل پر کس قدر اثر ہوا تھا۔ اُسے میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ وہ ایک ایسے آدمی تھے جنہوں نے محض اخلاقی قوت سے سب سے بڑی سلطنت کی دیواروں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ جسے دنیا لگاتار دیکھ رہی تھی۔ حالانکہ میری قوتِ یاداشت تیز ہے لیکن مجھے مشکل سے ہی گفتگو کی کوئی بات یاد ہے۔ جب وہ بیٹھ گئے تو وہ میری طرف مخاطب ہوئے۔ "کیسے ہو"؟ تب انہوں نے دھیمی آواز میں گفتگو شروع کی جسے میں صاف طور پر نہ سُن سکا۔ میرے والد احترام سے سُنتے رہے۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے انہوں نے خود سے شاید ہی کچھ کہا ہو۔ جو کچھ بھی میں گاندھی جی کے الفاظ سے مطلب اخذ کر سکتا تھا وہ یہ تھا کہ وہ میرے والد کو لوگوں کی خواہشات کی تصدیق کرنے اور اپنے عوام کا اعتماد حاصل کرنے کی درخواست کر رہے تھے۔ اور اپنے آپ کو اس سیاسی انقلاب کی مخالفت کے بجائے جو ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا' عوام سے منسلک رہنے پر زور دے رہے تھے۔

تقریباً ۹۰ منٹ کے بعد واپس جانے کیلئے کھڑے ہوئے میری ماں نے انکو کچھ دودھ اور پھل کھانے پر اصرار کیا لیکن یہ کہتے ہوئے انہوں نے انکار کیا کہ یہ انکے کھانے کا وقت نہ تھا۔

میری والدہ کے اصرار پر انہوں نے پھل ساتھ لیجانا مان لیا۔ سفید کپڑوں میں ملبوس اور اداس مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف مسکراتے ہوئے خُدا حافظ کرتے ہوئے چلے گئے۔ یہ بات ابھی تک میری یاداشت میں محفوظ ہے۔ وہ لان کے اس پار واپس جانے لگے تو میرے والدین ان کے پیچھے پیچھے تھے اور مجھے چنار کے نیچے تنہا چھوڑا گیا تھا۔ اپنی زندگی میں' میں نے انہیں دوبارہ کبھی نہیں دیکھا۔ لیکن میں نے ایکبار انہیں ایک غیر معمولی روشن خواب میں دیکھا جسکی بدولت انکی تصویر ابھی تک میرے ذہن میں صاف شفاف طور پر موجود ہے۔ لیکن یہ واقعہ انکے قاتلوں کی گولیوں کا نشانہ بننے کے کئی برس بعد کا تھا۔

واقعات میں اب تیزی آنا شروع ہوئی۔ انگریز سچ مُچ ۱۵ اگست کو چلے جانے کی اپنی خواہش کے سلسلہ میں مخلص دکھائی دے رہے تھے۔ انگریزوں کے بارے میں بجا طور پر کہا گیا ہے کہ جس خوش اسلوبی سے وہ ہندوستان چھوڑ گئے وہی ان کا سب سے بڑا کارنامہ تھا جو انہوں نے یہاں انجام دیا اور یہ بات بہت ہی قابلِ داد ہے کہ ہمارے اور اُنکے درمیان کس طرح تلخی کے سبھی نقوش آزادی کے بعد اتنی جلد غائب ہو گئے۔ اسکا زیادہ تر سہرا گاندھی جی کی قیادت میں انڈین نیشنل کانگریس کے سر ہے جس نے تحریکِ آزادی کو بے مثال ڈھنگ سے چلایا۔ انکے اصول

نفرت کے بغیر مخالفت' اور عدم تشدد پر مبنی جدو جہد خصوصاً جنگ کے بعد لیبر گورنمنٹ میں بالکل عام اور مضبوط بے باک برطانوی روایت سے مقابلہ تھا۔ لیکن کانگریس اور مُسلم لیگ کے درمیان مکمل رکاوٹ کی برقراری کی وجہ سے برصغیر کی تقسیم ناگریز بن گئی۔ پانچسو ہندوستانی ریاستوں کی حالت قیاس کے لحاظ سے مشکوک رہی کیونکہ برطانیہ نے یہ اصول اپنایا کہ انکے چلے جانے کے بعد وجود میں آنے والے دو میں سے کسی ایک ملک کے ساتھ ریاستوں کے حکمران الحاق کرنے کے سلسلے میں آزاد تھے۔ تاہم مونٹ بیٹن نے چیمبر آف پرنس پر صاف طور سے ظاہر کیا تھا کہ انکی مرضی حقیقت میں جغرافیائی مجبوری کے تابع تھی۔ جبکہ اسکی خلاف ورزی کرنے کی کوشش کرائی گئی۔ مثال کے طور پر جوناگڑھ اور حیدرآباد یہ دونوں ریاستیں متحدہ بھارت میں واقع تھیں لہذا نتیجہ کا قبل از وقت ہی پتہ تھا۔ تاہم جموں وکشمیر کے بارے میں ایسا نہیں تھا۔ اُس وقت کے ہندوستان کے کسی نقشہ پر ایک سرسری نظر ڈالنا اس ریاست کی غیر معمولی جغرافیائی حیثیت کو اُجاگر کرنے کے لئے کافی ہے۔ جسکی سرحدیں ہندوستان اور پاکستان دونوں سے ملی ہوئی ہیں، مشرق میں تبت اور شمال میں افغانستان کے علاقہ کی پتلی پٹی سے الگ کرتے ہوئے روس سے بھی ملتی ہیں۔ میں نے پہلے بھی جنوبی صوبہ گلگت میں برطانیہ کی مخصوص دلچسپی کا ذکر کیا ہے اور بہت سے تاریخ دانوں نے جنگی لحاظ سے اس اہم علاقہ پر برطانیہ کے

لگاتار مصمم ارادہ کے اوپر پورے مکالمے تیار کئے ہیں۔ بیشک سنہ ۱۹۳۵ء میں انگریز میرے والد پر گلگت ایجنسی کو ساٹھ برس کیلئے پٹے پر دینے کے سلسلہ پر دباؤ ڈال رہے تھے۔ اس پیچیدہ صورت حال میں، جبکہ ریاست مختلف خطوں کے لوگوں کا مجموعہ تھی۔ جن کا تعلق مختلف النسل' تہذیب اور مذہبی طبقوں سے تھا۔ ابتری پیدا ہو رہی تھی۔ وادی میں غالب اکثریت سنی مسلمانوں کی تھی۔ شیعہ فرقہ کے مسلمان بہت کم تھے۔ سکھوں اور طاقتور پنڈتوں کا ایک چھوٹا طبقہ تھا۔ جموں میں ڈوگرہ ہندؤں کی بھاری اکثریت تھی۔ مسلمانوں کا بھی ایک اہم حصّہ تھا۔ مظفرآباد سے لیکر میر پور تک کے مغربی طویل حصّہ میں پنجابی مسلمان آباد تھے۔ گلگت' اسکردو اور کرگل میں شیعہ مسلمان تھے۔ لدّاخ میں لاما والے بدھ رہتے تھے۔ انہیں جوڑنے کا غیر معمولی کام بیشک میرے عظیم بزرگ مہاراجہ گلاب سنگھ کی کارگذاری تھی' جنہوں نے انیسویں صدی کے درمیان انتہائی ہزمندی سے ریاست کو تراشا۔ جہاں تک پاکستان کا سوال تھا تو یہ منطقی دلائل کی مشق تھی ریاست کے لوگ زیادہ تر حکمران گھرانے کے وفادار رہے' حالانکہ شیخ محمد عبداللہ کی ڈوگروں کے خلاف شدید تحریک وادی میں سیاسی شعور رکھنے والے طبقوں کو متأثر کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ لیکن ایک بار جب برطانیہ کی واپسی کا ارادہ اٹل بن گیا اور پاکستان کا وجود ایک سچائی' تو پوری صورت حال میں ایک

بنیادی تبدیلی رونما ہوئی۔ ریاست کو اندرونی ہنگاموں میں دھکیل دیا گیا تھا۔ وہ لوگ جو مستقبل کے پاکستانی صوبوں پنجاب اور این۔ ڈبلیو۔ ایف۔ پی کی سرحدوں کے قریب تھے، سرکش ہونے لگے۔ وادی میں شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں، جو جواہر لعل نہرو کے حق اور میرے والد کے خلاف تھے، سیاسی تحریک نے زور پکڑا۔ اگرچہ مسلم کانفرنس میرے والد کی طرفدار تھی لیکن ساتھ ہی پاکستان کے حق میں تھی۔ صورت حال اسقدر پیچیدہ تھی کہ میرے والد کے بجائے کوئی دوسرا شخص بھی ہوتا جسکو اس وقت کی حقیقتوں کی چاہے کتنی ہی واقفیت ہوتی، اس نے بھی صاف اور پرامن حل حاصل کرنا ناممکن پایا ہوتا۔ جیسے کہ میں کہہ چکا ہوں کہ اگر انہوں نے پاکستان کے ساتھ الحاق کیا ہوتا تو ریاست کے ہندو علاقوں کا، شمالی ہندوستان کے اس پار کی انتہائی فرقہ پرستی کے جنون میں سچ مچ صفایا ہوتا۔ اور اگر انہوں نے پہلے ہی ہندوستان کے ساتھ الحاق کیا ہوتا تو اس صورت میں انہوں نے اپنی رعایا کے بہت بڑے حصّہ کے انحراف کا خطرہ مول لیا ہوتا۔ جو ریاست کی آبادی کا ۷۰ فیصد تھے۔ گذشتہ زمانہ پر نظر ڈالنے پر صرف ایک ہی معقول حل نظر آتا ہے۔ وہ یہ کہ نئی دو مملکتوں کے درمیان پرامن طریقہ پر ریاست کو تقسیم کرنے کی ابتداء کی گئی ہوتی۔ لیکن اس کے لئے صاف سیاسی بصیرت اور برسوں کی محتاط تدبیر درکار تھی۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ حقیقت میں ریاست کی تقسیم ہوتی گئی لیکن

اس طرح سے جس نے ناگفتہ بہہ مصیبتوں اور خون خرابے کو جنم دیا جس تقسیم نے آجتک ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات کو زہر آلود بنا رکھا ہے۔

تیزی کے ساتھ قریب آتے ہوئے تقسیم کے سلسلہ میں میرے والد کا واحد مثبت ردّ عمل دونوں سلطنتوں کیساتھ حالات کو جوں کا توں برقرار رکھنے کا سمجھوتہ پر دستخط کرنے کی پیشکش تھی۔ پاکستان نے سمجھوتہ پر دستخط کئے لیکن اسکے بعد جلد ہی ضروری اشیاء کی بہم رسانی میں مداخلت کر کے ریاست پر دباؤ ڈالنا شروع ہوا اس زمانہ میں ریاست کی بیشتر آمد و رفت کا نظام پاکستان کے راستہ سے ہوتا تھا، یعنی کوہالہ سڑک کے راستہ سے۔ اور سیالکوٹ اور راولپنڈی کے ریلوے اسٹیشنوں سے۔ پس پاکستان نے سچ مچ اقتصادی ناکہ بندی شروع کر دی تاکہ میرے والد کو پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے پر مجبور کیا جائے۔ جبکہ ہندوستان نے سمجھوتہ پر دستخط کرنے سے پہلے مزید وضاحت طلب کی۔ مہر چند مہاجن، جنہوں نے اس دوران ریاست کے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالا تھا، کے ایک مراسلہ کے جواب میں ۲۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جواہر لعل نہرو نے لکھا۔

میرے پیارے مہاجن

مجھے آپ کا ۱۸ اکتوبر کا خط موصول ہوا۔ کشمیر

کو حالیہ دنوں میں جو مشکلات درپیش آئیں، میں ان سے واقف ہوں خاصکر پاکستان کے اس رویہ سے جو اس نے کشمیر کے ساتھ روا رکھا ہے۔ جب آپ پہلی بار یہاں آئے تھے تو ہم نے اس معاملہ پر بھی بحث کی تھی۔ میں نے تب آپکو یقین دلایا تھا کہ ہماری کشمیر اور اسکے عوام کے ساتھ بے حد دوستانہ ہمدردی ہے اور ہم خوشی سے مقدور کے مطابق کشمیر کو ضروری اشیاء، خاصکر جن کی اسے ضرورت ہے، مہیا کریں گے۔ ہم انسانیت اور ساتھ ہی ساتھ ہماری ریاست جموں و کشمیر کے عوام کے مستقبل میں گہری دلچسپی کے ناطے کرنا پسند کریں گے۔ ہماری اپنی بھلائی کا بھی یہی تقاضا ہے۔ ہماری یہ مستحکم رائے ہے کہ کشمیر کی ریاست اور اسکے عوام پر کوئی دباؤ نہیں ڈالنا چاہئے۔ اور انہیں اپنے طریقہ پر انتظام چلانے دیا جانا چاہئے۔ اور جو بھی فیصلے یہ معقول اور مناسب سمجھیں انہیں لینے دئے جائیں۔ اس پالیسی کی آبیاری کے سلسلہ میں ہم اپنی قوت کو کام میں لائیں گے۔

آپ اتفاق کریں گے کہ اس وقت ہندوستان اور کشمیر کے درمیان معقول آمد و رفت قائم کرنے میں بعض دشواریاں درپیش ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ ہماری مشترکہ کوششوں سے ان دشواریوں میں عنقریب قابو پالیا جائیگا کشمیر کو ضروری اشیاء بھیجنے کے سلسلہ میں ہم یہ جاننا

چاہیں گے کہ آپ کو صحیح معنی میں کیا کیا ضرورت ہے آپ کو معلوم ہے کہ اشیاء خوردنی کے بارے میں ہندوستان کی حالت بھی پیچیدہ ہے اور کمی کے باعث بہت سی اشیاء کے بارے میں تقسیم کاری عمل میں لائی جا رہی ہے۔ ہمارے لئے گنجائش نکالنا آسان نہیں ہے۔ تب بھی ہم کوئی بھی چیز جسکی آپکو خاص طور سے ضرورت ہو، بھیجنے کی بھرپور کوشش کریں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نمک اور مٹی کے تیل کی آپ کے لوگوں کو خاص طور سے ضرورت ہے۔ کیا آپ مہربانی کر کے مجھے یہ بتائیں گے کہ آپ کو فی الفور کس چیز کی ضرورت ہے۔

دوسری نوعیت کی امداد کے بارے میں ہماری ہمدردی آپ کے ساتھ ہے۔ لیکن آپ اتفاق کریں گے کہ اس کا انحصار حالات پر ہے۔ میں آپ کو یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ کشمیر سرکار کے حکمران اور ہماری گورنمنٹ کے درمیان قریبی رابطہ ہونا چاہئے تاکہ آپسی تعلقات کے معاملات کے بارے میں اتحاد کو یقینی بنایا جائے۔

آپ کا مخلص

جواہر لعل نہرو

صوبہ سرحد کے علاقوں پونچھ اور میرپور نیز سیالکوٹ سیکٹر سے سی۔ آئی۔ ڈی کی رپورٹیں آنا شروع ہوئیں جن سے سرحد کے اس طرف حملہ آور خانہ بدوشوں کے ہاتھوں خونریزی، لوٹ مار اور دیہاتی عورتوں کی عصمت دری کا پتہ چلا۔ مجھے وہ مہیب ماحول یاد ہے جس نے ہم کو بری طرح سے لپیٹ میں لینا شروع کر دیا تھا۔ یہ عیاں ہو رہا تھا کہ دھیرے دھیرے سرحدی علاقے ہمارے ہاتھوں سے نکلے جا رہے تھے۔ کبھی کبھار میرے والد ان میں سے بعض رپورٹیں میرے حوالے کرتے اور مجھے ان کی تفاصیل والدہ کو ڈوگری میں سنانے کو کہتے۔ اور مجھے ابھی بھی یاد ہے کہ عصمت دری کے لفظ سے سابقہ پڑتے وقت میری عجیب حالت ہوتی کیونکہ میں اسکے برابر کوئی قابل قبول لفظ پا نہیں سکتا تھا۔ اسی دوران بھائی جان اور افندی سمیت میرے والد کے سبھی مسلمان دوست چلے گئے۔ میرے معتمدِ خاص نے مجھ سے کہا کہ انہوں نے اپنے افراد خانہ ہمراہ راولپنڈی کیلئے روانہ ہونے سے پہلے میرے والد سے ملنے کی بے انتہا کوشش کی۔ لیکن انکو محل کے دروازے کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں دیگئی تھی۔ میں سوچتا ہوں کہ وہ ہم پر بہت عنقریب آنے والی آفت کو ٹالنے کی مدد کے سلسلہ میں آخری بار کوشش کر رہے تھے۔

نئے اور ایک غیر مانوس لوگوں کا طبقہ محل میں نمودار ہونا شروع ہوا۔ رام چند کاک ہی ایک ایسے شخص تھے جن کے پاس

ایک معقول فیصلہ کے سلسلہ میں کچھ یکسان کوشش کرنے کی شعوری صلاحیت تھی۔ انکو میرے والد نے ذلیل کر کے برطرف کیا تھا۔ انکی جگہ باقاعدہ طور کانگڑہ سے تعلق رکھنے والے ایک پرانے ڈوگرہ مسٹر جنرل جنک سنگھ کٹوچ نے لی تھی۔ جنہوں نے کئی دہائیوں سے میرے خاندان کی بڑی وفاداری سے خدمت کی تھی۔ لیکن یہ ظاہر تھا کہ وہ محض نام نہاد تھے۔ رام لال باترا پنجاب کے کسی پہاڑی کے کونے سے نائب وزیر اعظم بننے کیلئے نمودار ہوئے۔ بظاہر وہ شمالی بھارت کی کسی چھوٹی پہاڑی ریاست میں دیوان رہ چکے تھے اور انکی فہم صحیح صحیح طور پر انکے ماضی کو ظاہر کرتی تھی۔ تاہم ایک اور شخص اس سے پہلے ظاہر ہوئے تھے جنہیں آنے والے چند ماہ میں رونما ہونے والے واقعات میں زیادہ اہم رول ادا کرنا تھا۔ جن کا نام لالہ رام چند مہاجن تھا۔ وہ بھی کانگڑہ ہی کے تھے جو اس نازک موقع پر سردار پٹیل کی مہربانی سے وزیر اعظم بن گئے۔ حالانکہ بعد میں یہ ظاہر ہوا کہ خاص طور سے وہ پنڈت نہرو کو کوئی زیادہ پسند نہ تھے۔

ہمارے گھر میں سرگرمیوں کا مرکز وہ جگہ تھی جہاں میرے والد محل کے مشرقی حصہ کے نیچے کے برآمدے میں بیٹھتے تھے۔ ناشتہ کے بعد مجھے بھی وہاں کرسی پر گھسیٹتے ہوئے لیجایا جاتا تھا۔ میری والدہ نیچے آتیں۔ درباری اور صلاح کار جمع ہوتے اور ہم دن بھر وہاں بیٹھے رہتے۔ ریڈیو سنتے۔ بعض وقت لوڈو، چوسر یا رمی

کھیلتے۔ وکٹر روز نتھل یہاں موجود تھے۔ اور انہوں نے حتی الامکان میرے والد کو خوش رکھنے کی کوشش کی۔ کیونکہ وہ زیادہ علیحدہ پسند بن گئے تھے۔ اور انہوں نے شاید ہی کبھی محل چھوڑا ہو۔ سوامی سنت دیوا ابھی تک چشمہ شاہی کے مکان میں چھپے ہوئے تھے لیکن جوں جوں صورت حال بگڑتی گئی توں توں انکے محل میں آنے جانے اور میرے والد کی انکے پاس آمدورفت میں آہستہ آہستہ کمی آتی گئی۔ میرے خیال میں میرے والد نے محسوس کیا تھا کہ سوامی کی پُر اسرار قوتوں کو حقیقت سے زیادہ سمجھا گیا تھا اور ان کا مذہب سے پرانا منکرانہ رویہ بذات خود قائم ہونا شروع ہوا تھا لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

پیادہ فوج کے نو دستوں، رسالہ اور پہاڑی توپ خانے پر مشتمل جموں وکشمیر کی افواج کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں گلگت سے لیکر میرپور تک ریاست کی سینکڑوں میل کی سرحد کے ساتھ ساتھ پھیلایا گیا۔ ریاست اور ریاست سے باہر افواج کا ریکارڈ اس وقت سے قابل رشک رہا تھا جب سے انہیں ایک صدی پہلے مہاراجہ گلاب سنگھ نے ریاست کی بنیاد ڈالتے وقت قائم کیا تھا۔ ریاست کی ہندو اور مسلمان فوجوں نے جن میں کانگڑہ کے ڈوگرے اور نیپال کے گورکھے شامل تھے کئی دہائیوں سے مثالی جرأت اور رفاقت دکھائی تھی۔ لیکن اب ایک نئی صورت حال پیدا ہو گئی تھی جس کی شدت

کو میرے والد محسوس کرتے تھے نہ صلاح کار۔ برصغیر میں جو فرقہ پرستی کی وباء پھیل رہی تھی وہ ہماری ریاست کو چھوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ فوج میں جو مسلمانوں کا حصّہ تھا اُسے زیادہ تر میرپور اور پونچھ صوبوں کے علاقوں سے بھرتی کیا گیا تھا جہاں سے راجپوتوں اور مسلمانوں کے کئی جنگجو قبیلوں نے ہندوستانی فوج کو ہزاروں جوان مہیا کئے تھے۔ پاکستان کے قیام کے ساتھ ان سبھی فوجیوں نے اس ملک کو چُنا اور ان علاقوں کے لوگ نئی مملکت کے براہ راست متصل رہنے اور مغربی پاکستان کے ساتھ مذہبی اور گھریلو رشتہ داری کے بندھنوں کی وجہ سے اپنی روایتی وفاداری کے باوجود میرے والد کے خلاف ہو گئے۔ پس نہ صرف یہ کہ ریاستی افواج کو خطرناک طریقہ پر حد سے زیادہ پھیلایا گیا، بلکہ ایک تہائی فوج نے اپنی وفاداری دوسری طرف منتقل کر دی تھی۔ اور دل بدلی کیلئے موقع کے انتظار میں تھے۔ اس پر یہ کہ پاکستان کے متصل چند علاقوں میں بڑھتی ہوئی بے چینی تھی جسکا نتیجہ بغاوت نکل سکتی تھی۔ اور جناح کا ذہنی عزم کہ کشمیر نئی مملکت کے تاج میں سب سے خوبصورت ہیرا ہوگا جسے انہوں نے دراصل برصغیر کے اندر تنہا تراشا تھا۔ پوری صورت حال کو آگ لگانے کیلئے بس ایک جلتی مشعل کی ضرورت تھی۔ اور یہ کام جموں وکشمیر پر بدنام وحشی قبائلی حملے نے انجام دیا۔ بالآخر اس سال ۲۵۔ اکتوبر کو طوفان بپا ہوا۔ یہ دسہرہ

کا دن تھا اور کافی حیرت انگریز طور پر حسب معمول سالانہ دربار سرینگر میں منعقد کیا گیا۔ اس دوران سرحدوں پر شدید لڑائی چھڑ گئی تھی۔ میرے والد نے برگیڈیر راجندر سنگھ جموال کو اوڑی بھیجا جنہوں نے جنرل اسکارٹ سے جموں وکشمیر افواج کے سربراہ کا عہدہ سنبھالا تھا۔ اور ان سے کہا کہ آخری جوان اور آخری گولی تک لڑتے رہیں۔ اتفاق سے میں اس وقت وہاں موجود تھا جب میرے والد نے انہیں بلایا۔ اور کہا کہ صورت حال بہت سنگین ہے اور انہیں حملہ آوروں کے خاتمہ تک لڑنا ہوگا۔ راجندر سنگھ کم گو تھے اور مجھے یاد ہے کہ ہدایت پانے کے بعد انہوں نے میرے والدین کو سلامی دی، میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور تیزی کے ساتھ کمرہ سے چلے گئے۔ بعد میں کیا ہوا وہ فوجی تاریخ کا حصہ ہے۔ بہادری اور فرض شناسی کی ایک ایسی داستان ہے جو دنیا کی کسی بھی داستان کے ہم پلہ ہے۔

راجندر سنگھ ۲۲ اکتوبر کو اوڑی کی سرحد کیلئے روانہ ہوئے اور حیرت انگیز حد تک بہادرانہ طور پر خندق کی حکمت عملی کی بدولت تین قیمتی دن تک قبائلوں کی پیش قدمی کو بارہمولہ تک پہنچنے سے روکے رکھا۔ اس طرح انہوں نے قیمتی وقت بہم پہنچایا۔ جو دستاویز الحاق پر دستخط کرنے اور بھارتی فوج کو سرینگر بذریعہ ہوائی جہاز پہنچانے کیلئے درکار تھا۔ دشمن کی تعداد بہت تھی۔ مسلمان افسر اور فوجی جوان مخالف ہو رہے تھے۔ برگیڈیر نے شدید زخمی کی حالت میں کہا

کہ انہیں ایک ریوالور کیساتھ سڑک پر چھوڑ دیا جائے۔ جیسا کہ انہوں نے میرے والد سے وعدہ کیا تھا۔ کہ دشمن صرف انکی لاش کے اوپر ہی آگے بڑھ سکتے ہیں۔ آزاد ہندوستان میں وہ بہادری پانے والے پہلے شخص تھے۔ بعد مرگ انہیں نمایاں بہادرانہ کارکردگی اور قربانی کیلئے مہاویر چکر کا انعام دیا گیا۔ عین ایک صدی پہلے جنرل زور آور سنگھ نے مرکزی اشیا میں شاندار ڈوگرہ مہم کی بدولت فوجی تاریخ پیدا کی تھی اور برگیڈیر راجندر سنگھ نے ڈوگرہ حکمرانی کی صدی کو ایک دوسری بہادرانہ کارکردگی سے تکمیل کو پہنچایا اوڑی جانے والی سڑک پر ایک سادہ مگر رقت انگیز یادگار اب اس جگہ پر کھڑی ہے۔ جہاں انہوں نے آخری مورچہ سنبھالا اور بحیثیت اپنے حکمران کے کمانڈر اپنی گولیاں صرف کرنے کے بعد دشمن کی گولیوں کے شکار ہوئے۔ اسی دوران ایک اور اعلیٰ افسر شمالی صوبہ کے گورنر برگیڈیر گھنسارا سنگھ کو گلگت اسکاوٹوں نے قید کیا تھا جنہوں نے اپنے برطانوی کمانڈر میجر براون کے تحت اپنی وفادار فوج پاکستان کی طرف موڑی تھی۔

اس سب کے بارے میں ہمیں بہت دیر سے پتہ چلا۔ اس منحوس دن، مجھے محل کے اندر تنہا چھوڑا گیا جبکہ میرے والد اور اسٹاف ممبر دریائے جہلم پر واقع شہری محل کے خوبصورت محل کے اندر جسکی اندرونی چھت شاندار طریقہ پر پیپر ماشی سے

سجائی ہوئی تھی، دربار میں شرکت کر رہے تھے۔ اچانک روشنی گل ہوگئی۔ ڈومیل سرینگر کی بڑی سڑک پر موہرا کے مقام پر واقع اس وقت کے واحد پاور اسٹیشن پر حملہ آوروں نے قبضہ کرکے اسے تباہ کر دیا تھا اور اسی راستے سے وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ اور گپ اندھیرے میں' میں پہیوں والی کرسی پر اپنے کمرہ میں تنہا بیٹھا رہا۔ چند منٹ بعد اچانک گیدڑ کی خوفناک چیخ نے خاموشی کو توڑ دیا۔ پُراسرار طور پر بے ہنگم آواز بلند ہو کر بند ہوئی اور بعد میں پاگل سروں کی صورت میں پھر بلند ہوئی

موت اور تباہی تیزی سے سرینگر کی طرف بڑھ رہی تھیں ہماری خوشحال دنیا ہمارے گرد زمین بوس ہو چکی تھی۔ تقدیر کے پہیئے نے پورا چکر کاٹ لیا تھا۔ اچانک چونکا دینے والی سرگرمیاں پیدا ہوئیں۔ بعد کے واقعات کا انبار میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ اضطراب کی حالت میں تیل سے جلنے والے گیس لیمپ لئے نوکروں کا اِدھر اُدھر بھاگنا میرے والد کے اُڑے ہوئے رنگ اور بھیانک صورت بنائے دربار سے تیزی سے واپس لوٹنا۔ وی۔ پی۔ مینن کی سرینگر میں بذریعہ ہوائی جہاز ڈرامائی آمد' تاکہ میرے والد کو جموں چلے جانے کے لئے آمادہ کیا جائے۔ میرے والد کی نارضامندی اور بالآخر مینن کے اصرار پر مان جانا اور رات گئے ۲۷ تاریخ کو سرینگر

سے بھیانک کوچ۔

اس خطرناک گھڑی میں میری والدہ نے بے حد سکون اور حاضر دماغی دکھائی۔ نائب وزیراعظم کی بیوی مسز باترا پر بے ہوشی کے کئی دورے پڑے تھے لیکن میری والدہ نے تمام عورتوں اور اسٹاف کے بال بچوں کو اکٹھا کیا۔ اس کام میں میری آسٹریلوی نرس مسز سٹیوارت نے میری والدہ کا ہاتھ بٹایا۔ بالآخر کانوائی نے چلنا شروع کیا۔ میرے والد اپنی موٹر خود چلا رہے تھے۔ انکے نزدیک وکٹر روزینتھل بیٹھے ہوئے تھے اور پیچھے اسٹاف کے دو افسر بھرے ہوئے ریوالور لئے بیٹھے تھے۔ میری والدہ کئی موٹروں میں بھری ہوئی عورتوں کے ساتھ پیچھے آرہی تھیں۔ بھاری پلاسٹر کی وجہ سے میں کسی بھی طرح کار میں داخل ہونے کی حالت میں نہیں تھا۔ پس میری پہیہ والی کرسی اٹھا کر ایک اسٹیشن ویگن کے عقب میں رکھی گئی جسے میرے والد شکار کے مہموں میں استعمال کرتے تھے۔ جب صبح سویرے کانوائی محل کے دروازے سے باہر نکلی تو شدید سردی تھی۔ حملہ آور سرحد پار سے اس طرف داخل ہو رہے تھے۔ لوٹ مار کرتے اور عصمت دری کرتے ہوئے وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ اور یہ بھی افواہ تھی کہ جموں سرینگر راستے کو کاٹا جا چکا ہے اور ہمیں راستہ میں گھات لگا کر پکڑے جانے کا اندیشہ ہے۔ پلیس گارڈوں کے علاوہ کوئی محافظ ساتھ نہ

تھے۔ اور جب ہم نکلے تو ہمارے پاس سہارا دینے کے لئے خُدا پر اعتماد کے سوائے کچھ نہ تھا۔ راستہ بھر بہت پڑاؤ تھے اور اس پر سفر بے حد طویل۔ میں نیم خوابی کے عالم میں پڑا رہا۔ کچھ یہ اُمید کرتے ہوئے کہ اپنے کمرہ کے آرام اور تحفظ میں میری آنکھ کھلے گی اور پورا سلسلہ محض ایک تکلیف دہ خواب تھا۔ لیکن جب بھی میں رات میں جاگا تو زیادہ سردی اور زیادہ اندھیرا تھا اور اچانک میرا کولھا درد سے پھڑکنے لگا۔

اس پوری مہیب رات کو ہم آہستہ اور رُک رُک کر چلتے رہے۔ جیسے کہ اس خوبصورت وادی کو چھوڑنے پر تیار نہ تھے جس پر ہمارے اسلاف نے کئی نسلوں تک حکمرانی کی تھی۔ جب سورج کی پہلی کرن نمودار ہوئی تو قافلہ نو ہزار فٹ اونچے بانہال کے درہ سے گذرا۔ جموں سے ساٹھ میل دُور ایک چھوٹی بستی کُد میں جب ہم رُکے، ہم نے دیکھا کہ ایک دودھیا موٹر ہمارے وحشتناک قافلہ کے ساتھ مل چکی تھی۔ یہ سوامی سنت دیو تھے۔ جنکی پُراسرار قوت حملہ آوروں کے مقابلہ کرنے کی صلاحیت میں شامل نہ ہوئی۔ وکٹر نے مجھے بتایا کہ راستہ بھر موٹر چلاتے ہوئے میرے والد نے ایک بھی لفظ منہ سے نہیں نکالا۔ جب اگلی شام کو وہ بالآخر جموں پہنچ گئے اور پیلس کے پاس رُکے تو انکی زبان سے ایک ہی جملہ نکلا۔

"ہم کشمیر سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں"

بعد کے ہفتوں کی دھندلی یاد اب بھی میری یاداشت میں محفوظ ہے۔ چونکہ میرے کولھے میں کوئی بہتری کے آثار نظر نہیں آرہے تھے اسلئے میں بدستور ایکجگہ ساکت پڑا رہا اور جب ایک ماہ کے بعد دوسرا ماہ بھی گذر گیا تو مجھے خوفناک احساس ہونے لگا کہ شاید میں کبھی دوبارہ چلنے کے قابل نہ ہوں گا۔ اور ساری زندگی ناکارہ رہوں گا۔ باہر سے میں لگاتار خوش و خرم دکھائی دیتا جو دوسروں کو حیران کر دیتا لیکن گہرائی میں اندر ہی اندر گھلا دینے والا احساس بڑھ رہا تھا اور اکثر رات میں دیر تک میں مایوسی اور کرب کے احساس کے ساتھ جاگتا رہتا۔ اس دوران پاکستانی حملہ پورے زور پر تھا۔ قبائلی جن کی وردی پوش پاکستانی مدد اور اعانت کر رہے تھے وادی میں داخل ہو گئے تھے اور قریب قریب سرینگر پہنچے اور ہوائی اڈہ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اگر انہوں نے ہوائی اڈہ پر قبضہ کیا ہوتا تو وادی تباہ ہوئی ہوتی کیونکہ ہندوستانی فوج کے پاس سڑک سے پہنچنے کیلئے زیادہ وقت نہ تھا۔ خودکشی کے مترادف 'بہادرانہ موقف جو راجندر سنگھ اور انکے جوانوں نے اپنایا تھا' اس نے حملہ آوروں کو تین قیمتی دنوں تک روکے رکھا۔ اس بات نے تاریخی ہوائی سفر کو ممکن بنایا جسکی تیاری چل رہی تھی۔ ہندوستان

کی ہوائی اور بری فوجیں زبردست ہمت اور قربانی کی بدولت پہلے بہ مشکل سری نگر کو بچانے میں کامیاب ہوئیں اور اسکے بعد جوابی حملہ شروع کیا۔ اُوپر سے جنرل کلونت سنگھ کی قیادت کے تحت جموّں سیکڑ میں فوجوں کی قیادت برگیڈیر پرانجپائی کر رہے تھے اور یہ لوگ بسا اوقات محل میں ہی نوشی اور میرے والد کے ساتھ گفتگو کے لئے آتے تھے۔ پٹیالہ کے اس وقت کے حکمران مہاراجہ یداوندرا سنگھ بھی ریاست پٹیالہ کے فوجی دستہ کے ساتھ آئے وہ مردانہ حسن کا عمدہ نمونہ تھے۔ اور پگڑی پہنتے اور چھ فٹ چھ انچ لمبے تھے لیکن چہرے سے وہ شریف تھے اور شگفتہ لہجہ میں بولتے تھے۔ جو انکی خوفناک ظاہری صورت کو جھٹلاتی تھی۔ ایل۔ ایف۔ سی (لائن آف کمیونیکشن) ایچ۔ کیو (ہیڈ کوارٹرز) پی۔ او ایل (پیٹرو اوئیل اینڈ لیوبریکانٹس) سی۔ او (کمانڈنگ آفیسر) جیسے محاوروں کے استعمال کا بحث کے دوران اضافہ ہونا شروع ہوگیا تھا۔ جموں صوبہ میں حملہ آوروں نے تیز پیش قدمی کی تھی۔ میرپور، راجوری، بھمبار اور راجوری جیسے بیحد اہمیت کے سبھی سرحدی قصبے ہاتھ سے چلے گئے تھے اور پونچھ قصبہ کو محاصرہ میں لیا گیا تھا۔ حالانکہ بیرونی سکون کو برقرار رکھتے ہوئے میرے والد کو ناکامی کی ہر خبر پر جھرجھری آتی جیسے کہ انکے اندر کچھ ٹوٹ گیا ہو۔ صرف ایک موقع پر جب جڑے ہوئے دو گاؤں دیوا اور بھاسو، جن میں راجپوت

رہتے تھے، ہاتھ سے چلے گئے۔ تب میں نے ان کی آنکھوں میں کچھ کچھ آنسو دیکھے۔

میری والدہ پناہ گزینوں کے امدادی کام میں بہت سرگرم تھیں۔ پاکستان کے قبضہ میں آئے ہوئے علاقوں سے ہزاروں کی تعداد میں مرد، عورتیں اور بچے جموں میں داخل ہو رہے تھے۔ جنکو شہر اور شہر کے آس پاس بہت سارے پناہ گزین کیمپوں میں خوراک اور پناہ دی جا رہی تھی۔ یہ پناہ گزین بے شک خوش قسمت تھے۔ حملے ساتھ شامل خونریزی اور بربریت میں کئی ہزار افراد نیست و نابود ہو گئے۔ مشکل سے کوئی کنبہ ایسا تھا جس نے آدھے یا اس سے زیادہ افراد کنبہ سے اس خون خرابے میں ہاتھ نہ دھویا تھا اور بہت سارے واقعات ایسے تھے جہاں پورے کنبہ میں صرف ایک بچہ بھاگ نکلا تھا۔ مصیبت اور تکالیف کی داستانیں بیان سے باہر تھیں اور ایسے ہی موقع پر میری والدہ کی ہمت اور انتظام کرنے کی صلاحیت ظاہر ہوئی۔ اکثر وہ پورا دن ایک کے بعد دوسرے کیمپ میں جانے میں گذارتیں اور رات گئے تک راشن اور کپڑا تقسیم کرتیں اور مالی امداد کرتیں۔ پس ان بکھرے ہوئے کنبوں کو کچھ راحت بہم پہنچاتیں۔ بے شک انکو اور انکی جماعت کے کارکنوں کو رحم کے فرشتوں کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور کچھ لوگ موجود ہیں جو آجتک انکی

زبردست خدمت کو یاد کرتے ہیں جو اسوقت انہوں نے بے سہارا اور خوفزدہ پناہ گزین کے تئیں انجام دی۔ انہوں نے عورت کی ایک والنٹیر فوج مرتب دی جسے مہارانی سیوا دَل کے نام سے پکارتے تھے اور انکے لئے فوجی حکام سے نیم فوجی تربیت لینے کا انتظام کیا۔ چونکہ یہ دوسرا موقعہ تھا جب انہوں نے اپنے آپ کو امدادی کام میں جھونک دیا تھا۔ پہلی بار انہوں نے یہ کام دوسری جنگ عظیم کے دوران جنگی امدادی کمیٹی میں انجام دیا تھا۔ اور ایسا لگتا ہے کہ اس قسم کی صورت حال انکی اندر کی صلاحیت کو نکھارتی تھی۔

اسکے برعکس میرے والد شاذ و نادر ہی اُن دنوں پیلس سے باہر نکلے۔ حالانکہ ایک آدھ بار میری والدہ انہیں کسی پناہ گزین کیمپ یا کسی سیوا دل کی تقریب میں کھینچنے میں کامیاب ہوئیں۔

اس دور کی مڈ بھیڑوں میں سب سے زیادگاری مُڈ بھیڑ میری پنڈت جواہر لال نہرو سے پہلی ملاقات تھی۔ اپنے جموں کے پہلے دورہ کے دوران وہ پیلس میں مختصر وقت کیلئے آئے تھے لیکن مصروف تھے اور میں نے والد سے ان سے ملاقات کا موقع نہ ملنے کے بارے میں شکایت کی۔ دوسری مرتبہ وہ آئے تو میرے والد انہیں میرے کمرہ میں لے آئے۔ یہ ایک عظیم لمحہ تھا کیونکہ میں ایک ایسے شخص سے مل رہا تھا جو میرے لئے ایک طرح قابل پرستش تھا۔ جونہی وہ کمرے میں داخل

ہوئے تو مجھے دو چیزوں نے متأثر کیا۔ مستعدی سے ان کا چلنا اور انکی ناقابل فراموش مسکراہٹ، جو مغموم تھی پھر بھی شدید طور پر انسانی تھی۔ ان الفاظ کے ساتھ میرے والد نے میرا تعارف کرایا " ٹائیگر آپ کے بڑے ہی مدّاح ہیں" انہوں نے میری خیریت دریافت کی اور عمدہ فطرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے پچھلے دورہ کے موقع پر مجھے نہ دیکھنے کے لئے معافی مانگی۔ میں بہت زیادہ جذباتی تھا اور کچھ کہنے سے قاصر۔ میں نے ہوشیاری اور سادگی کے ساتھ انکی سوانح حیات پر ان کا آٹوگراف مانگا۔ وہ کمرہ میں صرف تین منٹ تک رہے۔ لیکن وہ لمحات میرے ساتھ محفوظ ہیں۔

سردار ولبھ بھائی پٹیل نے بھی دو تین موقعوں پر جموں کا دورہ کیا۔ انکے ہمراہ سکرٹری آف اسٹیٹ وی۔ پی۔ مینن تھے اور دراصل انہوں نے ہی محسوس کیا کہ جس رفتار سے میں جا رہا تھا اسے دیکھکر میری صحت یابی کی بہت کم امید تھی۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ مجھے امریکہ علاج کیلئے بھیجا جائے۔ اس تجویز کی شروع میں میری والدہ نے زبردست مخالفت کی۔ سردار پٹیل خاص طور سے دوسروں کا خیال رکھنے والے آدمی تھے اور میرے والدین کے ساتھ انکے دوستانہ تعلقات تھے اور بالآخر وہ اور والد صاحب میری والدہ کو راضی کرنے میں کامیاب ہوئے۔

میں نے اس خیال کو خوش آمدید کہا۔ نہ صرف اسلئے کہ اس میں میری
صحت یابی کی اُمید تھی اسلئے بھی کیونکہ میں تناؤ اور تصادم کے پورے
ماحول سے، جو انتہائی افسردہ لگ رہا تھا، دور بھاگنے کی جستجو
کر رہا تھا۔

سردار پٹیل نے میرے علاج کے اخراجات کا خرچہ پورا
کرنے کے لئے مخصوص غیر ملکی زرِمبادلہ کا انتظام کرایا اور یہ طے
پایا کہ اسٹیٹ فورس کے ایک اعلیٰ گورکھا افسر برگیڈیر این۔ایس
راوت اور میرے والد کے ایک صلاح کار کیپٹن رنجیت سنگھ میرے
ہمراہ جائیں گے۔ امریکہ میں جن لوگوں کے ساتھ شناسائی تھی
ان میں وکٹر روز نتھل چونکہ میرے والد کے واحد دوست تھے اسلئے
انکو معلومات اور نیو یارک میں کسی معقول اسپتال میں میرے داخلہ
کے بارے میں کاروائی کی شروع کرنے کو کہا گیا۔ وہ چند ہفتوں
کے اندر ہی ایسا کرنے میں کامیاب ہوئے اور آخر کار جموں سے
میری رخصت کا وقت دسمبر کا آخری ہفتہ مقرر کیا گیا۔ روانگی
سے پہلے میں نے اپنی والدہ سے کہا کہ میرے کپڑے پناہ گزین بچوں
میں تقسیم کئے جائیں۔ میں بستر پر پڑے پڑے اُن ملبوسات سے
کافی بڑا ہو چکا تھا اور انہیں یونہی جمع رکھنے کی کوئی خاص ضرورت
نہ تھی۔ میں نے مبارک گھڑی کے پیش نظر پیلس شام کے وقت
چھوڑا۔ اور رات ستواری کنٹونمنٹ میں گذاری۔ روانگی کے

وقت والدہ نے مجھے آنسو بھری آنکھوں سے رخصت کیا۔ میرے
والد بھی متاثر ہوئے تاہم انہوں نے سنجیدہ صورت بنائی۔ اگرچہ
ہم میں سے کسی نے ایسا نہ کہا لیکن ہمارے تحت الشعور میں ایک
بِن کہا خوف تھا کہ شاید ہم ایکدوسرے کو دوبارہ کبھی نہیں دیکھیں
گے۔ کرایہ پر لئے گئے ڈی۔سی۔۳ ہوائی جہاز سے بمبئی پہنچنے میں پورا
دن لگا یا اور دو دن بعد ۲۹۔ دسمبر کو ہم تین راوت، رنجیت اور میں
چار انجن والے ٹی۔ ڈبلیو۔ اے اسکائی ماسٹر ہوائی جہاز بمبئی کے
ہوائی اڈہ سے رخصت ہوئے۔ مجھے جہاز تک ایمبولنس گاڑی
میں لیجایا گیا۔ وہاں سے مجھے جہاز کے اندر پہنچایا گیا۔ اور دو
نشستوں کے اوپر کئی تکیوں کے درمیان جو ایک طرح کا پلنگ
تھا، رکھ دیا گیا۔ مجھے وہ عجیب احساس جو مجھے سیڑھی کے اوپر
سے اٹھا کر جہاز کے اندر لے جاتے وقت ہو رہا تھا، یاد ہے۔
مجھے وطن چھوڑنے کا دکھ تھا جسکے ساتھ ایک انجانے سفر
جو میرے آگے پھیلا ہوا تھا، پر جانے پر ایک پُرجوش احساس
بھی تھا۔ جلد ہی عملہ جہاز کے اندر داخل ہوا اور کیپٹن نے آکر
میری خیریت پوچھی۔ جہاز نے شام کے قریب پانچ بجے اڑان
بھری۔ ہمارا پہلا پڑاؤ کہیں خلیج کے علاقہ میں تھا اور ہمارا دوسرا
پڑاؤ مصر تھا۔ وہاں سے ہم نے روم کی جانب پرواز کی۔ یہاں
ہمارا جہاز تاریک آندھی میں اترا۔ مسافر باہر اندر آتے جاتے

رہتے لیکن میں حرکت کرنے سے قاصر تھا اور میں ان کارروائیوں کو کھڑکی سے دیکھتا تھا۔ تب ہم پیرس کی طرف روانہ ہوئے جہاں ہم شام کے بعد پہنچے۔ پیرس ہوائی جہاز سے ایک درخشاں قالین لگ رہا تھا پیرس سے ہم آئرلینڈ کے شہر شانون کی جانب چلدئے اور وہاں سے بحر اوقیانوس پار کرنا شروع کیا جو ان دنوں ڈھکیلنے والے ہوائی جہاز میں لامتناہی لگتا تھا۔ دو زمینی سروں کے درمیان نزدیک ترین راستہ نیو فاونڈلینڈ کے گانڈر شہر کے ساتھ شانون سے تھا۔ اس راستے سے بھی ہم کو دن کا بیشتر وقت لگ گیا۔ ہم گانڈر قریب غروب آفتاب کے وقت پہنچ گئے اور وہاں سے ہم نے نیویارک کیلئے سفر شروع کیا۔ نیویارک میں پچھلے ساٹھ برسوں میں ان ہی دنوں شدید ترین برف باری ہوئی تھی اور جب ہم ۳۱۔ دسمبر کی رات دیر سے یہاں اترے تو شہر میں دو فٹ سے زیادہ برف تھی۔ جب ہمارے جہاز کا دروازہ کھلا تو اندر چبھنے والی سرد ہوائیں داخل ہوئیں۔ وکٹر روزنتھل کی نمائندہ مسز ٹولی ہوائی اڈہ پر حاضر تھیں اور طویل کارروائیوں کے اختتام پر ایک ایمبولنس گاڑی جہاز کے قریب آئی۔ ایک اسٹریچر جہاز کے اندر لایا گیا جسکے اوپر رکھ کر مجھے نیچے گاڑی تک لیجایا گیا۔ ایک اخباری فوٹو گرافر میری آمد کی تصدیق کرنے کے لئے وہاں موجود تھا۔ رنجیت میرے ساتھ بیٹھے مسز ٹولی سامنے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھیں اور

ہم شہر تک طویل سفر پر روانہ ہوئے۔ چیختی ہوئی سائرن اور برفباری روشنی کو چند منٹ تک محدود کر رہی تھی۔

پس ۱۹۴۷ء جب ختم ہو رہا تھا تو میں نے اپنے آپ کو گھرسے آدھی دنیا دور ایک انوکھے ملک میں پایا۔ چونکہ میں نے سردیاں کشمیر میں کبھی نہیں گذاری تھیں اسلئے پہلی بار برفباری دیکھ رہا تھا جبکہ ایمبولینس اپنی منزل کی طرف بھاگ رہی تھی۔ میرا ذہن زندگی کے ان تجربات کی طرف چلا گیا' جو میرے بچپن' اسکول کی زندگی اور پچھلے دو برسوں کے واقعات سے متعلق تھے کیا میں کبھی دوبارہ ہندوستان یا اپنے والدین کو دیکھوں گا؟ اس ریاست کا کیا بنے گا جس کا میں ولی عہد تھا؟ کیا میں کبھی چلنے کے قابل ہو سکوں گا یا یہ کہ میں باقی ماندہ زندگی کیلئے بے بس ہو کے رہ جاؤں گا؟ ایک ہی چیز تھی جو مجھے حوصلہ دے رہی تھی یعنی دیوی کی پوجا کا وہ منتر جو میری والدہ نے مجھے کئی برس پہلے سکھایا تھا اور جسکے بارے میں انہوں نے مجھے سنجیدگی سے تاکید کی تھی کہ اسے ضرورت اور مایوسی کے وقت ہرگز نہیں بھولنا چاہئے انہوں نے مجھے آٹھ بازو والی شیر سوار دیوی درگا کی ایک چھوٹی تصویر بھی دی تھی جو آسمانی مادی طاقت پر سواری کرنے کی طاقتور نمائندگی کی نشانی تھیں۔ تمام سفر کے دوران میں نے اسے مضبوطی سے پکڑے رکھا اور ان مایوس کن گھڑیوں میں

اسی نے مجھے آرام بہم پہنچایا۔

اب ہم نیویارک میں داخل ہو رہے تھے اور میں نے اس عظیم شہر کی پہلی جھلکیاں دیکھیں جو شہر میری توقعات سے زیادہ دیر تک میرا مسکن بننے والا تھا۔ اسکی اونچی عمارتیں جو برفانی طوفان میں سر اوپر اٹھائے ہوئی تھیں، جنکی چھتیں چکر کھاتی ہوئی برف میں کھوئی ہوئی تھیں۔ قریب دو گھنٹہ کے سفر کے بعد ایمبولینس آخر کار ۴۲ ویں بازار میں نمبر ۳۲۱ پر رکا جہاں مخصوص سرجری کا اسپتال واقع تھا۔ کافی رات بیت چکی تھی۔ پہلے تو یہ ادارہ سنسان لگا لیکن جلد ہی کوئی آیا اور ایمبولینس سے باہر لاکر مجھے اسپتال کے برآمدے میں رکھا گیا اور کرسی سمیت لفٹ کے اندر لیجایا گیا تب پانچویں منزل پر لفٹ رکی اور راہداری سے کرسی ڈھکیلتے ہوئے مجھے کمرہ نمبر ۵۰۹ میں پہنچایا گیا۔ جس وقت مجھے بستر میں منتقل کیا جا رہا تھا اور ایمبولینس کے ملازم رخصت ہو رہے تھے۔ اس وقت رات کے بارہ بجے تھے۔ سب لوگوں کو نئے سال کی پارٹیوں میں شمولیت کرنا تھی اور ظاہر ہے کہ سب لوگ جانے کی عجلت میں تھے۔ میرے کمرہ کے برابر میں رنجیت کمرہ نمبر ۳۰۸ میں تھے اور تھوڑی دیر کے لئے وہ بھی اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ آخر کار میں نے اپنے آپ کو اکیلا پایا۔ میرے ساتھ دیوی درگا کی تصویر تھی اور میرے والدین کا فوٹو جو میرے پلنگ کے

اونچی میز پر رکھا ہوا تھا۔ دور سے بجتی گھڑیاں کی آدھی رات کے گھنٹہ بجانے کی آواز سنی۔ نیا سال شروع ہوا تھا اور میرے لئے ایک نئی زندگی کا آغاز۔

باب ۶

امریکہ ایک حیرت انگیز ملک ہے۔ یہانتک کہ ایک کم عمر ہندوستانی کی نظر میں جو اسے کمرہ سے دیکھ رہا تھا' پورا ماحول ہی مختلف تھا۔ تازگی اور بے تکلفی کا ایک سماں تھا۔ شروع میں نرسیں' ڈاکٹر اور وارڈ کے خدمتگار میری طرف خاص طور سے تجسس سے دیکھ رہے تھے جیسے کہ میری آمد کی ایک تصویر روزنامہ ہیرلڈ میں شائع کی گئی تھی۔ بظاہر ہندوستانی شہزادوں کے بارے میں طرح طرح کی عجیب کہانیاں پھیلائی گئی تھیں۔ اسلئے جب انہوں نے سنا کہ میں اسپتال میں داخل ہو چکا تھا تو غالباً انہیں کوئی عجیب بات دیکھنے کی توقع تھی۔ وہ سب دوستوں کا سا برتاؤ کر رہے تھے اور خوشگوار طور پر یہ دیکھکر حیران تھے کہ میں انگریزی بول سکتا تھا۔ دراصل

میں ان میں سے بیشتر لوگوں سے بہتر طور پر اسے بول سکتا تھا اور میرے کانوں کو عجیب و غریب امریکی لہجہ سے مانوس ہونے میں کچھ ہفتے لگ گئے اور جس چیز نے مجھے خاص طور سے متوجہ کیا وہ یہاں کا انوکھا رواج تھا جیسے کہ بسکٹوں کی جگہ کریکرس پیسٹری کی جگہ کوکیز استعمال ہوتا تھا۔

میری آمد کے دوسرے دن ڈاکٹر فلپ' ڈی' وِلسن مجھے دیکھنے آئے۔ ڈاکٹر وِلسن اس وقت امریکہ کے ممتاز ترین آرتھو پیڈک تھے اور بعض واقعی بڑے ڈاکٹروں کی طرح ان کی موجودگی ہی مریض کے اندر خود اعتمادی کا احساس پیدا کر دیتی تھی۔ انہوں نے مجھ سے کئی سوالات پوچھے اور تب میری ٹانگ سے پلاسٹر ہٹانے اور معمول کے ایکسرے اور خون اور دوسرے ٹیسٹ کرانے کی ہدایات دیں تاکہ وہ علاج کی نوعیت کا فیصلہ کر سکیں۔ پلاسٹر کی جگہ میرے پاؤں پر آٹھ پونڈ کھچاؤ رکھا گیا تاکہ جوڑ کو اصلی حالت پر رکھا جائے۔ مہینوں کے پلاسٹر کے بعد میرا گھٹنا اور ٹخنہ خاصے سخت ہو چکے تھے اور میں کولھے کے جوڑ کو ہرگز نہیں ہلا سکتا تھا جوڑوں کو ڈھیلا کرنے کے بارے میں مدد کی خاطر مجھے روزانہ اسپتال میں گرم پانی کے تالاب میں لیجایا جاتا تھا۔ جو دبلے پتلوں کے علاج میں منفرد مقام رکھتا تھا۔ چھ ماہ کے بعد پہلی بار پانی میں داخل ہونا ایک خوشگوار تجربہ تھا اور میں نے دیکھا

کہ میں آسانی سے اِدھر اُدھر گھوم سکتا تھا۔ دھیرے دھیرے میں نے اپنی ٹانگوں پر وزن ڈالنا شروع کیا اور کچھ دن بعد مجھے اپنے کمرہ میں بیساکھیوں کے سہارے کھڑے ہونے کی اجازت دیگئی جو چھ ماہ تک لمبے پڑے رہنے کے بعد ایک غیر معمولی احساس تھا۔

یہاں پہنچنے کے فوراً بعد ہم نے ایک ریڈیو خریدا۔ مجھے مسرت ہوئی کہ اس میں بہت سارے اسٹیشن لگتے تھے اور یہ کہ پروگرام صبح کے چھ بجے سے لیکر آدھی رات تک یعنی اٹھارہ گھنٹے کیلئے جاری رہتے تھے۔ سنگیت، ڈراموں، بات چیت، خبروں اور کھیل کود سے متعلق تبصروں کا حیران کن سلسلہ تھا جن میں، میں نے جلد ہی اپنی پسند کی چیزوں کو چن لیا، خاص کر پوپ سنگیت کو۔ دراصل سنگیت نے میری زندگی کے آزمائشی دور میں ایک بار پھر ایک اہم رول ادا کیا، حالانکہ یہ ہندوستانی کلاسیکی سنگیت سے کوسوں دور تھا۔ میں نے دیکھا کہ کسی بھی صورت میں ہو اسمیں ذہن کو تسلی دینے کی اور اسے مایوسی یا ابتری میں گرنے سے محفوظ رکھنے کی لاثانی صلاحیت ہے۔ بعد میں ایک ٹیلی ویژن بھی حاصل کیا گیا جس نے اسپتال کے اندر میری زندگی میں ایک نئی دلچسپی کا اضافہ کیا۔ اسکے علاوہ دلچسپی کی اور چیزیں تھیں۔ ایک یہ کہ ان مریضوں کے لئے جو

لیجانے کی حالت میں تھے، ہر ہفتہ تیسری منزل پر فلم دکھائی جاتی تھی اور دوسرا چھٹی منزل پر۔ دھوپ گھر تھا، جو ایک بڑا کمرہ تھا جس میں شیشے کے تخت لگے ہوئے تھے جسکے اندر مرتبانوں میں بہت سے پیڑ اور درخت محفوظ طریقہ پر لگائے گئے تھے۔ یہ نادر سی بات تھی کہ اوپر جاکر برف کی کہر آلودہ ٹھنڈی ہوا کا سامنا کئے بغیر سورج کی گرمی کا مزہ لیا جائے۔

میری آمد کے فوراً بعد ہی امریکیوں کی غیر معمولی مہربانی ظاہر ہوئی۔ اسپتال کا پورا عملہ ضرورت سے زیادہ مہربان تھا بلکہ کئی لوگ مجھے دیکھنے کیلئے آتے تھے جن میں بعض پُرانے ہندوستانی شناسا اور روز نخقل کے دوست شامل تھے۔ ان میں ادھیڑ عمر کا ایک جوڑا نوریس اور ڈورتھی ہارکینس اور ایک پُرانے ہندوستانی میجر جان پندھرسول اور انکی اہلیہ ارلین شامل تھے۔ پیچھے نظر دوڑاتے پر مجھے حیرانی ہوتی ہے کہ ان سبنے میری دلجوئی کیلئے کتنا کچھ کیا۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن آتے۔ مٹھائیاں اور پیسٹریاں لاتے اور گھنٹوں میرے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتے یا چوسر کھیلتے۔ ایسا لگتا تھا کہ عورتوں میں خاص طور سے میرے لئے ماں کا سا پیار پیدا ہو رہا تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ آیا یہ حقیقت کہ مجھے ماں کی بہت زیادہ یاد آتی تھی کسطرح ان پر عیاں ہوئی تھی۔

اسی دوران اقوام متحدہ کے اندر کشمیر کا مسئلہ امریکہ کے

اخبارات کے اوّل صفحات پر شائع ہوتا تھا۔ ہمیں قطعی غصہ آرہا تھا کہ پاکستان کے قابل اعلیٰ نمائندے ظفر اللہ خان ہندوستانی وفد پر چھائے ہوئے تھے جسکی قیادت جموں و کشمیر کے وزیراعظم گوپال سوامی آئنگر کررہے تھے۔ گوپال سوامی آئنگر بعد میں ۳۰ جنوری کو مہاتما گاندھی کی اندوہناک خبر کے فوراً بعد مجھے دیکھنے اسپتال آئے۔ وہ ایک تھکے اور دل شکست آدمی تھے۔ ہندوستانی وفد میں شامل جو دوسرے رکن مجھے دیکھنے آئے تھے وہ شیخ محمد عبداللہ تھے۔ میں نے بچپن میں انکے بارے میں ڈھیر ساری باتیں سنی تھیں اسلئے انکی آمد سے کافی خوشی ہوئی اور وہ بے شک متاثر کن شخصیت کے مالک تھے۔ چھ فٹ ۴ انچ لمبے اور صحت مند شخص۔ یہ عجیب تھا کہ ایک ایسا شخص جسکے ساتھ مجھے قریبی سیاسی تعلقات قائم کرنے تھے پہلی بار ہماری ریاست سے لطف دنیا دور ملا۔

ان سب ملاقاتوں اور توجہ ہٹانے والی باتوں کے باوجود میں حقیقت میں اب بھی ناکارہ تھا۔ اپنے طور چلنے سے قاصر۔ ابھی بھی مکمل طور پر اسپنج سے نہلانے اور بیڈ پان پر انحصار کرتا تھا۔ میرے ایکسریز کا معائنہ کرنے اور دو اور ممتاز ڈاکٹروں کو صلاح مشورہ کیلئے بلانے کے بعد ڈاکٹر ولسن نے جنوری کے اخیر میں فیصلہ کیا کہ جبکہ فوری طور پر آپریشن کی ضرورت نہ تھی وہ لوگ سلیقہ سے کولھے کے جوڑ پر دوبارہ پلاسٹک چڑھائیں گے۔ پس بیہوشی

ہونے کے پورے سلسلہ کی پہلی کڑی سے سابقہ پڑنے کا آغاز ہوا۔ انکے لئے جنہیں اس قسم کی رضاکارانہ بے حسی سے سابقہ نہیں پڑا ہے انکو اس میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئیگی لیکن جسکو اس سے واسطہ پڑا ہو وہ تصدیق کریگا کہ بیہوشی کی پٹی سے گذرنا کوئی خوشگوار بات نہیں ہے۔ تاہم میری پریشانی بذات خود بیہوشی نہیں تھی بلکہ یہ بھیانک خیال کہ کہیں میں بیچ آپریشن کے جاگ نہ جاؤں۔ ہر بار میں بے ہوش کرنے والے سے کہتا کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ آپریشن ختم ہونے تک میں بے ہوش رہوں۔

بے ہوشی کے متعلق خاص طور سے دو طرح کا ڈر تھا۔ وہ یہ کہ کہیں میں ذہنی پھرتی یا قوت مردانگی کھو نہ بیٹھوں۔ ہر بار جب میں آپریشن کے بعد صحت یاب ہوتا تو میں بہت ہی عجیب ڈھنگ سے یہ پتہ لگاتا کہ آیا میں ذہنی طور ہوشیار ہوں۔ میں بہترین آبادی کی تشریح یاد کرنے کی کوشش کرتا جسے میں نے انٹرمیڈیٹ میں اقتصادیات کے امتحان کیلئے پڑھا تھا۔ اس خصوصی ذہنی فارمولے کو چننے کیلئے میرے واسطے کوئی خاص وجہ نہ تھی لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ ایک چوتھائی صدی بعد مجھے قومی آبادی کی پالیسی بنانے میں شامل ہونا تھا۔ میرے دوسرے ڈر کو کچھ دن مزید انتظار کرنا پڑتا جب تک آپریشن کا درد کم ہوتا تھا۔ پلاسٹر چڑھانے اور اتھاکر پھر لگانے اور علاج کا سلسلہ

کئی مہینوں تک چلتا رہا، یہاں تک کہ نیویارک کی جمنے والی سردی دھیرے دھیرے گرم اور ناخوشگوار موسم گرما میں تبدیل ہوئی۔ ریڈیو سے میں نے کئی مشہور دھنوں کو سیکھ لیا تھا لیکن اسکے علاوہ میں نے شطرنج سیکھنے کا فیصلہ کیا۔ اور تعلیمی دنیا کے ساتھ کچھ رابطہ قائم کرنے کا بھی فیصلہ کیا۔ شطرنج کیلئے یہ انتظام ہوا کہ بورس سٹف نامی آدمی ہفتہ میں دو تین بار آیا کرے گا۔ وہ بہت اچھے آدمی تھے اور مجھے اس دلفریب کھیل کے نئے انداز سے متعارف کرایا۔ دوسرے تین دنوں مسٹر بی۔ براون (مجھے یقین ہے یہ فرضی نام تھا کیونکہ وہ مرکزی یورپین شریف لہجہ میں بولتے تھے) کولمبیا یونیورسٹی سے اقتصادیات اور سیاست پڑھانے آتے تھے۔ ان کا جھکاؤ اشتراکیت کی طرف تھا، اور امریکی سرمایہ دارانہ نظام کے سخت مخالف تھے۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے میرے سامنے یہ نظریہ رکھا کہ امریکہ کے ہتھیار بنانے والے کارخانہ دار جنوبی امریکہ میں جنگوں کو ہوا دینے میں بہت زیادہ اُلجھے ہوئے ہیں تاکہ یہ جنگیں مستقل اور کافی منافع بخش بازاروں کو برقرار رکھ سکیں۔

جب ہفتوں گذر گئے، میں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ امریکہ میں میری جلد صحت یابی کی اُمیدیں آہستہ آہستہ کم ہوتی جارہی ہیں۔ اسی دوران جموں وکشمیر میں تیزی سے حالات بدل رہے تھے۔ قبائلی حملہ نے درحقیقت ایک مکمل جنگ کی صورت اختیار کرلی

تھی جس میں ریاست اور ہندوستان کی فوجیں قبائلیوں اور پاکستان کی باضابطہ فوج کی ٹکڑیوں سے مقابلہ میں صف آرا تھیں۔ والد کے خطوط سے مجھے فوجی مہم کا پتہ چلا جس سے میں نے اندازہ کیا کہ ہندوستانی جوابی حملہ آہستہ آہستہ حملہ آوروں کو واپس دھکیلنے میں کامیاب ہورہا تھا ایک کے بعد ایک قصبے کو واپس لیا جارہا تھا لیکن یہ کاروائی ہماری توقع سے کہیں زیادہ سست تھی۔ سیاسی طور پر تبدیلیاں رونما ہورہی تھیں۔ مہرچند مہاجن ریاست چھوڑ چکے تھے اور میرے والد نے ایک حکمنامہ کے ذریعہ شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں ایک ہنگامی انتظامیہ قائم کیا تھا۔ یہ عیاں تھا کہ ایسا جواہر لعل نہرو کی ایما پر کیا گیا تھا۔ بے شک دستاویز الحاق پر دستخط کرنے کے بعد اور ہندوستانی فوج کی آمد کے بعد حقیقت میں مؤثر حکمرانی میرے والد کے ہاتھوں سے چھوٹ چکی تھی۔ حالانکہ بہت دنوں تک اسے کوئی قانونی شکل نہیں دی گئی تھی۔

اسی دوران آئین ہند کو بھی مرتب کیا جارہا تھا۔ میرے والد نے اپنے ایک خط میں پیش گوئی کے انداز میں لکھا تھا "مجھے کوئی خیال نہیں ہے کہ کسطرح ہندوستان کا نیا آئین ہمیں متاثر کریگا بجز اس حقیقت کے کہ حکمرانوں کا نام ونشان مٹ جائیگا" اسپتال کے اندر ضخیم خبروں کو دیکھتا تھا! دھر اُدھر پھیلی اور اطمینان بخش نہ ہوتی تھیں۔ امریکہ کے اخباروں کی ضخامت ہمیشہ مجھے حیران

کر دیتی تھی خاصکر نیویارک ٹائمز کا سنڈے ایڈیشن جو کئی ضمیموں کے ساتھ بعض وقت دوسو صفحات تک جاتا تھا۔ میں پڑھنے کا آرزومند تھا اور بہت سی معلومات اور نئے خیالات کو سمیٹتا تھا۔

حالانکہ پلاسٹر کی وجہ سے میں ساکت تھا لیکن میں نے اپنے جسم اور ذہن دونوں کو تقریباً نمایاں طور پر بڑھتے ہوئے پایا۔ جسم خاص طور سے اسلئے کیونکہ میں نے بہت سا مزیدار خالص دودھ پیا۔

میری ۱۷ ویں سالگرہ کے موقع پر ہم نے اسپتال میں ایک پارٹی دی۔ میرے فوٹو جسے دو نرسوں اور چین کے ایک مریض ساتھی تائی لونگ یانگ نے پکڑ رکھا تھا کو ڈاکٹر ولسن کی طرف جنم دن کا کیک دیا گیا۔ جسے دوسرے روز نیویارک ٹائمز کے پہلے صفحہ پر چھاپا گیا تھا۔ فوٹو کے ساتھ چھپی رپورٹ اس پراسرار جملے پر ختم ہوتی تھی "سر ہری سنگھ نے تھوڑے دن پہلے اپنی سابقہ جابرانہ حکومت کو حریت پسند بنا دیا ہے اور انکے بیٹے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ جمہوریت پسند ہیں۔ تاہم نوجوان نے کسی سیاست پر بحث کرنے سے انکار کیا"۔ تقریباً اسی دوران میں نے پہلی بار ریڈیو پر ایک شو جسکا عنوان جونیئر رپورٹر تھا میں حصہ لیا۔ اس شو میں کم عمر نوجوانوں نے دور حاضر کے عنوان پر بحث کی۔ مداخلت کرتے ہوئے میں نے کہا" مجھے اُمید ہے کہ ہندوستان دنیا کے

عظیم ملکوں میں اپنا صحیح مقام حاصل کریگا اور مستقبل کی دنیا کی ذمہ داری اسکے نوجوانوں کے اُوپر عائد ہوتی ہے اور یہ کہ ہمیں بہترین سوجھ بوجھ اور بھائی چارے کیلئے کوشاں ہونا چاہئے"۔

ماضی پر نظر ڈالتے ہوئے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ امریکہ میں قیام کا یہ عرصہ جو بالکل نئے ماحول پر مبنی تھا اس نے میرے ذہن کو ریاست کی جاگیردارانہ آرائشوں سے دور بھاگنے کا اور ایک مختلف اور نہایت آزاد ماحول کو جذب کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اتفاق سے ۱۹۴۸ء چناؤ کا سال تھا اور میں نے باریکی کے ساتھ ٹی۔ وی اور اخباروں میں امریکہ کے نرالے طریقہ کار کا مشاہدہ کیا جس میں ڈیموکریٹک رواج کے مطابق ہیوبرٹ ہیمپھری، ہیرالڈ سٹیننس اور دوسرے لوگوں کی صدر ٹرومین سے نامزدگی چھیننے کی ناکام کوشش بھی شامل تھی اور میں نے ریپبلکن پارٹی کے اجلاس کا مشاہدہ کیا جہاں تھامس ڈیوی کا خوشی خوشی انتخاب کیا گیا۔ ان رسومات کے دوران ہشاش بشاش لیڈر لوگوں کا مجمع اور تماشا۔ یہ باتیں مجھے حیرت زدہ کرتی تھیں لیکن مسٹر براؤن بتاتے رہے کہ اس شور اور ان سرگرمیوں کے پیچھے شاطر پیشہ ور لوگ ہیں جو کئی نظریات کی نمائندگی کرتے ہیں جو یہ دیکھیں گے کہ کوئی بھی جماعت سرمایہ دارانہ نظام اور قید و بند سے آزاد مہم سے زیادہ دور نہ ہونے پائے۔ اس دوران جو خطوط میں نے اپنے والد کو لکھے وہ کشمیر تنازعہ کے بارے میں سلامتی کونسل کی کاروائی سے

پُر تھے اور ان میں ریاست میں فوجی مہم کی کامیابی سے متعلق سوالات تھے۔ جواب میں وہ مجھے اہم صورت حال کی جانکاری کراتے خاص طور پر کسی اہم قصبہ کو واپس حاصل کرنے کا ذکر کرتے تھے۔ حیران کن بات یہ تھی کہ ابھی بھی انکی دلچسپی بمبئی کی گھوڑ دوڑ میں تھی۔ جیساکہ ان خطوط میں اکثر ٹرائیننگ دینے اور دوڑ میں مایوس کن کارکردگی کا ذکر ہوتا تھا۔ میں والدہ کو بھی متواتر ہندی میں خطوط لکھتا تھا اور وہ اپنے نارنجی اور گلابی رنگ کے کاغذ پر جواب دیتیں جسے تقریباً پڑھنا مشکل ہوتا تھا۔ انہوں نے باضابطہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور یہاں تک کہ عوامی تقریروں میں وہ متاثر کن تھیں لیکن ان کی لکھائی کوئی خاص نہ تھی۔

پلاسٹر کے اندر طویل عرصہ تک میرا کولہا ساکت رہنے کے باوجود جبکہ قریب ایک سال پہلے سرینگر میں ڈاکٹر مراجکار نے علاج کیا تھا جوڑ ڈاکٹر وِلسن کی نظر میں اطمینان بخش طور پر کام نہیں کر رہا تھا۔ ۶ جولائی کو ڈاکٹر وِلسن میرے کمرہ میں آئے اور کہا کہ انہوں نے اگلی صبح میرا آپریشن کرنیکا فیصلہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ کئی دن پہلے لیا گیا تھا اور میرے والد سے اجازت حاصل کی گئی تھی لیکن اس بات کو مجھ سے چھپایا گیا تھا تاکہ میں پریشان نہ ہو جاؤں اور مجھے ڈر نہ لگے۔ چھپانے کی سازش خوب کام آئی کیونکہ اس بڑے واقعہ سے پہلے میرے پاس پریشان ہونے کے

چند ہی گھنٹے تھے۔ دوسرے روز جو آپریشن ہوا وہ ہمارے خیال سے کہیں زیادہ شدید تھا۔ جسمیں بارہ انچ لمبا نصف دائرہ کا شگاف اور ہڈی کے پیوند اور ایک انچ دھات پن کے ذریعہ کولھے کے جوڑ کا مستقل بے حس بنانا شامل تھا۔ میں آپریشن میز پر کئی گھنٹے رہا اور دوپہر بعد مجھے ہوش آیا۔ اگلے پانچ روز میری یاداشت کے مطابق بدترین دن تھے۔ کولھے کے بڑے پٹھے کی علیحدگی کی وجہ سے جو کپکپی پیدا ہو رہی تھی اس سے میرا جسم کانپتا تھا۔ درد جان لیوا تھا اور ہر بار کپکپی کے ساتھ پورا بستر ہل جاتا تھا۔ مجھے روزانہ سولہ انجکشن لینے پڑتے تھے۔ آٹھ پنسلین کے اور آٹھ درد کم کرنے کے۔ اسکے علاوہ مجھے پانچ ۲۵۰ سی سی خون کی بوتلیں رگ کے ذریعہ چڑھائی گئیں۔ اگر انسان کے شعور کے باہر واقعی جنت اور جہنم کا وجود ہے تو میرا خیال ہے کہ آپریشن کے بعد دونوں میں مجھے جہنم سے بالکل قریبی واسطہ پڑا۔ رنجیت تقریباً دن رات میرے کمرے میں رہتے تھے اور تین نرسوں کے ساتھ جو روز باری باری آٹھ گھنٹے کیلئے آتی تھیں، انہوں نے ہر ممکن طور میری تکلیف کو کم کرنے کی کوشش کی۔ بے ہوش کرنیکے عمل نے کھانے کے بعد ایک خاص ناخوشگوار ذائقہ کا اثر میرے اُوپر ڈالا اور میری بھوک بالکل مٹ گئی۔ میں مشکل سے کھانے کو آمادہ ہوتا تھا۔ ایک ہفتہ تک سیال آمیز غذا پر گذارہ کیا۔ کچھ دن بعد یوں ہی

باتوں باتوں میں ایک نرس نے میرے کولہے میں پن کی خبر سنائی۔ میرا دل ڈوب گیا۔ تب میں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ میں دوبارہ عام آدمی کی طرح کبھی چلنے کے قابل نہیں ہوسکوں گا۔ اس موقع پر مجھے واقعی یقین تھا کہ میں چلنے کے قابل ہرگز نہیں ہوسکوں گا۔ میرے ایمان اور ایسی قوت کا شدید امتحان تھا جسے اکٹھا کرنے میں کامیاب ہوچکا تھا اور یہ عظیم قوت ارادی کا نتیجہ تھا کہ میں نے مکمل طور پر ٹوٹنے کا مقابلہ کیا۔

بظاہر ڈاکٹر وِلسن آپریشن پر خوش تھے اور مجھے یقین دلایا کہ میں چند مہینوں میں ٹھیک ہوجاؤنگا۔ یہ حقیقت کہ آجتک میں ٹینس کھیل سکتا ہوں اور چُناؤ کے سلسلہ میں طویل دورے بغیر کسی تکلیف کے کرسکتا ہوں اُس عظیم سرجن کی پیشہ ورانہ . . . صلاحیتوں کا خراج عقیدت ہے جو آرتھوپیڈک سرجری کی تاریخ میں ایک ممتاز نام ہے۔ وہ میرے بستر کے پاس بیٹھتے مجھے پدرانہ انداز میں کہتے کہ کس طرح انہوں نے نئے قائم کردہ ہڈیوں کے بنک سے مجھے ہڈی کا پیوند لگایا تھا۔ انہوں نے پن کی تصویر بھی دیدی جو میرے کولہے میں لگایا گیا تھا جو میرے ساتھ ایک طرح سے میری زندگی کے ایک نازک دور کی ہولناک یاد کے طور پر موجود ہے۔ میں نوجوان تھا۔ بظاہر اپنے احساس سے زیادہ مضبوط والد کے نام آپریشن کے بعد میرا پہلا خط آپریشن کے ٹھیک ایک

ہفتہ بعد ۱۴، جولائی کو لکھا گیا اور ۱۹، جولائی کو میں نے انکو سات صفحات کا خط تحریر کیا۔ اب تک میرا زخم ٹھیک ہونا شروع ہوچکا تھا اور ۲۵ ٹانکے ہٹائے گئے تھے۔ آہستہ بہت آہستہ درد کم ہوتا گیا اور میری بھوک واپس لوٹ آئی۔ جوانی کی حرکت نے اپنے وجود کا احساس دلانا شروع کیا اور میں سوچتا ہوں کہ یہ حقیقت کہ میں نے نفسیاتی اُداسی میں داخل ہونے سے انکار کیا، اس بات نے بہت زیادہ فرق پیدا کیا۔ نیویارک یا اسپتال میں ہم جس کسی کو جانتے تھے وہ بیحد مہربان اور محبت کرنے والا تھا۔ وہاں اپنے کئی ماہ قیام کے دوران میں نے اپنے احساس سے زیادہ دوست بنائے اور میرا کمرہ پھولوں اور مصری سے بھرا رہتا تھا۔ چونکہ جہاں تک ممکن ہوسکا میں نے پوری قوت سے اپنے درد اور مایوسی کو چھپایا اس لئے میں بہادر اور باہمت مشہور ہوگیا۔ یہاں تک میرے والد نے اگلے خط میں لکھا، "تم نے صبر کے ساتھ انتہائی تکلیف کا بہادری سے سامنا کیا۔ مجھے واقعی تم پر فخر ہے۔" بے شک یہ انکی جانب سے بڑی سراہنا تھی۔

دو مہینے تک میرے اوپر بھاری پلاسٹر لگا رہا اور تب ستمبر میں ڈاکٹر وِلسن کی گرما کی چھٹیوں سے واپسی پر انہوں نے پلاسٹر کو ہٹوا دیا اور اسکی جگہ چھوٹا ہلکا پلاسٹر لگوا دیا۔ اب تک زخم پوری طرح سے بھر گیا تھا اور مجھے اچھی طرح سے وہ دن یاد ہے جب پہلی

بار مہینوں بستر میں رہنے کے بعد مجھکو کھڑے رہنے کی اجازت دیگئی۔ یہ پُرجوش واقعہ اسقدر عجیب تھا کہ مجھے چکّر محسوس ہوا اور تقریباً میں گر گیا۔ ہر روز مجھے دیر تک کھڑا رکھا جاتا تھا اور اسپتال کے کمرہ میں پہلا آزمائشی قدم اٹھانا دراصل پھر سے چلنا سیکھنا تھا۔ ۲۴، ستمبر کو میں پہلی بار نو ماہ میں اسپتال چھوڑنے اور کھلی موٹر میں مختصر سیر کرنے کے لائق تھا۔ مجھے پہیہ والی کرسی میں نیچے لیجایا گیا اور موٹر میں بٹھا دیا گیا۔ نیو یارک شہر میں اس پہلی موٹر کی سیر کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ فلک پوش عمارتوں کی تعداد بہت تھی اور میرے دماغ میں اچانک ایک نئی وسعت اور وقت میں لئے جانے کا ایک خاص احساس تھا۔ اسپتال کے طویل دلگیر عرصہ بعد یہ خیال کہ میں دوبارہ اِدھر اُدھر گھوم سکتا ہوں بہت سہانا تھا۔

ان مہینوں کے دوران میری شطرنج اور پولیٹکل سائنس کی تعلیم جاری رہی۔ میں نے بمبئی کے ساتھ خط وکتابت کے ذریعہ حافظے کا کورس بھی (لیکن جسے میں نے مکمل نہیں کیا) شروع کیا۔ اور تیز رفتاری سے لکھنے کا کورس جسمیں شارٹ ہینڈ کو استعمال لائے بغیر مختصر کر دینے کا طریقہ بھی شامل تھا۔ میں نے ٹیلیویژن مستعدی سے دیکھا۔ غور سے ٹرومین اور ڈیوی کے درمیان صدارتی انتخابات کا مشاہدہ کیا جو آڑے ترچھے طریقہ پر ملک میں گھوم کر نہ ختم ہونے

والی تقریریں کر رہے تھے۔ حالانکہ ہر ایک یہی سوچتا نظر آرہا تھا کہ ڈیوی جو قدرے چوڑا چکلا تھا' کا جیتنا یقینی تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ٹرومین میں زیادہ قوّت اور مقابلہ کی سکت تھی۔ میں نے کافی مطالعہ کیا۔ جذبہ سیاست پر کتابیں پڑھیں اور اسکے ساتھ ناول بھی پڑھے۔

گھر سے بدستور پریشان کن خبریں آرہی تھیں۔ میرے والد خطوط میں بہت محتاط تھے۔ انہوں نے ہمیں خبردار کیا تھا کہ خطوط کی راستہ میں جانچ کیجاتی ہے لیکن یہ عیاں تھا کہ جواہر لعل نہرو نے انہیں مؤثر اختیارات شیخ محمّد عبداللہ' جو ہنگامی انتظامیہ کے سربراہ تھے اور جو بعد میں وزیر اعظم بنے' کے حوالے کرنے پر مجبور کر دیا تھا' انکے آپسی تعلقات کشیدہ اور حریفانہ تھے۔ مثال کے طور پر ۱۸، ستمبر کے خط میں انہوں نے لکھا۔

" موجودہ سرکار ریاستی فورس کو اپنی تحویل میں لینے کیلئے بہت بیتاب ہے۔ میں نے اس کاروائی کی شدید مخالفت کی جیسے کہ فوج ایک محفوظ (ریزرو) موضوع تھا۔ یہ معاملہ اسٹیٹ منسٹری کے سپرد کیا گیا تھا اور مجھے سردار پٹیل نے بات چیت کیلئے بلایا تھا۔ شیخ محمّد عبداللہ کی خواہشات کے برخلاف' ایک طویل بحث کے بعد یہ طے پایا کہ ریاستی فورس کا کنٹرول فی الحال انڈین آرمی کو سونپا جائے۔ میں کمانڈر انچیف برقرار رہوں گا۔"

آہستہ آہستہ میرے چلنے پھرنے میں اضافہ ہوتا گیا۔ میں نے

بیساکھیوں کے سہارے چلنا شروع کیا اور میں رنجیت کے ہمراہ اسپتال سے باہر اگلے کونے کے ڈرگ اسٹور تک آئس کریم کھانے کے واسطے چلتا۔ میں ۴۲ ہ بازار پر واقع ڈیلی نیوز کی عمارت کی نچلی منزل تک جانے کے قابل بھی تھا جہاں گھومنے والا ایک بڑا گلوب کمرہ میں رکھا ہوا تھا' جو وقت بتانے والے اور فوری خبروں کے نقشوں سے پُر تھا۔ یہ ایک دلکش جگہ تھی اور میں یہاں پابندی سے آتا اور ایک ہی وقت میں دو سے تین گھنٹے گذارتا۔ میں نے اپنے لئے کئی سوٹ' ٹائیاں اور ایک ہیٹ خریدا تھا اور اپنے والدین کو چند فوٹو بھیجنے میں کامیاب ہوا جو یہ دیکھکر کہ میں کتنا بڑا ہوگیا تھا خوش ہو رہے تھے۔

اسی دوران امریکہ کا صدارتی انتخاب انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ ڈیوی کے برخلاف ٹرومین کو حیران کن کامیابی حاصل ہوئی اور میں نے ایک ڈاکٹر سے دس ڈالر کی شرط جیتی جنہوں نے مجھے دس ڈالر ٹرومین کے چناؤ جیتنے پر دئے تھے۔

حالانکہ میں دھیرے دھیرے صحت یاب ہو رہا تھا' مجھے فوری یا مکمل صحت یابی کے بارے میں کوئی وہم نہ تھا۔ ایک خط میں' میں نے اپنے والد کو لکھا "میری دائیں ٹانگ کے پٹھوں کا ڈھیلا اور مضبوط ہونا ایک لمبی کاروائی ہوگی لیکن ایک بار مجھے مستقل طور پر پلاسٹر سے نجات مل جائے۔ یہ محض وقت کی بات ہوگی۔ بیشک جیسے کہ آپ جانتے ہیں کہ میرا دایاں کولھا ہمیشہ سخت رہیگا لیکن چلنے

اور بیٹھنے کے طریقہ کار کے سلسلہ میں کچھ مشق اور سمجھوتہ کے بعد میں نہیں سمجھتا ہوں کہ یہ مجھے زندگی میں کوئی زیادہ تکلیف دے گا۔ تاہم اسکا عادی بننے میں کچھ وقت لگے گا۔" بالآخر پہلی نومبر کو پلاسٹر ہمیشہ کیلئے ہٹایا گیا اور میں دوبارہ تالاب میں جانے کے قابل ہوا۔ پھر سے گرم پانی میں داخل ہونا سہانا تھا۔ خوفناک پلاسٹر سے میں آزاد تھا۔ چاندی رنگ کے بالوں والی قابل ماہر مس ہیلن کلارک نے' جس نے میرے اسپتال میں قدم رکھنے کے وقت سے میرا علاج کیا تھا' میری پانی کے اندر مالش کی' جسکے نتیجہ میں میرے دائیں کولھے اور دائیں ٹانگ نے آہستہ آہستہ کچھ طاقت دوبارہ حاصل کرنا شروع کی۔ ڈاکٹر ولسن میری صحت یابی پر اسقدر خوش تھے کہ انہوں نے کہا کہ میں چند دن بعد اسپتال چھوڑ کر کسی ہوٹل میں قیام کر سکتا ہوں تاکہ جسمانی مالش اور انکے مشاہدہ کیلئے اسپتال آسکوں۔ پس بالآخر ٹھیک ساڑھے دس ماہ بعد جب مجھے اسپتال میں خصوصی سرجری کیلئے داخل کیا گیا تھا' میں مشرق میں ۴۹ بازار میں واقع بارکلے ہوٹل میں منتقل ہوگیا۔

اپنی ایک نظم میں براؤن کہتے ہیں کہ یہاں تک کہ ایک قیدی جو دیر تک واحد کوٹھری میں رہتا ہے اسکو بھی جیل کے ساتھ وابستگی ہو جاتی ہے۔ بے شک میرے اندر اسپتال' نرسوں' وارڈ کے ملازمین' ڈاکٹروں اور اپنے ساتھی مریضوں کے لئے محبت پیدا

ہوگئی تھی ۔ حالانکہ جسمانی طور پر مجھے وہاں بہت تکلیف اٹھانا پڑی لیکن شفقت اور التفات کے ماحول نے سہارا دینے میں میری مدد کی دراصل مجھے اسپتال چھوڑنے پر ایک جھٹکا سا لگا اور مجھے پورے اسپتال نے شاہانہ طور پر رخصت کیا ۔ بیس سال بعد ١٩٦٧ء میں، میں نے بحیثیت بھارت کے وزیر سیاحت وجہاز رانی کے نیویارک کا دوبارہ دورہ کیا تب تک ۴٢ اسٹریٹ پر واقع پرانے اسپتال کو منہدم کیا گیا تھا اور اس ادارہ کو آگے قبضہ میں کہیں زیادہ جدید اور صاف ستھری عمارت میں منتقل کیا گیا تھا ۔ ڈاکٹر ولسن جو اسی برس کی عمر میں ابھی بھی چاق و چوبند اور لال لال تھے، نے مجھے فخر کے ساتھ اسپتال سے منسلک نئی عمارتوں اور اراضی میں گھمایا ۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح مجھے پرانے اسپتال کی یاد آرہی تھی ۔

بارکلے کشادہ اور آرام دہ ہوٹل تھا ۔ اتنا عیش پسند نہ تھا جتنا کہ قریب میں واقع (والڈورف) اسٹوریا تھا لیکن میرے والد کے قدرے محدود ڈالر کیلئے جو انہیں میرے علاج کیلئے بھیجنے کی اجازت تھی بہت موزون تھا ۔ میں نے خاص طور سے اتنے ماہ بعد دوبارہ گرم پانی سے نہانے کی عیاشی کا لطف اٹھایا ۔ آج تک میں خاموشی کے ساتھ شکرانے کی عبادت کرتا ہوں جب کبھی میں پانی کے گرم ٹب میں ڈبکی لگاتا ہوں اور اپنے آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ کسطرح ہم یونہی زندگی کی آسائشوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے

جب تک نہ ہم ان سے محروم نہیں ہوتے ۔ جب میں اسپتال میں منتقل ہوا اس وقت تک میں بیساکھیوں کی مدد سے چلتا تھا لیکن جلدی میں نے دو چھڑیوں کی مدد سے اِدھر اُدھر گھومنا شروع کیا ۔ ہفتہ میں تین روز میں زیرآب مالش کیلئے اسپتال جاتا اور باقی تین دن مس کلارک ہوٹل میں آکر ایک گھنٹہ مالش کرتیں ۔ اب میں ٹیکسی میں بیٹھنے کے قابل ہوگیا تھا اور پس راوت اور رنجیت کے ہمراہ نیویارک کے مناظر، آوازوں اور خوراک میں شامل ہونا شروع کیا ۔

نیویارک واقعی ایک حیرت انگیز شہر ہے جہاں رات دن کے مقابلہ میں روشن تر ہوتی ہے ۔ ٹائمز اسکائر اور براڈوے جن میں برقی لہریں آگے کی طرف پھوٹتی ہوئی مستقل طور پر زبردست روشنی کی صورت میں نمودار ہوتی ہیں ۔ سینما کے بھاری اشتہارات مجھے گرویدہ بناتے تھے ۔ فاون آف آرک ابھی ابھی ریلیز ہوچکی تھی جس میں اسگریٹر برگ مین نمایاں رول ادا کررہے تھے ۔ ہم نے اسکے علاوہ کئی اور فلمیں جن میں دی تھری مسکیٹرس (اداکار جینی کیلی، لانا ٹرنر، جون ایلائی سن اور انجیلا لانس مری) انچانٹمنٹ (اداکار ڈیوڈ نون) اور دی پیل فیس (اداکار باب ہوپ اور جین روسل) شامل تھیں، دیکھیں ۔ ہم نے براڈوے میں چند ڈرامے بھی دیکھے جیسے مسٹر رابرٹ (اداکار ہنری فونڈا) نوایل کوورڈس پرائیویٹ لائف (اداکار تالالوہ بینگ ہیڈ ہروی) جس میں ایک غیر مرئی

بڑا سفید خرگوش نمایاں کردار کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ اور ایک مزاحیہ ڈرامہ وھائرازجارٹ (اداکار ہے بولجر) فلموں اور ڈراموں کے علاوہ ہم ایمپائر اسٹیٹ عمارت کی چھت پر گئے۔ راک فیلر کے متاثر کن مرکز کو دیکھا۔ ساکس اور باکیز سے چیزیں خریدیں۔ ریڈیو سٹی میوزک ہال میں مشہور روکیٹس کی داد دی۔ میڈیسن اسکائر گارڈن آئس کھیل دیکھا۔ احتیاط کے ساتھ سنٹرل پارک کی بیرونی حدود کی کھوج لگائی۔ ہم نے ہندوستانی ریسٹورنٹس سمیت کئی کھانے کی جگہوں کا پتہ لگایا۔ ایک کا نام باربری روم تھا جو ۵۲ اسٹریٹ پر مشرق میں واقع تھا۔ اسکی اندرونی چھت ستاروں سے سجی ہوئی تھی اور نیویارک میں سب سے زیادہ آرام دہ کرسیاں اس میں لگی ہوئی تھیں۔ میرے لئے شہر میں ہونا ہی ایک فرحت بخش تجربہ تھا خصوصاً اٹھارہ ماہ تک پڑے رہنے کے بعد اور اسپتال سے باہر نیویارک میں وہ ہفتے میری زندگی کے خوشگوار ترین دن تھے۔ ہم نے بفیلو کیلئے رات کی ٹرین سے سفر کیا جہاں ہم کینیڈا کی سرحد پر نیاگرا آبشار دیکھنے گئے۔

جب ۱۹۴۸ء اختتام کو پہنچا اور پچھلے برس کے نئے سال کے برعکس جب مجھے نیویارک کے سنسان بازار میں ایک ایمبولینس میں گھمایا گیا تھا اس سال ہم نے اسکوٹائمز اسکائر میں پانچ لاکھ نیویارک کے باشندوں کے ساتھ منایا۔ اگرچہ انتہائی

سردی تھی لیکن ہم بہت خوش و خرم تھے اور جب گھڑیال نے رات کے بارہ بجنے کا پتہ دیا تو ہر ایک جیسا دیوانہ ہو گیا۔ جلد ہی ہم نے اپنے آپ کو نزدیک ہی ایک ہندوستانی ریسٹورنٹ میں پایا جہاں ہم کو ریسٹورنٹ کے مالک نے بھاپ اٹھتی ہوئی گرم زعفرانی چائے کی پیالیاں پیش کیں۔ ہماری فارن سروس سے تعلق رکھنے والے گربچن سنگھ جو وہاں ملازم تھے' کے سمیت میں نے کئی دوستوں سے سنا تھا کہ واشنگٹن ایک خوبصورت شہر ہے۔ پس میں نے اپنے والد سے وہاں جا کر ایک ہفتہ گذارنے کی اجازت مانگی۔ انہوں نے اجازت دیدی اور ہم وہاں ٹھیک ۲۰ جنوری ۱۹۴۹ء کو صدر ٹرومین کی افتتاحی پریڈ کے موقع پر پہنچے جسکے لئے ہم گربچن سنگھ کی توسط سے ٹکٹ حاصل کئے تھے۔ ہمارا سفیر شری راما راؤ (جنکے بھائی سربی۔ این۔ راؤ میرے والد کے وزیر اعظم رہ چکے تھے) قصبہ سے باہر تھے لیکن انکی مہربان بیوی لیڈی دھنونتری راما راؤ اور انکی بیٹی مسز پریمیلا واگلے نے ہماری دیکھ بال کی۔ واشنگٹن بے شک ایک خوبصورت شہر ہے خاصکر اسکی عوامی یادگاریں قابل دید ہیں۔ تالابوں اور پھولوں کی جھاڑیوں کے درمیان جیفرسن کی سیدھی سادھی یادگار کے بالکل برعکس یونانی انداز سے تعمیر کیگئی لنکن یادگار ہے جس میں عظیم امریکی صدر کا گہری سوچ میں ڈوبا ہوا مجسمہ نصب ہے۔ ہم موئنٹ ورنن جارج واشنگٹن کا آبائی گاؤں دیکھنے بھی گئے۔ نیویارک کی نرم نہ پڑنے والی شان و شوکت اور

واشنگٹن کی اعلیٰ عظمت جو ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں تاہم دونوں نے میرے اُوپر گہرا اثر ڈالا۔

اب چونکہ میں صحت یاب ہو رہا تھا' میرے والدین کی یہ خواہش تھی کہ میں گھر لوٹ آؤں۔ والد کے نام اپنے خطوط میں' میں نے انکی توجہ دو اہم سوالوں جن سے مجھے واپسی پر سابقہ پڑنا تھا' مبذول کرائی۔ پہلا سوال شادی کا تھا۔ جو میں غلطی سے (جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا) سمجھتا تھا شانتی سے ہوگی جسکے ساتھ میں نے اسپتال سے خط و کتابت شروع کی تھی۔ میں نے والد کو لکھا کہ میری جلدی شادی کرنے کی جہاں میں آپکی خواہش کی قدر کرتا ہوں' وہاں مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے کہ مجھے شانتی کو زیادہ دیکھنے کا موقع نہیں ملیگا اور شادی سے پہلے میں انہیں تھوڑا بہت پرکھنا چاہتا ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اگر دو انسان ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں تو انکی کامیاب شادی کی زیادہ امید ہے ان لوگوں کے برعکس جو اجنبی ہوں۔ دوسرا مسئلہ میری مستقبل کی پڑھائی کا تھا اور اس معاملہ میں' میں نے والد کو کافی زوردار الفاظ میں لکھا۔

"میں آپ پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میں بی۔ اے اور اس سے آگے تعلیم جاری رکھنے کا آرزومند ہوں۔ مزید یہ کہ میں دیانتداری سے اس بات کا قائل ہوں اور مجھے یقین ہے آپ بھی یہی چاہتے ہیں۔ آجکل کے تیزی سے بدلتے ہوئے زمانہ میں

معقول تعلیم (میرے لئے اقتصادیات' قانون وغیرہ کی تعلیم) لازمی ہے' ایک اونچے طبقہ میں جنم لینا ہی کافی نہیں ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ بلا لحاظ اسکے کہ ایک شخص نے حادثتاً ایک اعلیٰ طبقہ میں جنم لیا ہے' آج کل کے زمانہ میں آدمی کو اپنا مقام حاصل کرنے کیلئے باصلاحیت اور تعلیمی لحاظ سے اچھی طرح لیس ہونا چاہئے

جس طریقہ پر میری ٹانگ میں سدھار ہو رہا تھا اس پر ڈاکٹر ولسن خوش تھے اور آخر کار یہ فیصلہ کیا گیا کہ میں فروری کے پہلے ہفتہ میں کچھ دن لندن اور پیرس میں رُکتے ہوئے گھر کے لئے روانہ ہو سکتا ہوں۔ نیویارک میں آخر میں ہم نے ایک یہ کام کیا کہ ہیڈل پارک میں واقع روزولٹ ہاؤس کو صدر کے ایک بیٹے ایلیٹ روزولٹ اور انکی ایکٹرس بیوی فائی کے ہمراہ دیکھنے گئے۔ اتفاق سے ہم وہاں مرحوم صدر جنکی میں ہمیشہ سراہنا کرتا تھا' کی سالگرہ کی تقریب کے موقع پر موجود تھے۔ ہم نے ارلنگٹن قبرستان میں ایک مختصر دعائیہ مجلس میں حصہ لیا جہاں انہیں دفنایا گیا ہے۔ ہمارا استقبال انکی بیوہ مسز الینر روزولٹ نے کیا اور انہوں نے ہمیں آس پاس کی جگہ دکھائی۔ وہ بہت باہمت اور بڑی شخصیت کی مالک تھیں۔ ۲۰ فروری کے نیویارک ٹائمز میں اپنے کالم میں انہوں نے ہمارے دورہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا۔ "نوجوان شہزادہ جو ہمارے ملک میں آپریشن کے سلسلہ میں

ہیں' چند دن کے اندر کالج میں اپنے آخری دو سال مکمل کرنے کے لئے گھر لوٹ رہے ہیں۔ انکی خواہش بعد میں اقوام متحدہ میں کام کر کے عالم امن کو تقویت پہنچانا ہے"

ہندوستان کو واپسی کا سفر ایک سال قبل کے نیویارک کے مہیب سفر کے بالکل برعکس تھا۔ بحرِ اوقیانوس کے پار ہم نے امریکہ کی پان اڑان لے لی کیونکہ ائر انڈیا نے ابھی تک اس راستہ پر جہاز چلانے شروع نہیں کئے تھے۔ ہمارا پہلا پڑاؤ لندن تھا جہاں ہم نے میرے والد کے پسندیدہ ہوٹل 'دی ساوائی' میں قیام کیا۔ انہوں نے مجھے احتیاط سے بنائی گئی کپڑوں کی ایک فہرست' ان دوکانوں کے ساتھ جن کی وہ بحیثیت نوجوان سرپرستی کرتے تھے بھجوائی۔ کیپٹن اور مسز رفولڈ گاؤں سے مجھ سے ملنے آئے۔ اس ملک میں ہم نے ایک ہی سفر کیا۔ وہ چارٹر ہاؤس میں واقع پبلک اسکول کا تھا جہاں ہم شانتی کے چھوٹے بھائی رنبیر سنگھ سے ملنے گئے۔ ساوائی تھیٹر نے ابھی ابھی اگلا تھا کر سٹی کی ریکارڈ توڑ فلم ماوز ٹریپ دکھانی شروع کی تھی جس کو ہم نے دلچسپی سے دیکھا۔

قریب ایک ہفتہ لندن میں قیام کرنے کے بعد ہم پیرس کے لئے روانہ ہوئے جہاں وکٹر روز نتھل نے ایک

پر تکلف استقبال کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ انکے بھائی کے دو پوتوں جین اور ہوبرٹ نے جو تقریباً میرے ہی ہمعمر تھے' مجھے شہر میں گھمایا لیکن میں بہت شرمیلا تھا اور اپنی چھڑی کا مجھے خود احساس تھا اسلئے صحیح معنوں میں لطف اندوز نہ ہو سکا۔ گیلریز لا فائٹی بہت ہی سجا سجایا ڈیپارٹمنٹل اسٹور تھا۔ میں نے ایسا اسٹور پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہم نے دو مشہور رات کے کلب لائڈو اولن روج دیکھے اور ایک ریسٹورنٹ میں ایڈیتھ پیاف کو گاتے ہوئے سنا۔ کیناس میں میری جائے پیدائش کو دیکھنے کی کچھ بات چلی لیکن میرے والد کی شدید خواہش تھی کہ مجھے گھر لوٹتے ہوئے راستہ میں زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرنا چاہئے۔ اسلئے ہم نے اس خیال کو ترک کر دیا۔

بالآخر فروری کے تیسرے ہفتہ میں ہم اپنے سفر کے آخری حصہ پر روانہ ہوئے اور بمبئی کے لئے پرواز کی۔ میں ملے جلے احساسات کے ساتھ لوٹا۔ ایک سال پہلے میں گھر سے بحیثیت ایک مایوس اور معذور کے طور پر روانہ ہوا تھا اور اب میں اپنے بل بوتے پر اِدھر اُدھر چلنے کے لائق تھا لیکن ڈاکٹر ولسن کی یقین دہانی کے باوجود کہ دھیرے دھیرے میں ٹینس کھیلنے کے قابل ہو جاؤں گا' میں مکمل طور صحت یاب نہیں

ہوا تھا۔ علاوہ ازیں گھر سے بھیجے گئے خطوط میں بدشگون اشارے تھے کہ جہانتک ہمارے خاندان کا تعلق تھا سیاسی اعتبار سے اسکی حالت اچھی نہیں تھی۔ مزید میری ہونے والی شادی کا سوال کئی لحاظ سے پریشان کن تھا۔ پس ایک پر اندیش احساس کے ساتھ میں رات کے وقت جہاز سے بمبئی میں اترنے کا انتظار کر رہا تھا۔

باب

واپسی پر جو استقبال مجھے ملا اس نے میرے خدشات کو تقویت بخشی۔ پُرجوش استقبال کے بجائے جسکی مجھے توقع تھی، میرے والد کے ایک پرانے دوست لمبڈی کے فتح سنگھ جی (انکل فیٹی) ہمیں بندرگاہ کے پاس ملے اور مجھے خاموشی کے ساتھ اپنے ہمراہ ایک موٹر تک چلنے کو کہا جہاں میرے والد میرا انتظار کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ انہیں کوئی قتل کی دھمکی موصول ہوئی تھی اور میری آمد کی غیر ضروری تشہیر کرنے سے ڈر رہے تھے۔ موٹر میں بیٹھے تو ہم ۱۹ نیپین روڈ کی طرف روانہ ہوئے جسے میرے والد نے مودی سے خریدا تھا۔ ان حالات میں اتنی مدت بعد والد کے ساتھ میری یہ عجیب ملاقات تھی۔ جب ہم گھر پہنچے تو میری ماں جو بواسیر کے آپریشن کے بعد صحت یاب ہو رہی تھیں میرا استقبال کرنے کے لئے کھڑی ہوئیں اور مجھے گلے لگایا۔ میں تقریباً

چودہ ماہ بعد گھر لوٹا تھا۔ لیکن لمبے ہوائی سفر کے بعد تھکاوٹ اور بے عزتی کا عجیب احساس تھا۔ جوں ہی ہم گھر میں داخل ہوئے، میرے والد نے جو ہمیشہ کسی ایسی چیز کے قریب آکر جس میں انکو دلچسپی رہتی تھی، بے چین رہتے تھے، سامان کھولنے کے لئے کہا اور یہ کہ انکی ہدایات کے مطابق انکے لئے امریکہ سے کیا لائے تھے۔ جو چیزیں ہم انکے لئے لائے تھے ان میں شیو کا سامان، سگریٹ سلگانے کے لائٹر اور بجلی سے چلنے والی دوسری چیزیں شامل تھیں جو انکی متجسس ذہنی کیفیت کی بدولت انکو بڑی مسرت بخشتی تھیں۔ میں والدہ کیلئے کچھ سینٹ اور سنگار کا سامان بھی لایا تھا۔ تاہم اگلی صبح سے سنگین اور پریشان کن خبریں آنا شروع ہوئیں، مجھے معلوم ہوا کہ ریاست کی سیاسی صورتحال بہت ہی خراب تھی، اور یہ کہ میرے والد جو اب درحقیقت ایک آئینی سربراہ تھے اور شیخ محمد عبداللہ نہیں، جواہر لعل نہرو کی حمایت حاصل تھی جو بحیثیت وزیراعظم ریاست کے انتظامیہ کی سربراہی کر رہے تھے اور جن کے ہاتھ میں انتظامیہ کے اختیارات تھے دونوں کے درمیان زبردست تناؤ تھا۔ ڈوگروں اور کشمیریوں کی پرانی تلخیاں ایک صدی ڈوگرہ شاہی کے بعد دوبارہ ڈرامائی طریقہ پر بدلے ہوئے رُخ کے ساتھ نمودار ہوئیں۔ جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں کہ میرے والد حقیقت میں اپنے سیاسی اور انتظامیہ سے متعلق اختیارات کو استعمال کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ لیکن یہ بات قابل فہم تھی کہ بحیثیت مہاراجہ اپنی بالادستی اور شہرت کا خیال تھا اور جواہر لعل نہرو

نے جس طریقہ پر انہیں شیخ محمد عبداللہ کے حوالے حکومت کرائی تھی، جو ریاست کو پاکستان کے تسلط سے بچانے کیلئے فوجی امداد فراہم پہنچانے کی ایک حقیقی شرط تھی۔ اس پر وہ بہت ناراض تھے۔ یہیں سے میرے لئے ذہنی ٹکراؤ کی شروعات ہوئیں۔ ایک طرف والد کے تئیں وفاداری، جو میرے خیال میں ایک ایسے نظام اور ایک ایسے طرز خیال کی نمائندگی کر رہے تھے جو آزاد بھارت میں تیزی سے فرسودہ بنتے جا رہے تھے اور دوسری جانب جواہر لعل نہرو کے تئیں احترام تھا جو میرے سیاسی استاد تھے اور جن کی میں بہت قدر کرتا تھا۔

واپسی کے فوراً بعد دوسری حیران کن بات جسکا مجھے پتہ چلا وہ یہ تھی کہ میرے والد نے طے کیا تھا کہ شانتی واقعی میرے لئے موزوں دلہن نہ تھی اور منگنی توڑ دینا چاہتے تھے۔ اسکے لئے حقیقت میں کوئی جوازیت نہ تھی لیکن سگائی بھی ایک عجیب واقعہ تھا جسکی بنیاد میرے والد کے موڈ اور ترنگ کے اوپر تھا جس میں معقول تجربہ کا کوئی دخل نہ تھا۔ سگائی کے معاملہ میں میرا کوئی دخل نہ تھا حالانکہ اس مرتبہ معاملہ میری رائے معلوم کرنے کیلئے میرے سامنے رکھا گیا تھا لیکن مجھے محسوس ہوا کہ میرے والد پہلے ہی ذہن بنا چکے ہیں اور انکے ذہن کو بدلنے کے بارے میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ شانتی جب کئی برس پہلے سرینگر آئی تھیں اس کے بعد میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا حالانکہ جب میں امریکہ میں تھا ہم نے ایکدوسرے سے خط و کتابت کی تھی لیکن حقیقت میں مجھے ان کے

ساتھ کوئی ذہنی لگاؤ نہ تھا۔ پس فیصلہ کیا گیا جو رتلام گھرانے کے لئے انتہائی نامعقول تھا اور اس مقصد کے لئے ایک ایلچی کو رتلام بھیجدیا گیا۔ حیرت انگیز طور پر میرے والد نے جو جواہرات شانتی کو منگنی کے وقت دئے تھے انہیں واپس مانگنے کی ہمت کی تھی۔ اس دوران بزرگ مہاراجہ سجان سنگھ جی انتقال کر چکے تھے اور شانتی کے بھائی لوکیش ورسنگھ برائے نام حکمران تھے۔ اس بات نے مجھے کچھ اطمینان بخشا جب انہوں نے جواہرات واپس کرنے سے صاف انکار کیا۔

جلد ہی مجھے پتہ چلا کہ ان عجیب واقعات کے پیچھے کیا ہوا تھا۔ حیدرآباد آپریشن کے دوران، نیپال کے وزیراعظم مہاراجہ موہن شمشیر نے خیرسگالی اور دوستی کے طور پر ہندوستان ایک فوجی دستہ اپنے بڑے بیٹے جنرل سرادا شمشیر کی قیادت میں بھیجا۔ دہلی میں کھیتری کے راجہ اور وزیراعظم کے چھوٹے بھائی ہندوستان کے سفیر جنرل سنگھا کی بیٹی شہزادی بھوان کے درمیان شادی کے موقع پر میرے والدین کی ملاقات سرادا اُنکی بیوی اور انکے بچوں سے ہوئی تھی۔ سب سے بڑی لڑکی یشوراجیہ لکشمی تھی جسکی عمر محض بارہ برس تھی۔ بظاہر یہ سردار پٹیل تھے جنہوں نے اشارہ دیا تھا کہ کشمیر اور نیپال کے حکمران خاندانوں کے درمیان شادی کے بندھن سے نئے ہندوستان کیلئے عمدہ نتائج نکل سکتے تھے جس سے وہ (پٹیل) خون پسینے سے تعمیر کر رہے تھے۔ کم از کم مجھ سے یہی کہا گیا حالانکہ میں اس معاملہ کی کبھی تصدیق نہیں کرا پایا۔ بہرکیف نیپال کی شہزادی کے عین

موقع پر ظہور نے میرے والد کو تقویت بخشی جو انہیں رتلام والی سگائی توڑنے کیلئے درکار تھی۔ حالانکہ مہاراجہ سجان سنگھ جی کے انتقال کے بعد پہلے ہی وہ اس بارے میں ٹھنڈے پڑ چکے تھے۔ یہ بدلتے وقت کی نشانی تھی جو میرے والد چاہتے تھے کہ میں شہزادی سے ملوں اور یہ فیصلہ کروں کہ آیا میں اسکو پسند کرتا ہوں کہ نہیں۔ لہٰذا بمبئی سے جموں واپسی پر ہم دہلی میں رک گئے۔ اور ملاقات کا اہتمام فرید کورٹ ہاؤس میں ڈنر کے کھانے پر کیا گیا۔ ہماری ملاقات جنرل، رانی سرادا اور شہزادی سے ہوئی جو حالانکہ بارہ سال سے کچھ مہینے زیادہ تھیں۔ میں نے خاموشی کے ساتھ... کھانا تناول کیا۔ جبکہ میرے والدین خصوصاً مائیں لگاتار باتیں کرتی رہیں۔ کھانے کے بعد ہم موٹر میں داخل ہوئے تو میں نے ہاں کہدی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ شہزادی سے انکی رائے تک دریافت نہیں کیگئی تھی۔ اس قسم کے عجیب حالات میں ہماری شادی طے پا گئی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم دونوں خوش قسمت ہیں لیکن یہ میں اپنی حد تک کہہ سکتا ہوں۔

جب ہمارا ڈی۔ سی۔ ۳ چارٹر ہوائی جہاز جموں میں اترا تو ہمیں والہانہ استقبال ملا۔ طویل غیر حاضری کے بعد امریکہ سے واپسی پر پورا شہر ہمارا استقبال کرنے کیلئے باہر آگیا تھا اور جموں کے باشندوں نے اس موقعہ کا فائدہ اٹھاکر ڈوگرہ حکمران خاندان کے تئیں اپنی وفاداری اور محبت کو دہرایا۔ میں نے ایک ہی وقت میں اتنے سارے لوگوں کو پہلے کبھی اکٹھے نہیں دیکھا تھا۔ رگوناتھ مندر کے راستہ سے ہمیں ہوائی اڈہ

سے پیلس تک قریب تین گھنٹے لگے۔ بعد کے دنوں میں مجھے مہاجرین کے کیمپوں میں لیجایا گیا جہاں قبائلی حملے بہ مشکل بچنے والے ہزاروں افراد کی حالت زار دیکھ کر دل پاش پاش ہوتا تھا۔ مظفرآباد، میرپور، بھمبر اور دوسرے قصبوں میں رونما ہوئی قتل وغارت میں بہت سے پورے پورے خاندانوں کا صفایا ہوگیا تھا۔ سب کے سب گھربار سے ہاتھ دھو چکے تھے۔ بہت سے کیمپوں میں ان کا مجمع تھا جہاں لوگوں کا گذارہ خیرات پر ہوتا تھا۔ میری والدہ نے پناہ گزینوں کے امدادی کام کے سلسلہ میں شاندار کام انجام دیا تھا۔ وہ اس کام میں دل وجان سے جٹ گئی تھیں۔ وہ انکے لئے روپے جمع کرتیں اور اپنی جیب سے انکے لئے لاکھوں روپے خرچ کرتیں۔ میں انکے ساتھ اکثر ان کیمپوں میں گیا۔ پناہ گزین شکرگذاری کے طور پر آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ انکے پاؤں پڑتے۔ میرے والد بھی بعض اوقات ان کیمپوں میں جاتے تھے لیکن وہ جذبات کے اظہار کرنے کے مخالف تھے اور انکے ساتھ جو دورے رہتے تھے وہ کسی قدر زیادہ ہی رسمی ماحول میں ہوتے تھے۔

میری ملک سے غیرحاضری کے دوران بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ ہندوستانی فوج کی موجودگی اب ایک اہم بات تھی۔ میرے والدین کے سینیئر فوجی افسروں کے ساتھ عمدہ تعلقات تھے جو اکثر شام کو گپ شپ اور مے نوشی کے لئے آتے۔ پورے جموں وکشمیر سیکٹر کے لئے جنرل کلونت سنگھ کمانڈر تھے جبکہ جنرل تھمیا کشمیر

میں ڈویژنل کمانڈر تھے۔ پہلی جنوری ۱۹۴۹ء تک یعنی اقوام متحدہ کی سرپرستی میں جنگ بندی اعلان تک جنرل تھمیا زبردست جوابی حملوں کے ذریعہ حملہ آوروں کو واپس بھگانے کے ذمہ وار تھے۔ پیلس آنے جانے والے لوگوں میں بھی ایک نمایاں تبدیلی تھی۔ جبکہ ماضی میں درباریوں اور مصلاح کاروں تک محدود تھوڑے سے مخصوص لوگوں کا محتاط طریقہ پر انتخاب ہوتا تھا اب بڑی تعداد میں لوگ آتے جاتے تھے۔ بظاہر یہ آخری بار مایوس کن طور پر شیخ محمد عبداللہ کے خلاف سیاسی کشمکش میں نئے حمایتیوں کو جیتنے کی کوشش تھی۔

اس وقت اہم معاملہ رائے شماری کی تجویز تھی۔ دستاویز الحاق جس پر میرے والد نے دستخط کئے تھے۔ اسے منظور کرتے ہوئے بحیثیت ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ مونٹ بیٹن نے اپنے جواب میں لکھا تھا۔

"آپ نے جن حالات کا ذکر کیا ہے، انکے پیش نظر میری سرکار نے ریاست کشمیر کا ہند سلطنت کے ساتھ الحاق کو تسلیم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مستقل پالیسی کے طور پر، کسی ریاست کے بارے میں جہاں پر الحاق کا مسئلہ متنازعہ رہا ہو، اسے وہاں کے عوام کی امنگوں کے مطابق طے کیا جانا چاہئے۔ میری سرکار کی خواہش ہے کہ جوں ہی امن وقانون ریاست میں بحال کیا جائے اور اسکی سرزمین کو حملہ آوروں سے صاف کیا جائے تو

ریاست کے الحاق کے سوال کو عوام کی رائے سے حل کیا جانا چاہیئے"۔

بعد میں یہ پیش کش مشکل اور تکلیف کا باعث بنی اور جواہر لعل نہرو کی مسئلہ کشمیر کو غیر ضروری طور پر بین الاقوامی رنگت دینے پر بہت زیادہ تنقید کیگئی۔ بیشک میرے والد کی کسی ایک کے ساتھ الحاق کرنے کی جھجھک اور بعد میں جواہر لعل نہرو کی رائے شماری کی پیش کش، دونوں ہی ایسے معاملے ہیں جن پر مستقبل کے مؤرخ بلاشبہ دل کھول کر تنقید کریں گے۔ مؤرخوں کے ساتھ تاہم یہ دقت ہے کہ وہ شاذ ہی موقع پر موجود ہوتے ہیں اور اسلئے ایک مخصوص وقت اور جگہ پر چاروں طرف سے ناقابل فہم طاقتوں اور اجزاء کو پرکھنا مشکل پاتے ہیں۔ مجھے اپنے والد کی مشکلات کے بارے میں پہلے ہی کچھ کہنا تھا۔ جواہر لعل نہرو نے بھی اپنے آپ کو مشکل اور تکلیف دہ صورت حال میں پایا ہوگا۔ ایک طرف کشمیر سے جو انکے اسلاف کی جگہ تھی، انکو لگاؤ تھا اور دوبارہ جی اٹھنے والی ہندوستانی وطن پرستی کی مجبوریاں تھیں۔ دوسری جانب ان کا معقول فلسفہ، انکی جمہوریت سے وابستگی اور شیخ محمد عبداللہ سے انکی ذاتی محبت تھی۔ اس میں شک نہیں کہ سردار پٹیل نے حقیقت میں مختلف طریقہ پر صورت حال سے نپٹا ہوتا جیسے کہ انہوں نے حیدر آباد اور جوناگڈھ سے نپٹا تھا۔ تاہم جب قوم کے پاس ایک لیڈر کی صورت میں معقول خیال پرست دولت موجود ہو، تو بعض اوقات بذات

خود اصول پرستی کیلئے قیمت چکانا پڑتی ہے۔

اس وقت رائے شماری ایک نعرہ تھا۔ یہی شیخ محمد عبداللہ کے ہاتھ میں ترپ کا پتا تھا۔ جس شخص سے یہ توقع تھی کہ وہ ہندوستان کے لئے رائے شماری حاصل کرے وہ اپنے حصہ کا مطالبہ کر سکتا تھا۔ اور ایسا انہوں نے بار بار کیا۔ نہ صرف اقتدار کی باگ ڈور سنبھالنے کی صورت میں بلکہ میرے والد کا بے دردی سے پیچھا کرتے ہوئے بھی۔ انہوں نے میرے والد پر الزام لگایا کہ تقسیم ملک کے دوران انہوں نے آر۔ ایس۔ ایس کے ذریعہ جموں میں مسلمانوں کا قتل عام کرایا۔ یہ ایسے الزامات تھے جو کبھی ثابت نہ ہو سکے۔ ہم سے کہا گیا کہ شیخ محمد عبداللہ نے جواہر لعل نہرو سے کہا کہ جب گاندھی جی کو قتل کیا گیا تو میرے والد نے مٹھائیاں بانٹیں۔ جواہر لعل نہرو اور میرے والد کسی بھی طور اچھے دوست نہیں تھے۔ اور شیخ محمد عبداللہ یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ جب تک میرے والد ریاست کے اندر رہیں گے غالباً وہ رائے شماری کو نہیں جیت سکیں گے۔ شیخ محمد عبداللہ اور میرے والد کے درمیان سیاسی تناؤ ناقابل برداشت بنتا جا رہا تھا اور یہ محض وقت کی بات تھی جب ان دو میں سے ایک سے چھٹکارا پانا تھا۔

دو مضبوط شخصیتوں، شیخ محمد عبداللہ اور میرے والد کے درمیان تناؤ کے پس منظر کو یہاں بیان کرنا سودمند ہوگا۔ یہاں تک کہ حملے سے پہلے میرے ماموں ٹھاکر ناچنت چند کے ذریعہ ان دو اشخاص کے درمیان ملاقات کرانے کی کوشش کیگئی تھی۔ بے شک ۲۶ ستمبر ۱۹۴۷ء کو جیل سے

شیخ محمد عبداللہ نے میرے والد کے نام خط لکھا تھا جسکو مہر چند مہاجن نے مشروط معافی نامہ قرار دیا تھا۔ یہ خط مندرجہ ذیل ہے۔

"حضور کا اقبال بلند ہو۔ تقریباً ڈیڑھ برس کی قید کے بعد مجھے ٹھاکر ناچنت چند جی سے تفصیلی بات چیت کرنے کا موقع ملا۔ ریاست میں اس دوران کیا منحوس باتیں رونما ہوئیں مجھے ان کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس ریاست کا ہر ہی خواہ محسوس کر رہا ہے کہ ماضی کے بہت سے افسوسناک واقعات زیادہ تر غلط فہمیوں کا نتیجہ تھے۔

جواب لگتا ہے مفاد خصوصی رکھنے والے لوگوں نے خاص مفاد حاصل کرنے کی غرض سے جان بوجھ کر پیدا کی تھیں۔ سابقہ وزیراعظم آر۔ بی۔ رام چند کاک نے اپنی فتنہ انگیز حرکتوں اور ماہرانہ چالوں کے ذریعہ ان غلط فہمیوں کو انتہا تک پہنچایا اور کسی حد تک چاہئے عارضی طور ہی سہی، اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے۔ ہم نے آپکو اور آپکی رعایا کو قریب لانے کیلئے، جو کچھ بھی کیا یا جو کچھ کرنے کی کوشش کی، تاہم انہوں نے مجھے اور میری تنظیم کو بدترین رنگ میں پیش کیا۔ حقیر اور خودغرض مقاصد میرے ساتھ منسوب کئے گئے۔ خدا کا شکر ہے کہ حضور اور ریاست کے یہ تمام دشمن آج منظر عام پر آچکے ہیں۔

جو کچھ بھی ماضی میں ہوا، اسکے باوجود میں سرکار کو یقین دلاتا ہوں کہ میں یا میری جماعت نے کبھی کسی ایسے جذبہ کو دل میں جگہ نہیں دی جس کا مقصد سرکار کے تخت یا خاندان سے بے وفائی ہو۔ اس خوبصورت ملک کی ترقی اور اسکے باشندوں کی بھلائی ہمارا مشترکہ مقصد اور دلچسپی ہے اور میں سرکار کو اپنی اور اپنی تنظیم کی بھرپور حمایت کا یقین دلاتا ہوں۔ یہی نہیں، میں سرکار کو یقین دلاتا ہوں کہ ریاست کے اندر یا ریاست سے باہر کی کوئی بھی جماعت جو ہمارے مقصد حاصل کرنے والی کوششوں میں رکاوٹ پیدا کرنے کی سعی کرے گی، اسے ہم اپنا دشمن سمجھیں گے اور اسی لحاظ سے اسکے ساتھ نپٹا جائیگا۔

مشترکہ مقصد پانے کیلئے ایکدوسرے پر بھروسہ اور اعتماد ایک مضبوط سہارا ہے۔ اس کے بغیر ہماری ریاست کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے مشکلات کا کامیابی کے ساتھ سامنا کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس خط کو ختم کرنے سے پہلے میں سرکار کو اپنی ثابت قدم وفاداری کا یقین دلاتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا سرکار کی سرپرستی میں امن بہبودی اور اچھی حکومت کا دور لائے جو بے مثال اور دوسروں کے لئے قابل تقلید ہو۔"

آپ کا وفادار رعایا

ایس ۔ ایم ۔ عبداللہ

اس پُر اُمید خط کیوجہ سے شیخ محمد عبداللہ جیل سے رہا کئے گئے، جسکے بعد انکے اور میرے والد کے درمیان گلاب بھون میں ملاقات ہوئی مجھ سے یہانتک کہا گیا تھا کہ انہوں نے اس موقع پر درباری رسم کے مطابق میرے والد کو سونے کا پونڈ نذر کیا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ کوئی ٹھوس نتیجہ حاصل نہ ہوا اور جلد ہی پاکستان کے حملہ اور الحاق کی وجہ سے پوری صورت حال شدید طور پر تبدیل ہوئی ۔ اسلئے میرے والد کے سر سے پانی گذر چکا تھا اور جواہر لعل نہرو کی مکمل حمایت سے شیخ محمد عبداللہ بے انتہا ہر دلعزیز ہو رہے تھے ۔ جواہر لعل نہرو کو پورا طور پر یقین تھا کہ کشمیر کے مخصوص حالات کے مدنظر، قومی اور بین الاقوامی دونوں لحاظ سے شیخ محمد عبداللہ کیلئے ریاست کی حکومت میں مکمل طور پر شامل ہونا بالکل ضروری تھا۔ پس ۱۳ نومبر ۱۹۴۷ء میرے والد کے نام ایک خط میں انہوں نے لکھا

"جیسا کہ میں نے آپ پر واضح کیا کہ کشمیر میں جو واحد شخص کام کا ہے وہ شیخ عبداللہ ہیں ۔ ظاہر ہے کہ وہ کشمیر میں ممتاز و مقبول شخصیت ہے ۔ جس طریقہ پر آگے آ کر انہوں نے بحران کا مقابلہ کیا اس سے اس شخص کی فطرت کا پتہ چل گیا ہے ۔ انکی یک جہتی اور عام ذہنی توازن کے

بارے میں میری بہت اچھی رائے ہے ۔ انہوں نے بہت جشن کئے اور کافی حد تک فرقہ وارانہ رواداری کو قائم رکھنے میں کامیاب ہوئے ۔ چھوٹے معاملات میں وہ بہت سی غلطیاں کر سکتے ہیں لیکن میرے خیال میں بڑے فیصلہ جات کے بارے میں غالباً وہ حق بجانب ہی رہیں گے ۔

لیکن حقیقی نقطہ یہ ہے کہ شیخ عبداللہ کے بغیر کوئی بھی اطمینان بخش حل حاصل نہیں کیا جا سکتا ہے ۔ اگر یہ بات ہے تو ان پر مکمل اعتماد کرنا چاہئے ۔ نیم اعتماد کی کوئی گنجائش نہیں ہے، جس میں فائدے کم اور نقصانات زیادہ ہیں ۔ یہانتک کہ اگر اس مکمل اعتماد میں خطرہ بھی مول لینا پڑے، اسے مول لینا چاہئے ۔ میری نظر میں دونوں فوری اور بعید نقطہ نظر سے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے ۔ شیخ عبداللہ دیانتداری سے تعاون کے خواہاں ہیں اور کسی بھی معقول دلیل کے سلسلہ میں اطاعت پذیر ہیں۔ میں آپکو یہ صلاح دوں گا کہ آپ درمیانہ داروں کے بجائے ذاتی طور پر قریبی ربط رکھیں"۔

اکثر مجھے اس پر حیرت رہی ہے کہ اگر شیخ محمد عبداللہ اور میرے والد کے درمیان جو دونوں خود دار اور مطلق العنان آدمی تھے کوئی مصالحت ہوئی ہوتی تو برصغیر کی سیاست کس قدر مختلف ہوتی ۔ بعض کاغذات

کا مشاہدہ کرنے پر جو میرے والد کے انتقال کے بعد میرے قبضے میں آئے جس میں وہ خطوط بھی شامل ہیں جن کا میں نے حوالہ دیا۔ یہ عیاں ہے کہ شیخ محمد عبداللہ کو اقتدار منتقل کرنے کے بعد انکے اور میرے والد کے درمیان تناؤ مسلسل جاری رہا۔ بظاہر جواہر لعل نہرو نے میرے والد کو کچھ نہ کچھ مطمئن کرنے کی ضرور کوشش کی جیسا کہ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء کے درمیان انکے بہت سارے طویل خطوط سے ظاہر ہوتا ہے جن میں انہوں نے اس وقت پائے جانے والے سیاسی ماحول کی کچھ نشان دہی کرنے کی کوشش کی لیکن میرے والد اور شیخ محمد عبداللہ کے درمیان تناؤ کسی حقیقی سمجھوتہ قائم کرنے کے سلسلہ میں آڑے آیا۔ تضاد کی کئی وجوہات تھیں۔ جن میں ایک وجہ ریاست جموں وکشمیر کی فوج کے مستقبل کے بارے میں تھی جسکے کمانڈر انچیف میرے والد تھے۔ ظاہر ہے کہ شیخ محمد عبداللہ نے مطالبہ کیا کہ انکے وزیراعظم مقرر کئے جانے پر ریاست کی فوج کا انتظامی کنٹرول کو بھی انہیں منتقل کیا جانا چاہئے۔ جب اسکی شدید مخالفت کی گئی تو انہوں نے تجویز پیش کی کہ ریاستی فورسس کی نقل وحرکت اور انتظامیہ کنٹرول انڈین آرمی کو دیا جانا چاہئے۔ حالانکہ جب حملہ ہوا تھا تب سے ریاستی فوج کی نقل وحرکت کا کنٹرول انڈین آرمی کے تحت ہی تھا لیکن میرے والد علانیہ پس وپیش کر رہے تھے کہ سٹیٹ فورسس کی انفرادیت کو مکمل طور پر انڈین آرمی میں مدغم نہیں کیا جانا چاہئے۔ شیخ محمد عبداللہ کے میمورنڈم کے جواب میں انہوں نے دو اہم نقطے

اُجالے

"میں نے میمورنڈم میں درج تجاویز پر بہت غور وخوض کیا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس سوال کے بعض پہلو ایسے ہیں جو غالباً آپکے ذہن میں نہیں آئے۔ اسلئے میں آپ کو مندرجہ ذیل باتوں پر دیانتداری سے غور کرنے کے بعد اپنی رائے پر نظرثانی کرنے کے لئے کہتا ہوں۔

۱۔ پہلی بات یہ کہ اگر ریاستی فوج کے انتظام کا کنٹرول انڈین آرمی کو منتقل کیا جائے جیسا کہ آپنے تجویز کیا ہے تو پاکستان کے پروپیگنڈہ باز اس سے فائدہ اٹھائیں گے اور بظاہر معقول جوازیت پیش کریں گے کہ فوج کا مکمل کنٹرول ہندوستان کے ہاتھ میں دیکر ریاست کو مکمل طور پر ہند یونین کے ساتھ ملایا گیا ہے۔ اس قسم کا تاثر پیدا ہونے کی اجازت نہیں دینی چاہئے۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ پاکستان کی یہ تجویز کہ رائے شماری کے وقت ہندوستان کی فوجیں باہر بھیجی جانی چاہئے۔ ممکن ہے کہ کسی حد تک یہ بات ہم پر ٹھونسی جائے۔ اگر ریاستی فوج کا انتظامی کنٹرول منتقل کیا جائے تب ہمارے لئے ریاستی فورس کو برقرار رکھنے کی جوازیت قائم رکھنا مشکل ہوگا کیونکہ انتظامیہ کے نقطہ نظر سے ریاست

کی فوج اور انڈین آرمی میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔"

تاہم شیخ محمد عبداللہ بضد تھے۔ جواہر لعل نہرو کے نام ایک طویل اور غصہ آمیز خط میں انہوں نے ریاستی فوج کی شدید نکتہ چینی کی۔ ان پر ہر طرح کے جرائم اور جور و ظلم کا الزام لگایا اور اصرار کیا کہ انکی انفرادیت ختم ہونی چاہیئے۔ اور انکا کنٹرول مکمل طور پر انڈین آرمی کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہیئے۔ دباؤ بڑھانے کی غرض سے انہوں نے میرے والد کو مطلع کیا کہ انکی سرکار نے ۱۶ اگست ۱۹۴۱ء سے ریاستی فوج کو سبھی تنخواہیں اور الاؤنس روکنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تنازعہ بہت دنوں تک چلتا رہا اور کچھ برس بعد ہی ریاستی فوج کا انڈین آرمی کے ساتھ ادغام عمل میں آیا۔

تنازعہ کی ایک اور وجہ مخصوص شہریوں سے متعلق تھی جن کے بارے میں یہ خیال تھا کہ انکو میرے والد کے اختیار کے تحت چھوڑا جانا چاہیئے تھا۔ اسکے ساتھ حکمران خاندان کے افراد کیلئے کئی قسم کے پنشن اور محکمہ تواضع وغیرہ بھی شامل تھے۔ علاوہ ازیں زمینی اصلاحات کی بات بھی تھی۔ شیخ محمد عبداللہ اور انکی جماعت زمین کے لگان کے بارے میں بنیادی تبدیلی پر زور دے رہے تھے جبکہ ظاہر ہے کہ میرے والد کسی اقدام کے خلاف تھے۔ دھرمارتھ ٹرسٹ بھی جھگڑے کی بنیاد بنا جسکو ریاست کے بانی مہاراجہ گلاب سنگھ نے قائم کیا تھا جو ریاست کے مختلف حصوں میں سو سے اوپر مندروں اور مقدس

مقامات کے انتظامات چلا رہا تھا۔ حملہ کے بعد ٹرسٹ نے جموں میں پناہ گزینوں کے کھانے پر لاکھوں روپے خرچ کئے لیکن شیخ محمد عبداللہ نے الزام لگایا کہ دھرمارتھ ٹرسٹ کے روپے کو سیاسی مقاصد کیلئے صرف کیا گیا تھا لیکن اس الزام کو بھی ثابت نہیں کیا گیا اور شیخ صاحب بیتاب تھے کہ حکومت کو ٹرسٹ اور اس کی وسیع املاک کو اپنے قبضہ میں لینا چاہیئے۔ یہ معاملہ شدید اختلاف کا باعث بنا اور آخر میں سردار پٹیل کو ذاتی طور پر مداخلت کرنا پڑی اور ایک تصفیہ ڈھونڈا گیا جسکے تحت میرے والد واحد ٹرسٹی بنے لیکن چارٹرڈ اکاؤنٹنٹس کی ایک مشہور فرم کا تقرر عمل میں لایا گیا جس کے ذمہ ٹرسٹ کے فنڈ کی مکمل جانچ پڑتال کرنا تھا۔

اسی طرح اور دیگر قسم کے جھگڑوں کے علاوہ بنیادی حقیقت یہ تھی کہ میرے والد اور شیخ محمد عبداللہ دو ایسے سیاسی تمدنوں کی نمائندگی کر رہے تھے جو اس قدر مختلف اور بے جوڑ تھے کہ دراصل کسی سمجھوتہ کا امکان ہی نہیں تھا۔ میرے والد کا تعلق جاگیردارانہ نظام سے تھا اور ذہانت اور قابلیت رکھتے ہوئے بھی نئے نظام کو تسلیم کرنے اور شیخ محمد عبداللہ کی جمہوری پالیسیوں کو برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں تھے۔ دوسری طرف شیخ محمد عبداللہ جو پرکشش عوامی رہنما اور کشمیری زبان کے عمدہ مقرر تھے، ڈوگروں اور شخصی راج کے خلاف شدید جذبہ سے بھرپور تھے۔ کئی برس پہلے ایک

کتابچہ سے جسکا عنوان 'نیا کشمیر' تھا' انکے اشتراکی اقتصادیات کا پتہ لگتا ہے جس کی بنیاد مساوات اور اشتراکی سوچ پر مبنی تھی' جس میں حکمران زیادہ سے زیادہ ایک نام ونہاد سربراہ ہو سکتا تھا۔

ان کے درمیان نظریاتی تضاد کے علاوہ ایک پیچیدہ حقیقت یہ تھی کہ شیخ محمد عبداللہ سچ مچ کشمیری رائے کی نمائندگی کر رہے تھے جو تعداد کے لحاظ سے اکثریت میں تھی اور جو صرف ریاست کے ایک ہی خطے تک محدود تھی۔ اسکے برعکس میرے والد کو ڈوگروں کی رسمی وفاداری حاصل تھی جو جموں کے خطے میں اکثریت میں تھے۔ پس جموں وکشمیر جسکی بنیاد میرے اسلاف نے رکھی تھی' جسے ورثہ میں گوناگوں خطوں کی خصوصیت ملی تھی ۱۹۴۷ء میں انگریزوں کے چلے جانے کے بعد جو واقعات پیش آئے انکے ساتھ اس شدید تضاد نے سر اٹھانا شروع کیا۔ اس پوری صورت حال پر حقیقت حاوی تھی کہ ریاست بین الاقوامی جھگڑے کا موضوع بن گئی تھی اور کئی برس تک اقوام متحدہ کے ایجنڈے کا مستقل مرکز بنا رہا۔ جسکے نتیجہ میں رائے شماری کی پیش کش لگاتار ہمارے سروں کے اوپر لٹکی رہی اور تناؤ اور غیر استحکام کا ایک جزء بنگئی۔

میرے والد اور کشمیری لیڈروں کے درمیان بیر اس حقیقت سے نمایاں ہوا کہ قبائلی حملہ کے پیش نظر ۲۹ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کی شب میرے والد کا جموں چلے جانا (ایسا انہوں نے وی۔ پی۔ مینن کی بار بار صلاح پر کیا) شیخ محمد عبداللہ نے اس کا فائدہ اٹھایا اور میرے والد کی نکتہ چینی

کرنے اور انہیں بُری طرح سے بدنام کرنے لگے۔ ملک اور دُنیا پر یہ باور کرایا گیا کہ کشمیر میں ایک بزدل حکمران تھے، جو آدھی رات کو افراد خانہ جواہرات اور درباریوں کے ہمراہ اپنی راجدھانی چھوڑ کر چلے گئے اور اپنی رعایا کو آنے والے شدید حملہ کے قہر کا مقابلہ کرنے کیلئے تنہا چھوڑ دیا نیشنل کانفرنس کے لیڈروں نے گالیوں بھرا طوفانی پروپیگنڈہ شروع کیا جسکی گونج دہلی اور ملک کے دوسرے حصوں سے شائع ہونے والے اخباروں میں سنی جا رہی تھی۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ شیخ محمد عبداللہ خود بھی ۲۵ر اکتوبر کو ہوائی جہاز سے دہلی چلے گئے تھے یعنی ہمارے سرینگر چھوڑنے سے پہلے اور تب تک واپس نہیں لوٹے جب تک ہندوستان نے فوج نہیں بھیجی تھی۔ اس سے بدتر بات یہ تھی کہ شیخ محمد عبداللہ نے کھلم کھلا میرے والد پر جموں میں فرقہ وارانہ فسادات کو ہوا دینے کا الزام لگایا تھا جس میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا تھا اور برسوں شیخ صاحب اپنی تقریروں میں کہتے کہ "ڈوگروں کے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہیں" میرے والد جیسے ایک خود دار اور انتہائی حساس آدمی کیلئے اس قسم کے الزامات قدرتی طور پر بڑے دکھ اور غصے کا باعث تھے۔ یہ بات انکی باقی رہنے والی نیک نامی کو جاتی ہے کہ شدید اشتعال انگیزی کے باوجود انہوں نے عوام میں شاندار طریقہ پر خاموشی برقرار رکھی اور باقی ماندہ زندگی میں کوئی ایسی بات نہیں کہی جو نازک موڑ پر قومی مفاد کو زک پہنچا سکتی تھی۔

تاہم انہوں نے ۳، دسمبر ۱۹۴۸ء کو شیخ محمد عبداللہ کے نام ایک یادداشت میں ضرور احتجاج کیا۔

پرائم منسٹر!

میں آپکی توجہ اس گمراہ کن پروپیگنڈے کی طرف مبذول کرانا چاہوں گا جو میری ذات کے خلاف ریاست کے اندر اور ریاست سے باہر کیا جارہا ہے۔ میرے خیال میں یہ بات وزیراعظم کی نوٹس میں آئی ہوگی لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ اس قسم کی حرکات کا توڑ کرنے یا پابندی لگانے کیلئے کوئی قدم نہیں اٹھائے جارہے ہیں۔ میں اس خط کے ساتھ بعض منسٹروں اور نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کی تقریروں کی کاپیاں بھیج رہا ہوں جو اسی قسم کی خلاف ورزی پر مبنی ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ آپ اتفاق کریں گے کہ وزیروں کیلئے اس قسم کے پروپیگنڈے میں الجھنا آئینی اور اخلاقی لحاظ سے نامناسب ہے۔ حکومت کو اتنی ہی فکر ہونی چاہیئے جتنی مجھے ہے کہ اس بات کو یقینی بنائے کہ آئینی سربراہ، انکی عزت اور انکے وقار کا پوری طرح سے خیال رکھا جائے اور کسی بھی مخالفانہ رجحان

چاہیئے وہ کسی حلقے سے ہو، اسے فوری طور پر اور سختی سے نپٹا جائے۔ مجھے امید ہے کہ اس طرح کے رجحانات اور پروپیگنڈے کو روکنے کیلئے آپ فوراً مناسب کاروائی کریں گے۔ مجھے خوشی ہوگی کہ اگر آپ جتنا جلد ممکن ہو مجھے مطلع کریں کہ آپ کیا کاروائی کرنا چاہتے ہیں۔

مہاراجہ دھیراج

۳، دسمبر ۱۹۴۸ء

فائل میں کوئی جواب موجود نہیں ہے لیکن شیخ محمد عبداللہ سے مواقف طور پر جواب کی مشکل سے ہی توقع رکھی جاسکتی تھی۔ بیشک انہوں نے اپنی اس مانگ کو تیز کردیا کہ میرے والد کو دستبرداری یا کسی دوسرے طریقہ پر ریاست چھوڑدینے پر مجبور کیا جائے۔

میرے والد کے ساتھ ارادوں کے تضاد کے سلسلہ میں شیخ محمد عبداللہ کو جواہر لعل نہرو کی بھرپور حمایت کی وجہ سے ایک بڑی فوقیت حاصل تھی۔ اسکے برعکس میرے والد وزیر داخلہ سردار پٹیل کیساتھ قریبی رابطہ رکھے ہوئے تھے۔ جنہوں نے شیخ محمد عبداللہ کی طرف سے شروع کیگئی لگاتار پریشان کرنے والی صورت حال کے خلاف میرے والد کی طرفداری کی۔ جموں وکشمیر کے سابق وزیراعظم گوپالا سوامی آئنگر بھی جواہر لعل کی وزارت میں شامل تھے اور انکی ریاست کے

بارے میں قریبی معلومات کی بدولت انکی خدمات سے کشمیر کے معاملات سے نپٹنے وقت کئی مواقع پر استفادہ کیا گیا اور یہ کہ سردار پٹیل نے اسکی شدید مخالفت کی، جیسا کہ انکی خط وکتابت کی پہلی جلد سے عیاں ہے، جسکو شائع کیا گیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک موقع پر یہ معاملہ اس قدر سنگین بن گیا کہ دو بڑے رہنماؤں کے درمیان وسیع اختلافات پیدا ہونے کا ڈر تھا اور یہ کہ سردار پٹیل نے اسی معاملہ کے اوپر استعفٰی لکھا تھا (لیکن اسے بھیجا نہیں)

الحاق کے وقت سے ہی میرے والد نے سردار پٹیل کے ساتھ قریبی رابطہ قائم رکھا اور انکو کئی اہم معاملات کے بارے میں خطوط لکھے۔ خط وکتابت میں میرے والد کی جانب سے انہیں شیخ محمد عبداللہ کی طرف سے تنگ اور بے عزت کرنے کے خلاف کئی گذارشات بھی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ سردار پٹیل نے معاملہ سلجھانے کیلئے کئی مواقع پر مداخلت کی۔ اس وقت ایک بڑا مسئلہ سلامتی کونسل کی بحث کا تھا اور ریاست کے اندرونی انتظامیہ میں بنیادی تبدیلیوں کو ٹالا نہیں جاسکتا تھا جسکے تحت شیخ محمد عبداللہ کو انتظامیہ کا سربراہ بنایا جاتا اور میرے والد مخصوص شہریوں کی دیکھ بال کیلئے دیوان رکھتے۔ حقیقت میں تھوڑے دنوں کے لئے کچھ اسی طرح سوچنے کی کوشش کیگئی تھی۔ چونکہ شیخ صاحب انتہائی مقبول تھے اس لئے وہ اقتدار کی مکمل انتقال سے کم صاف طور پر کوئی دوسری چیز

تسلیم کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔ خط وکتابت سے پتہ لگتا ہے کہ میرے والد حملہ آوروں کے خلاف فوجی مہم کی سست رو کامیابی پر بہت ناخوش تھے۔ یہ بات اس جذباتی اور طویل خط سے ظاہر ہوتی ہے جو انہوں نے ۳۱ جنوری ۱۹۴۸ء کو سردار پٹیل کو لکھا۔ ناتسلی بخش صورت حال، پناہ گزینوں کے نہ ختم ہونے والی آمد اور سلامتی کونسل کی بحث میں تعطل کی باتیں اس خط میں درج ہیں۔ انہوں نے کچھ رائے زنی کی ہے جسکا میں بھرپور حوالہ دیتا ہوں کیونکہ اس سے اس وقت انکی ذہنی کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔ اور اقتدار سے دستبرداری کا پہلا امکانی اشارہ ملتا ہے۔

"متذکرہ بالا صورت حال کے پیش نظر، میرے ذہن میں ایک خیال آتا ہے کہ جہاں تک میرا سوال ہے کہ کیسے موجودہ صورت حال کا مقابلہ کرنے کیلئے ممکن اقدام اٹھاؤں، تو بعض وقت میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے جو الحاق ہندیونین کیسا تھ کیا ہے اسے منسوخ کروں۔ ہند یونین نے نہ صرف جزوی طور الحاق کو تسلیم کیا اور یونین علاقہ واپس نہیں کرسکتا ہے۔ اور اگر بالآخر سلامتی کونسل کے فیصلہ کو تسلیم کرتی ہے جسکا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہمیں پاکستان کے حوالے کردیا جائے تب ریاست کا ہند یونین کے ساتھ الحاق سے چمٹے رہنے کا کوئی مطلب نہیں۔ وقتی طور

پاکستان کے ساتھ بہتر تعلقات رکھنا ممکن ہوگا لیکن اسکی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ بالآخر اسکا مطلب شاہی سلسلہ اور ہندوؤں اور سکھوں کا خاتمہ ہوگا۔ میرے لئے ایک متبادل راستہ ممکن ہے۔ اور وہ ہے الحاق کو واپس لینا اور اسی طرح سے اقوام متحدہ سے مسئلہ کشمیر کو خلاصی ہوگی کیونکہ ہند یونین کو، کونسل کے سامنے کاروائی جاری رکھنے کا اس صورت میں کوئی حق نہیں رہیگا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ریاست کو وہ حیثیت واپس مل جائیگی جو اس کو الحاق سے پہلے حاصل تھی۔ تاہم اس صورت میں یہ مشکل ہوگی کہ ہندوستانی فوج کو ریاست میں نہیں رکھا جاسکتا بجز اسکے کہ وہ ریاست کی مدد کیلئے بطور رضاکار رہیں۔ میں اپنی فوج کے ساتھ ساتھ ہندوستانی فوج کی جو بطور رضاکار ریاست کی مدد کرے، قیادت سنبھالنے کیلئے تیار ہوں بشرطیکہ ہند یونین مانے۔ یہ بات میرے عوام اور فوج کو یقیناً مسرت بخشے گی۔ میں اپنے ملک کو آپکے جنرلوں سے بہتر جانتا ہوں جو وہ کئی مہینوں اور برسوں میں نہیں جانیں گے۔ میں اس مہم کو بہادری کے ساتھ قبول کرنے کو تیار ہوں بجائے اسکے کہ میں یہاں بیکار بیٹھا رہوں۔ یہ ہند یونین

کو سوچنا ہے کہ آیا وہ اسے دونوں صورتوں میں مانے گی۔ چاہئے الحاق برقرار رہے یا منسوخ ہو جائے۔ میں اپنی موجودہ زندگی سے تنگ آچکا ہوں اور لڑتے ہوئے مرجانا اس سے کہیں بہتر ہے کہ بے بسی سے دل کو پاش پاش کرنے والی مصیبت کا تماشا دیکھا جائے جہاں تک اندرونی سیاسی صورت حال کا سوال ہے میں نے اپنی طرف سے مکمل طور پر معاملہ آپ پر چھوڑ دیا ہے میں ریاست کا آئینی سربراہ رہنے کیلئے تیار ہوں اور جب نیا آئین مرتب ہوگا میں ذمہ دار سرکار قائم کرنے کے لئے بالکل آمادہ ہوں لیکن میں میسور ماڈل سے آگے جانے کیلئے تیار نہیں ہوں کیونکہ مجھے یہ اطمینان نہیں ہے کہ فی الحال نیشنل کانفرنس کے لیڈر لائق منتظمین ہیں یا یہ کہ انہیں ہندوؤں اور سکھوں یہانتک کہ مسلمانوں کے ایک بڑے حصّہ کا اعتماد حاصل ہے۔ اسلئے مجھے اپنے پاس کچھ مخصوص اختیارات جن سے آپ پہلے ہی واقف ہیں اپنے پاس رکھنے چاہئے اور میرا ایک دیوان ... بحیثیت ایک وزارتی رکن اور ممکن ہے کہ بحیثیت صدر ہونا چاہئے۔

دوسرا متبادل راستہ جو میرے ذہن میں آتا ہے

وہ یہ ہے کہ اگر میں کچھ نہیں کر سکتا تو مجھے ریاست کو چھوڑ دینا
چاہئے (جسکا مقصد دستبرداری نہ ہو) اور باہر رہوں تاکہ لوگ
یہ نہ سوچیں کہ میں انکے لئے کچھ کر سکتا ہوں۔ اپنی شکایات کے
لئے وہ سِول انتظامیہ یا انڈین فورسس کو ذمّہ وار ٹھہرا سکتے
ہیں جو ریاست کے دفاع کے انچارج ہیں۔ تب صاف
طور پر ذمّہ واری ہندیونین کی ہوگی یا شیخ عبداللہ کے انتظامیہ
کی۔ اگر کوئی نکتہ چینی ہوئی تو انکی ہوگی جو اسکے ذمّہ دار ہیں
اور لوگوں کی تکالیف کی ذمّہ داری میرے اوپر عائد نہیں ہوگی
بیشک میں پہلے ہی اچھی طرح سے اندازہ لگا سکتا ہوں جیسے
کہ لوگوں نے میرے محض مینن کی صلاح پر کشمیر چھوڑتے
وقت کہنا شروع کیا کہ میں کشمیر سے بھاگ گیا۔ اب
کہیں گے کہ میں نے انکو مصیبت کی گھڑی میں چھوڑ دیا
ہے۔ لیکن ایک ایسی حالت میں رہنے سے کوئی فائدہ
نہیں جہاں سوائے نکتہ چینی سے بچنے کے کچھ نہیں کر سکتا
بیشک اگر میں ریاست سے باہر جاتا ہوں مجھے لوگوں کو
اعتماد میں لینا ہوگا اور انہیں وجوہات بتانے ہونگے کہ
میں باہر کیوں جا رہا ہوں"۔
سردار پٹیل کا جواب ۹ فروری کو آیا۔ کارگر فقرہ واضح تھا
انہوں نے لکھا۔

"آپ کو جس بے چینی کا سامنا ہے اس کا مجھے
اچھی طرح سے احساس ہے۔ میں آپکو یقین دلاتا ہوں
کہ میں کشمیر کی صورت حال اور جو کچھ یو۔ این۔ او
میں ہو رہا ہے، کے بارے میں کچھ کم متفکر نہیں ہوں۔
لیکن موجودہ صورت حال جو کچھ بھی ہو، مایوسی کیلئے ہرگز
کوئی گنجائش نہیں"۔

بعد کے خطوط میں میرے والد کے شیخ محمد عبداللہ کو مؤثر اقتدار
سونپنے کے اعلان نامہ کے معاملہ، دیوان ٹھاکر بلدیو سنگھ پٹھانیہ کے دفتر
اور کام کاج اور مخصوص شہریوں کی وضاحت، جموں و کشمیر کی فوج
کے مستقبل اور بیشک شیخ عبداللہ کے بیانات پر بحث درج ہے۔
۴۔ اپریل ۱۹۴۸ء کو سردار پٹیل کے نام ایک پُر انکشاف خط میں میرے
والد نے لکھا۔

"میرے پیارے سردار پٹیل
جیسا کہ میں نے آپکو اور مسٹر مینن کو اور مسٹر
شنکر کو بھی ایک یا دو بار کہا کہ میرے خلاف
پروپیگنڈے کا ایک پہلو ہے جس نے مجھے اس قدر
دکھ پہنچایا ہے جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا
کیونکہ یہ نہ صرف بحیثیت حکمران کے میری حیثیت
کو متأثر کرتا ہے بلکہ میری عزت پر بھی اثر انداز

ہو رہا ہے ۔ میں ان بے بنیاد اور بے پر کے الزامات کا ذکر کرتا ہوں جو میرے خلاف لگائے جا رہے ہیں کہ میں نے آدھی رات کو راجدھانی چھوڑی اور ٹرک بھر بھر کر فرنیچر اور دوسرا سامان لیجایا گیا ویسے تو میں نے ان الزامات کو کوئی اہمیت نہیں دی ہوتی لیکن مجھے بہت افسوس اور شدید صدمہ ہے کہ ان الزامات کا تذکرہ میرے موجودہ وزیراعظم کے بعض بیانات میں ہوا ۔ میں آپکی توجہ شیخ محمد عبداللہ کی تقریر جو انہوں نے سلامتی کونسل کے سامنے کی، کی طرف مبذول کرانا چاہوں گا جس میں انہوں نے مندرجہ ذیل الفاظ کہے ۔

"مہاراجہ آدھی رات کو اپنے درباریوں کے ہمراہ راجدھانی سے بھاگ کھڑے ہوئے جسکا نتیجہ مکمل افراتفری نکلا ۔ اس طریقہ پر اقتدار منتقل ہوا اور حقیقت میں ہم انتظامیہ کے انچارج تھے جسے بعد میں مہاراجہ نے قانونی شکل دی"

یہ الزام ــــ کس قدر حقائق سے خارج ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ آپکے سکریٹری مسٹر مینن جن کے اصرار پر میں بادِل ناخواستہ سرینگر چھوڑ کر جموں آیا، میری بات کی تصدیق کریں گے ۔ دوسرا الزام کہ ٹرکوں میں بھر بھر کر سامان نکالا گیا، بالکل بے بنیاد اور خیالی ہے ۔ حقیقت یہ

ہے کہ کچھ لاریاں جن میں افسروں کے بال بچے میرے پیچھے پیچھے آئے ۔ میں نے انکو ٹرانسپورٹ کی سہولیات بہم پہنچانے کیلئے اپنے آپ کو اخلاقی طور ذمہ دار محسوس کیا ۔ میرا گھریلو اثاثہ جو مستقلاً سرینگر میں رہتا ہے، وہیں تھا اور اب بھی ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ اس قسم کی تقریریں اور الزامات جب انتظامیہ میں اعلیٰ سطح پر فائز شخص اور نیشنل کانفرنس کے ارکان کی طرف سے عائد کئے جائیں تو اسکا لازمی نتیجہ حکمران اور رعایا کے درمیان غیر اطمینانی اور کشیدگی کو بڑھاوا نکلے گا ۔

آپ شاید پوچھیں گے کہ اس تقریر کے اتنا وقت گذرنے کے بعد میں اس معاملہ کو کیوں زندہ کرتا ہوں ۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود کہ یہ الزامات اب بھی جاری ہیں اور لگاتار پروپیگنڈے کی وجہ سے ان پر اعتبار کیا جا رہا ہے ۔ میرے وزیراعظم کی تقریر ایک کتابچہ کی صورت 'کشمیر، دنیا کے ضمیر سے گذارش' کے عنوان سے تقسیم کیا جا رہا ہے ۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ کی وزارت اس پروپیگنڈے کی تردید کرنے میں مؤثر بیان دیگی، جس میں صحیح واقعات کی نقاب کشائی کیجائے ۔ اور آپ شیخ محمد عبداللہ کو ان کی کوتاہیاں درست کرنے پر آمادہ کریں گے جو ان سے سرزد

ہوئیں۔

جبکہ میں اس موضوع پر غور کر رہا ہوں میں اس پروپیگنڈے کے ایک اہم پہلو کا حوالہ دینا چاہوں گا جو میرے خلاف کیا جا رہا ہے، یعنی کہ میں ایک جابر اور مطلق العنان حکمران ہوں۔ یہ کہ قومی تحریک ڈوگرہ شاہی کے خلاف تھی۔ یہ کہ موجودہ صورت حال لوگوں کی طرف سے میرے اور میری سرکار کے خلاف جہاد کی بناء پر ظہور پذیر ہوئی۔ اس صداقت کے علاوہ کہ میں کسی غیر جانب دار شخص کے سامنے ثابت کروں گا کہ ۱۹۳۴ء کے بعد جو اصلاحات میں نے اپنے لوگوں کو دئے وہ ہندوستان کی کسی ریاست کے کسی بھی حکمران کی طرف سے دئے گئے اصلاحات سے کہیں زیادہ جدید تھے۔ اور یہ کہ آئین ہند کے تئیں میرا رویہ کسی اور حکمران سے کہیں زیادہ ترقی پذیر تھا۔ میں پوچھنا چاہوں گا کہ کیا گڑے مُردے اکھاڑنے سے کوئی فائدہ مند مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ ماضی میں جو کچھ بھی ناخوشگوار واقعات گذرے اپنی طرف سے میں انہیں بھولنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کیا اس شخص سے جو اقتدار میں ہے، میرے تئیں ایسا ہی رویہ اختیار کرنے کی مانگ کوئی غلط بات ہے؟ علاوہ ازیں مجھے

بحیثیت ایک مطلق العنان حکمران کے طور پر پیش کر کے شاید اس بات کو محسوس نہیں کیا جا رہا ہے کہ اس طرح وہ محض پاکستان کے پروپیگنڈے کو تقویت بخش رہے ہیں۔ مجھے یہ سوچنا چاہئے تھا کہ وہ پرانی دشمنی کو زندہ رکھنے کے بجائے مصلحتاً خود بخود پاکستان کے اس پروپیگنڈے کو جھٹلاتے (جیسا کہ بعض با رسوخ آدمیوں نے مجھ سے کہا) کہ پونچھ اور میرپور کی بغاوت کی جوازیت کو وزارت کی طرف سے پبلسٹی مواد سے متعلق کچھ صفحات میں دیکھا جا سکتا ہے کہ جو نقصان ہوا ہے، مجھے امید ہے کہ آپکی طرف سے ہدایات کی بدولت اسکی کچھ نہ کچھ تلافی ہو گی۔ میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ اگر میں نے محسوس نہ کیا ہوتا کہ ان دو معاملات کا پروپیگنڈے کے نقطہ نظر سے کشمیر کا ہند یونین کے ساتھ مستقل رفاقت کیلئے اہم تعلق ہے۔ تو میں اس پر اتنا زور نہ دیتا۔

مُخلِص
ہری سنگھ

تاہم یہ ظاہر ہے کہ سردار پٹیل بھی شیخ محمد عبداللہ کو قابو میں رکھنے کی پوزیشن میں نہ تھے اور جب میں فروری ۱۹۴۹ء

میں ہندوستان لوٹا تب تک صورت حال بالکل پیچیدہ بن گئی تھی اور ایک مکمل رکاوٹ پیدا ہو چکی تھی۔ مارچ میں میری عمر اٹھارہ برس کی ہوئی لیکن اس تقریب پر حقیقت میں کسی نے دھیان نہ دیا کیوں کہ ماحول تناؤ اور اندیشوں سے پُر تھا۔ اسکے فوراً بعد میرے والد کو سردار پٹیل کیطرف سے ایک خط ملا جس میں میرے والدؔ میری والدہ اور مجھے صلاح کے لئے دہلی بلایا گیا تھا۔ ہم اپریل میں چارٹرڈ ڈی، سی، ۳ ہوائی جہاز سے دہلی پہنچے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ہم اس جہاز میں سوار ہو رہے تھے جو میرے والد کی چتا کی راکھ لیکر ہی پیارے جموں کو لوٹ آئیگا۔

باب ۸

دہلی پہنچنے پر ہم نے پرانی دلّی میں میڈنس ہوٹل میں قیام کیا۔ اسکے بعد ایمپیریل میں منتقل ہوگئے۔ دلّی پہنچنے کے فوراً بعد میرے والدؔ میری والدہ اور مجھکو جواہر لعل نہرو نے تین مورتی ہاؤس میں دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا۔ اندرا گاندھی میزبان تھیں۔ حالانکہ میرے والد اور جواہر لعل نہرو ظاہر ہے ایکدوسرے کی موجودگی میں اپنے آپ کو بے چین محسوس کر رہے تھے لیکن بظاہر کوئی عداوت نہ تھی۔ یہ عیاں تھا کہ جواہر لعل نے یہ سردار پٹیل پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ پورا دل لگا کر میرے والد کے ساتھ تفصیلات طے کریں۔ ۲۹ اپریل کو ہم نے سردار پٹیل کے ساتھ بھی کھانا کھایا۔ اس موقع پر انکی بیٹی مانی بین اور انکے پرائیویٹ سکرٹری وی شنکر موجود تھے۔ رات کے کھانے کے بعد میرے والدین اور سردار پٹیل دوسرے کمرے میں چلے گئے اور یہیں پر کاری ضرب لگی

سردار پٹیل نے میرے والد سے شرافت لیکن مضبوطی سے کہا کہ شیخ محمد عبداللہ انکی برطرفی پر زور دے رہے ہیں۔ لیکن بھارت سرکار محسوس کرتی ہے کہ یہ کافی ہوگا اگر میرے والد اور والدہ چند مہینوں کے لئے اپنے آپ کو ریاست سے غیر حاضر رکھیں۔ انہوں نے کہا کہ رائے شماری کی تجویزوں سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کے پیش نظر' جنکی سرگرم طریقہ پر اُس زمانہ میں اقوام متحدہ میں پیروی کی جارہی تھی' ایسا کرنا قومی مفاد میں تھا۔ انہوں نے مزید کہا کہ چونکہ میں اب امریکہ سے لوٹ چکا تھا' میرے والد کو مجھے اپنا ریجنٹ مقرر کرنا چاہئے' تاکہ ریاست سے انکی غیر حاضری کے دوران' انکے فرائض اور ذمہ داریاں انجام دوں۔

میرے والد سکتے میں آگئے۔ حالانکہ کچھ مدت سے اس سلسلہ میں افواہیں گشت کر رہی تھیں کہ غالباً انکو ریاست بدر کیا جائے گا انہیں کبھی یقین نہ تھا کہ سردار پٹیل بھی انہیں یہ راستہ چُننے کا مشورہ دینگے۔ وہ کمرے سے نکلے تو ان کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا جبکہ میری والدہ آنسو چھپانے کی بہت کوشش کر رہی تھیں۔ سردار پٹیل بھی سنجیدہ لگ رہے تھے' جب وہ دروازہ تک ہمارے ساتھ آئے میں نے فوراً محسوس کیا کہ کوئی خطرناک بات تھی لیکن یہ پوچھنے کی جسارت نہ کی کہ معاملہ کیا ہے۔ ہم بالکل خاموشی کے ساتھ موٹر میں ہوٹل کو لوٹے۔ میرے والد نے فوراً اپنے صلاح کار بخشی تیک چند

اور مہر چند مہاجن اور اپنے اسٹاف ممبروں کو جلدی جلدی اکٹھا کیا۔ میری والدہ اپنے کمرہ میں چلی گئیں جہاں وہ تیزی سے اپنے پلنگ پر چڑھ گئیں اور آنسوؤں سے رونے لگیں۔ میں انکے پیچھے پیچھے وہاں چلا گیا اور جب وہ تھوڑا بہت سنبھل گئیں تب انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ اور میرے والد ریاست بدر کئے جا رہے ہیں اور بھارت سرکار چاہتی ہے کہ مجھے ریجنٹ مقرر کیا جائے۔

جواہر لعل نہرو کے ساتھ کئے گئے ناشتوں میں سے پہلا موقع تھا جب انہوں نے مجھے پہلی بار اس نازک موقعہ پر اپنے گھر پر ناشتے کی دعوت دی۔ میں اپنی انتہائی خوشی کو اب بھی محسوس کرتا ہوں جب میں تین مورتی ہاؤس کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے طعام خانہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اندرا گاندھی اور انکے بیٹے پہلے ہی ناشتہ کر چکے تھے۔ اسلئے دو آدمیوں کے لئے میز سجائی گئی تھی۔ جواہر لعل تیزی سے اندر آگئے۔ دوستانہ طریقہ پر 'ہیلو ٹائیگر' کہتے ہوئے ہاتھ ملایا اور ہم ناشتہ کرنے میں لگ گئے۔ ناشتہ کے دوران جو تقریباً ایک گھنٹے تک جاری رہا' جواہر لعل نے مجھ سے چند عام نوعیت کے سوالات پوچھے اور تب طویل گفتگو میں لگ گئے۔ اپنے شستہ لہجے میں انہوں نے اس حقیقت کے بارے میں بتایا کہ ایک نئے ہندوستان کو تعمیر کیا جا رہا ہے اور یہ کہ 'پرانا جاگیردارانہ نظام' تیزی سے زمین بوس ہو رہا ہے۔ اسلئے بحیثیت ایک نوجوان کے مجھے خوشی خوشی نئے

ماحول سے سمجھوتہ کرنا چاہئے۔ تب انہوں نے مسئلہ کشمیر کا خاکہ کھینچنا
شروع کیا۔ شیخ محمد عبداللہ کے رول اور قومی مفاد کے پیش نظر ریاست میں
ہم آہنگ ماحول کے قیام کی اہمیت سمجھائی۔ انہوں نے مختصر طور
پر بتایا کہ میرے والد ظاہر ہے کہ نئے نظام کو تسلیم کرنے کے لئے یا تو
قاصر ہیں یا پھر تیار نہیں اور ان کا (جواہر لعل) اور شیخ محمد عبداللہ کا
خیال ہے کہ موجودہ رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے مجھے ریجنٹ بنانا
چاہئے۔ جب انہوں نے مستقبل کے ہندوستان کے بارے میں
گفتگو کی تو انکی آنکھوں میں دھیمی آنچ سی چمک اٹھی اور ان کی
آواز میں تیزی آگئی۔ جب میں اسکول میں تھا تب سے انکی تعریف
سنی تھی اور اب انکے قریب ہونا اور انکی باتیں سننا ایک سحر انگیز
تجربہ تھا۔ جب وہ ان وسیع تاریخی طاقتوں کے بارے گفتگو کر رہے
تھے جو سبک رفتاری سے دنیا میں چل رہی تھیں تو ایسا لگ رہا
تھا جیسے "ڈسکوری آف انڈیا" حقیقت بن کر میری آنکھوں کے سامنے
نمودار ہو رہی تھی۔ والد صاحب کے دائرہ میں جو سخت نظریات میں نے
سنے تھے اور گھر میں سرایت کن تناؤ بھرے اور سازشی ماحول سے
یہ ماحول کتنا مختلف تھا۔ میں نے اب محسوس کیا کہ حکمرانی جارہی تھی
اور کبھی واپس نہیں آئیگی لیکن وسیع قومی مفاد میں اپنے زمانہ
کے ایک عظیم لیڈر کی ہدایت پر کچھ کرنے کا ایک پر جوش موقعہ
میسر تھا۔

بعد کے دنوں میں تناؤ دھیرے دھیرے بڑھتا گیا۔ ہم
امپیریل ہوٹل میں منتقل ہو چکے تھے جہاں ہم نے کئی سیوٹس اپنی تحویل
میں لے لئے تھے اور لگاتار میرے والد کے ساتھ ملاقاتوں کا تانتا
بندھا رہتا تھا۔ ملنے والوں میں قابل ذکر وی۔ شنکر تھے جو سردار
پٹیل کی گرتی ہوئی صحت کے پیش نظر اسٹیٹ منسٹری میں تیزی سے
اہم بنتے جارہے تھے۔ سردار پٹیل نے مجھے ایک شام کو اپنے پاس
بلایا اور پوری صورت حال کے بارے میں میرے ساتھ طویل گفتگو
کی۔ جبکہ جواہر لعل نہرو کی گفتگو کا تعلق بھارت کی وسیع قومیت کے
سلسلہ میں تھا۔ سردار پٹیل نے ایک تنگ دائرہ چنا تھا۔ انہوں
نے کہا کہ اگرچہ وہ اچھی طرح سے محسوس کرتے ہیں اور مانتے ہیں کہ
میرے والد کے ساتھ ناانصافی کی جارہی ہے لیکن ان تجویزوں کو
خصوصاً شیخ محمد عبداللہ کے اصرار کی وجہ سے قومی مفاد کی خاطر ماننا ہوگا۔
انہوں نے یہ بھی کہا کہ مجھے نئی صورت حال کا بہادری کے ساتھ مقابلہ
کرنا چاہئے اور اپنی ذمہ داریوں کو ہمت اور اعتقاد کے ساتھ قبول کرنا چاہئے۔
اس مشکل موڑ پر انکی گفتگو میرے لئے بہت ہی ہمت کا باعث تھی۔
اسکے فوراً بعد سردار پٹیل ڈیرہ ڈون چلے گئے اور یہ طے پایا کہ میں اور
میرے والدین بعد میں وہاں ان سے ملنے جائیں گے۔ اسی دوران
میرے والدین بھارت سرکار کی طرف سے ملے ہوئے فی الواقع الٹیمیٹم
سے الجھے ہوئے تھے اور دھیرے دھیرے ریاست کو چھوڑنے کی

ناگریز حقیقت کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ میرے اوپر ریجنٹ کا
عہدہ قبول نہ کرنے کے بارے میں کچھ دباؤ تھا لیکن مجھ سے جس
قدر بھی بن سکا میں نے نرمی سے یہ اشارہ دیا کہ میرے خیال میں پورے
خاندان کا ریاست سے چلا جانا مناسب نہ ہوگا کیونکہ اسکا مطلب
جموں وکشمیر سے سبھی بندھن توڑنا تھا۔ میری عمر صرف اٹھارہ برس
کی تھی لیکن شاید اس غیر معمولی ماحول کی بدولت جس میں میری
پرورش ہوئی تھی، میں بہت ہی بزرگ رہنماؤں کے ساتھ بحث
کے دوران خود اپنا نقطہ نظر رکھتا تھا۔ جبکہ بیرونی طور میرے اندر
خود اعتمادی کی کمی کا کوئی اشارہ نہیں مل رہا تھا تاہم مجھے اعتراف
کرنا چاہئے کہ اکثر اندر سے میں خود کو شدید خوف کے دہانے پر کھڑا
محسوس کر رہا تھا۔ آخری چند برس بہت ہی کشیدہ نوعیت کے رہ چکے
تھے اور امریکہ میں میری اپنی طویل غیر حاضری نے بھی عجیب اور غیر
مطمئن ماحول پیدا کرنے میں مدد کی تھی۔ میرے بچپن کی سبھی ...
آشنائیاں غائب ہو چکی تھیں، یہاں تک کہ میری ماں جن کے ساتھ
مجھے بہت قریبی جذباتی لگاؤ تھا وہ بھی نفسیاتی طور پر گرنے کے
قریب دکھائی دے رہی تھیں۔ دراصل انکی حالت سخت دشوار
تھی۔ ایک طرف مزاجوں کے فرق کے باوجود، میرے والد کے
تئیں وفاداری کا سوال تھا اور دوسری جانب اکلوتے بچہ کیلئے
انکی جان نثاری تھی۔ میرے والد کی یہ خصوصیت تھی کہ انہوں نے

میرے ساتھ براہ راست کسی مسئلہ پر بات چیت نہیں کی۔ بات
چیت یا تو انکے پرائیویٹ سکریٹری پنڈت بھیم سین ماہے کے ذریعہ
ہوتی تھی یا پھر مہرچند مہاجن کے ذریعہ ہوتی جو وزیراعظم کا عہدہ
چھوڑنے کے بعد بھی انکے ایک معتمد خاص بنے رہے۔ ایسا لگا کہ شروع
کے صدمہ کے بعد میرے والد نے اپنے آپ کو کچھ عرصہ کے لئے
ریاست چھوڑنے کیلئے آمادہ کیا حالانکہ میرے خیال میں انہوں نے
محسوس کر لیا تھا کہ انکے لئے پھر کبھی واپس لوٹنا آسان نہ ہوگا۔ تاہم
وہ مکمل طور پر دستبرداری کے خلاف تھے اور اس بات کو انہوں نے
۶، مئی کو سردار پٹیل کے نام اپنے ایک خط میں دہرایا۔ میں نیچے ان
کے خط کی پوری عبارت اور سردار پٹیل کے جوابی خط جو انہوں نے
ڈیرہ ڈون سے بھیجا نقل کرتا ہوں۔ کیونکہ میری زندگی کے بعد کے
واقعات پر ان خطوط نے گہری چھاپ ڈالی۔

پیارے سردار پٹیل جی۔

۲۹۔ اپریل اور پہلی مئی ۱۹۴۹ء کو میری جس مسئلہ پر آپ
سے بات چیت ہوئی تھی اس پر میں غور کرتا رہا اور اب
میں اس حالت میں ہوں کہ ریاست سے عارضی غیر حاضری
کی تجویز کے بارے میں اپنا صحیح ردِ عمل آپ کو بتاؤں۔
میں کہنا چاہوں گا کہ آغاز میں مجھے اس تجویز سے بالکل

حیرانی ہوئی۔ لیکن چونکہ یہ تجویز آپ نے پیش کی تھی آپ
میں شروع سے کامل بھروسہ اور اعتماد کرتا ہوں اور کئی سوالوں
کے بارے میں، جو میری ذات اور میری ریاست دونوں
کو حال اور مستقبل میں متاثر کر رہے ہیں، آپ کے مشورہ
کی لگاتار پیروی کی۔ کسی نہ کسی طرح سے میں نے اس صورت
حال سے سمجھوتہ کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ تاہم میں
ایک بشر نہیں ہوں گا، اگر میں اپنی شدید مایوسی اور استعجاب
کا اظہار نہ کروں کیونکہ مجھے عزت و ناموس اور پوزیشن
کی ایسی قربانی دینے کو کہا گیا جبکہ میں لگاتار یہاں
تک کہ بعض اوقات اپنی فہم اور ضمیر کے خلاف ریاست
کی آئینی حیثیت کے بارے میں بھارت کے وزیر اعظم اور
آپ کے مشورہ کی پیروی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی ان
تصفیہ جات کے خلاف بھی، جن پر چند ماہ پہلے سمجھوتہ
ہو چکا ہے۔ کیا اب آپ سے اپنے جذبات کو چھپانا
میرے لئے مناسب ہوگا جبکہ شیخ عبداللہ کو وقتاً
فوقتاً اپنی رغبت کے مطابق ان وعدوں اور اس تحریر،
جن کے ذریعہ انہوں نے جیل سے چھوٹنے سے پہلے
ہمیشہ وفادار رہنے کا وعدہ کیا تھا، حلف کی طاعت
سے انحراف کی اجازت دی جائے جو انہوں نے اقتدار

سنبھالتے وقت اٹھایا تھا اور یہ کہ انہیں کھلم کھلا
اپنے ساتھیوں کے ہمراہ میرے خلاف ریاست کے اندر
اور ریاست سے باہر رسوائی اور غلط تہمت کی مہم چلانے
کی چھوٹ دی جائے۔ اور یہ کہ مجھے اپنی پوزیشن چھوڑ
کر دوسری پوزیشن قبول کرنے پر مجبور کیا جاتا رہا۔ میرا
خیال ہے کہ میں نے ہر ایک پوزیشن اسٹیٹ منسٹری کے
مشورہ پر سنبھالی۔

قدرتی طور پر یہ امتیاز مجھے تکلیف دہ احساس
سے دوچار کر رہا ہے۔ تاہم آپ پر یا پھر آپکے فیصلہ
پر مکمل بھروسہ کرتے ہوئے اور ہمارے تئیں آپ کے
نیک ارادوں کی بدولت، میں آپکی خواہشات کا پالن
کروں گا اور اپنے آپ کو ریاست سے تین یا چار ماہ غیر حاضر
رکھوں۔ اس حقیقت کو ذہن میں رکھتے ہوئے جس پر آپ نے
زور دیا (یعنی یو۔ این۔ او کی بحث سے پیداشدہ پیچیدگیاں
اور مسئلہ رائے شماری)

تاہم اس تجویز سے بعض سوالات اُبھرتے ہیں،
جن کے بارے میں، میں آپ پر اپنی پوزیشن واضح کرنے
کی جسارت کروں گا اور اگر آپ اس بارے میں یقین
دہانی کرائیں تو میں مشکور رہوں گا۔ مجھے امید ہے کہ

آپ ان یقین دہانیوں کی تلاش کی ضروریات کی قدر کریں گے۔ پچھلے کئی مہینوں کے تلخ تجربوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے فوری مستقبل کے بارے میں سوچنا ہے اور اپنی خاطر، اپنے خاندان اور شاہی سلسلہ کی خاطر میں ان معاملات کے بارے میں واضح بیان حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ مجھے یہ یقین دہانی ملنی چاہئے کہ یہ قدم دستبرداری کے کسی خیال کے بارے میں کوئی عملی کاروائی نہیں ہے۔ میں اب اس بات کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں ایک لمحہ کیلئے بھی دستبرداری کے خیال کو برداشت نہیں کرونگا اور نتائج کو بھگتنے کیلئے مکمل طور پر تیار ہوں۔ اپنے وزیراعظم اور انکے ساتھیوں کی جانب سے اس قسم کی مانگ کو اس وعدہ کی واضح خلاف ورزی سمجھتا ہوں جس کی بنیاد پر وقتاً فوقتاً آئینی انتظامات عمل میں لائے جاچکے ہیں۔ اسے میں صریحاً بے وفائی، غداری اور دھوکے بازی سمجھوں گا۔

۲۔ شیخ عبداللہ کو واضح طور پر کہا جائے کہ میرے خلاف بدگوئی کی مہم بند کر دیں اور اپنی اور اپنے کارکنوں کی سبھی سرگرمیاں ترک کر دیں جن کا مقصد میری ..... دستبرداری حاصل کرنا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے

جو قربانیاں دینے کو کہا جا رہا ہے ان کا کوئی مقصد نہیں ہوگا اگر میں عوام میں یا پرائیویٹ طور پر ان کے حملوں کا نشانہ بنتا رہا۔

۳۔ مجھے اور میرے حمائیتوں کو کسی طرح ستایا نہ جائے۔ اس بارے میں تحفظ کی واضح یقین دہانی ہونی چاہئے اس سلسلہ میں، میں آپکی توجہ ان واقعات کی طرف مبذول کرانا چاہوں گا جو مجھے ان اشخاص کے بارے میں سنائے گئے جو جیل کے اندر زیر حراست رکھے گئے اور جنہوں نے میری دستبرداری کی مانگ پر دستخط کرنے سے انکار کیا۔

۴۔ یہ سوال کہ مجھے صحت کی وجوہات کی بناء پر تین یا چار مہینے کیلئے ریاست سے باہر رہنا چاہئے۔ مجھے ڈر ہے کہ اس پر کوئی بھروسہ نہیں کرے گا اور ممکن ہے کہ ریاست کے اندر اور ریاست سے باہر اس سے بہت سی غلط فہمیوں اور قیاس آرائیوں کو بڑھاوا مل جائے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ میری صحت ایسی نہیں جسکی وجہ ریاست سے باہر طویل آرام کی ضرورت ہو۔ حال ہی میں آپکے مشورہ پر اپریل کی گرمی میں، میں جموں صوبہ کا دورہ کرتا رہا ہوں۔ ہر اس شخص کے لئے جسکی صحت خراب

ہو۔ کشمیر کو بہترین صحت افزا مقام سمجھا جاتا ہے اور یہ لازمی طور پر عجیب دکھائی دے گا کہ اگر میں یہ کہوں کہ میں صحت کی وجوہات کی بناء پر ریاست سے باہر جا رہا ہوں۔

جہاں کہیں بھی میں اپنی عارضی رہائش اختیار کروں میں اپنے آپ کو چار دیواری تک محدود نہیں کر سکتا۔ لازمی ہے کہ میں لوگوں سے ملوں گا۔ جب وہ مجھ سے ملیں گے تو کبھی اس پر یقین نہیں کریں گے کہ میں یہاں صحت کی وجوہات کی بناء پر رہ رہا ہوں۔ کوئی دوسری وجہ جو بظاہر معقول ہو اور ساتھ ساتھ میرے وقار اور پوزیشن کو متاثر نہ کرے، ظاہر کی جانی چاہئے۔ بہترین یہ رہیگا کہ بھارت سرکار کو دہلی میں میرے لئے کوئی معقول پوزیشن تلاش کرنی چاہئے جہاں میری خدمات کو متذکرہ تین یا چار مہینوں کے وقفہ کے دوران موزون طریقہ پر کام میں لایا جائے۔

۵۔ یہ بے حد ضروری ہے کہ میری غیر حاضری کے دوران مہارانی یوراج کے ساتھ رہیں۔ یوراج چھوٹے ہیں اور جلد متاثر ہونے والے ہیں اور انہیں والدین کی رہبری یا کم از کم دو میں سے ایک کی ذاتی دیکھ بال درکار ہے۔ میرے خیال میں نہ تو سیاسی مصلحت اور

نا ہی انصاف کا تقاضا ہے کہ ایک ماں کو اس کے اکلوتے بیٹے سے علیحدہ رہنے پر اصرار کیا جائے جسکو وہ ملک کے باہر تیرہ ماہ کی غیر حاضری کے بعد دیکھ رہی ہے۔ انسانیت کا یہ تقاضا اس تجویز کو یکسر خارج کرنے کے لئے کافی ہونی چاہئے۔

۶۔ میری اسٹیٹ، مکانات اور دوسری جائداد کو شیخ عبداللہ کی جماعت کی جارحانہ حرکتوں سے تحفظ دیا جائے۔ وہ میرے مکانات، باغات زمین اور دیگر جائداد پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہند یونین کو اس حرکت کے خلاف گارنٹی دینی چاہئے۔ جب تک میں وہاں ہوں وہ یہ حرکتیں کرنے کی جسارت نہیں کر سکتے۔ لیکن میری غیر حاضری میں وہ اسکی کوشش کریں گے، یہانتک کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ پچھلے چند دنوں کے دوران، یعنی میرے جموں سے دلی آنے کے بعد سرینگر میں میری زمین میں مداخلت کیگئی ہے۔

۷۔ اسٹیٹ فورس سے متعلق موجودہ ترتیب یا آئینی حیثیت، بادشاہ کے اختیارات وغیرہ میں میری اجازت کے بغیر کوئی تبدیلی نہیں کی جانی چاہئے۔

یہ ترتیب جاری رہے کہ میں دونوں اسٹیٹ اور ذاتی
استعمال کے لئے اسٹاف کو اپنے فوجی افسروں میں
سے چنوں ۔ میرے فورسس کا پہرہ میرے محلات پر
موجودہ طریقہ پر جاری رہیگا جیسا کہ ۱۷ر اگست کے خط
اور مسٹر مینن کے ۳ ستمبر کے جواب میں طے پایا ہے ۔ ریاست
سے باہر جو کچھ اسٹاف وغیرہ کی مجھے ضرورت ہے، اسے
میں ساتھ لے لوں گا ۔

۸۔ ہندوستان میں اپنے قیام کے دوران میں
جہاں کہیں بھی رہوں مجھے یہ اختیار ہونا چاہئے کہ
میں مناسب مقدار میں فوجی محافظ رکھوں ۔

۹۔ یوراج کی سلامتی اور تحفظ ہندیونین کی ذمہ
داری ہونی چاہئے ۔ اسٹیٹ اور انڈین آرمی کو ان کا
پہرہ دینا چاہئے ۔

۱۰۔ ریاستی فوج، سیول لسٹ، حضوری محکمے وغیرہ
کے معاملات جو ابھی تک طے پانا باقی ہیں انہیں
میرے ساتھ فوراً طے کیا جانا چاہئے ۔

اختتام پر میں کہنا چاہتا ہوں کہ متذکرہ بالا
نقطوں پر آپ کی جانب سے یقین دہانی پانے پر میں
آخری فیصلہ کروں گا ۔

آپ کا بہت مخلص

ہری سنگھ

امپیریل ہوٹل، نئی دہلی ۔ ۶ر مئی ۱۹۴۹ء

پندرہ روز بعد ڈیرہ ڈون سے سردار پٹیل کا جواب آیا ۔

کیمپ، ڈون کورٹ
ڈیرہ ڈون
۲۳ر مئی ۱۹۴۹ء

پیارے مہاراجہ صاحب!

آپ کے ۶ر مئی ۱۹۴۹ء کے خط کیلئے شکریہ ۔
مجھے یہ جان کر بہت مسرت ہوئی کہ حضور نے اس تجویز
کو مان لیا ہے جو میں نے بات چیت کے دوران آپکے
سامنے رکھی تھی ۔ ایسا میں نے کوئی خوشی سے نہیں کیا ۔
آپ نے دستاویز الحاق پر دستخط کرتے وقت سے جو رویہ
اپنایا اس کے بارے میں مجھ سے زیادہ محرم کوئی اور نہیں
ہو سکتا ۔ میں حضور کے جذبۂ اشتراک اور میل ملاپ جو آپ
نے ہمیشہ میرے ساتھ روا رکھا اور ان مہربان جذبات جن
کا آپ نے اظہار کیا ہے، مشکور ہوں ۔ میں حضور کو یقین
دلا سکتا ہوں کہ اپنی تجویز سامنے رکھنے سے پہلے میں ہر

طرح کے سوچ وچار کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ آپ کا آپ کے خاندان اور ملک کے مفاد کا مساوی طور یہی تقاضا ہے کہ یہ قدم جسے آپ نے اب اتفاق کیا ہے، اٹھایا جائے۔ میں اچھی طرح ان ذاتی قربانیوں کو جانتا ہوں جو اس میں شامل ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ بہت ساری تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ جن کا حضور نے اپنے آپ کو عادی بنایا ہے، آپ اپنے ملک کے تئیں فرض شناسی اور واقعات کے عظیم تقاضوں کے خاموش جذبہ سپردگی کے پیش نظر یہ قدم اٹھائیں گے۔

حضور نے جو باتیں میرے سپرد کی ہیں، میں یہ کہنا چاہوں گا کہ حضور کی دستبرداری کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ ہم نے شیخ عبداللہ پر یہ پوزیشن بالکل واضح کر دی ہے اور ہمیں امید ہے کہ اس معاملہ پر جو بحث مرکوز ہے اسکے ساتھ حضور کی شان میں ریاست کے اندر اور عوامی سطح پر معیوب باتوں کے ذکر کا خاتمہ ہوگا

حضور بے شک اس بات کو سراہیں گے کہ ریاست کے مستقبل کے آئین کا تعین، آئین ساز اسمبلی کے باضابطہ منتخب ممبران کریں گے۔ مجھے افسوس ہے کہ کسی انتقام گیری جسکا آپ نے چوتھے پیرا میں

حوالہ دیا ہے، کے بارے میں میرے لئے آپکو کوئی یقین دہانی کرانا ممکن نہیں ہوگا لیکن میں حضور کو بتا سکتا ہوں کہ اگر اس قسم کے کوئی واقعات ہماری نوٹس میں لائے جاتے ہیں تو ہم انکی چھان بین کریں گے اور کوشش کریں گے کہ انصاف ہو۔

ریاست سے باہر رہنے کی وجوہات کے سلسلہ میں جو حضور فرما رہے ہیں، میں اسکی قدر کرتا ہوں لیکن میرے خیال میں بس اتنا کہنا کہ پچھلے کئی مہینوں کے کھنچاؤ اور متواتر ناسازیٔ طبیعت کی بناء پر حضور نے ریاست سے چند مہینوں کیلئے باہر رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ صحیح مدت بتانے کی ضرورت نہیں

آپکی غیر حاضری کے دوران مہارانی صاحبہ کا یوراج کے ساتھ رہنے کے سوال پر ہم نے بہت غور کیا لیکن بہت سی وجوہات کی بناء پر ہم محسوس کرتے ہیں کہ فی الحال ان کا بھی کچھ دیر کیلئے دور رہنا ہی بہتر رہیگا۔ بعد میں بیشک وقتاً فوقتاً یوراج کے پاس جا سکتی ہیں اور یوراج بھی کبھی کبھی آپ سے اور مہارانی صاحبہ سے ملنے جا سکتے ہیں۔

ہم حضور کے مشکور رہیں گے اگر آپ اپنے

سجی اسٹیٹ مکانات اور دیگر جائداد کی فہرست فراہم کریں گے۔ جسکا ذکر آپنے اپنے خط کے پیرا چھ میں کیا ہے فہرست موصول ہونے پر ہم یہ معاملہ آپکی منسٹری کیساتھ زیر بحث لائیں گے۔ مجھے امید ہے کہ اسی اثنا میں شیخ عبداللہ کے ساتھ' جن کئی متنازعہ معاملات پر سمجھوتہ ہوا ہے' اسکے پیش نظر وہ خود ہی حضور کی جائداد کو مداخلت بے جا سے تحفظ دیں گے۔ مجھے توقع ہے کہ یوراج کے تئیں جو احساسات شیخ عبداللہ کے ذہن میں ہیں' ان سے پچھلے کئی مہینوں کی تلخیوں کا خاتمہ کرنے میں۔۔۔ کامیابی ہوگی اور گورنمنٹ اور نیشنل کانفرنس کے رویئے میں جو اس طرح اور دیگر معاملات جو آپکے' آپکے افراد خانہ اور عام طور سے شاہی وراثت کو متاثر کرتے ہیں' ایک خوشگوار تبدیلی کا آغاز ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ آپ نے اپنے خط کے پیرا سات میں جس تبدیلی کا خدشہ ظاہر کیا ہے اسکی نوبت نہیں آئیگی لیکن اگر کوئی ضرورت پیدا ہوئی تو ہم بیشک آپ سے صلاح و مشورہ کریں گے۔ ہندوستان میں قیام کے دوران ہم آپکی حفاظت کیلئے ضروری انتظامات کریں گے اور ہم یوراج کے تحفظ کی پوری ذمہ داری لیتے ہیں۔

باقی تصفیہ طلب معاملات کے بارے میں ہم نے الگ سے آپ کو مطلع کیا ہے۔ یہ کہ آپکی سول لسٹ پندرہ لاکھ مقرر کیگئی ہے جس میں سے چھ لاکھ ریاست دیگی اور باقی ایمرجنسی کے دوران بھارت سرکار ادا کریگی۔ اس رقم میں سے آپکو مہارانی صاحبہ اور یوراج کو بھی خرچہ دینا ہوگا۔ یوراج کے اخراجات پہلے کی نسبت بحیثیت۔۔۔ ریجنٹ زیادہ ہونگے۔ مجھے توقع ہے کہ یوراج کی ضروریات کو ذہن میں رکھتے ہوئے آپ انہیں مناسب وظیفہ دیں گے۔ اس بارے میں آپکی تجویز جان کر مجھے خوشی ہوگی۔ اسی طرح' مہارانی صاحبہ کے وظیفہ کے بارے میں حضور کی تجویز کا میں خوش آمدید کرونگا۔ جہاں تک محکمۂ حضور کا تعلق ہے' شیخ صاحب پہلے ہی ہماری تجویز مان چکے ہیں کہ آپ کو اس مقصد کیلئے پانچ لاکھ کا الاؤنس دیا جائے۔ ہم نے شیخ صاحب کو ان چیزوں کی فہرست بھیجدی ہے جن پر آپکا کنٹرول رہیگا اور آپکی غیر حاضری میں یوراج کا بحیثیت ریجنٹ کنٹرول رہیگا۔ اور انہوں نے وعدہ کیا ہے جتنی جلدی ممکن ہوسکے گا ہمیں اپنی رائے سے مطلع کریں گے۔ انکی رائے موصول ہونے کے بعد ہم پورے معاملہ کو قطعی طور پر طے کریں گے۔

لیکن درین اثناء آپ محکمۂ اسٹیٹ کے بڑے اور دوسرے شعبوں کے اخراجات پر پانچ لاکھ کے حصّے میں سے مناسب رقم کا تعین کر سکتے ہیں۔

نیک ترین خواہشات کے ساتھ

آپ کا مخلص
ولبھائی پٹیل

سردار پٹیل نے اسی روز اس خط کی ایک نقل جواہر لعل نہرو کو بھیجی۔ اس نقل کے ساتھ بھیجے گئے مراسلہ میں یہ پیرا شامل تھا۔

"جہاں تک یوراج کا سوال ہے، میں نے انکے ساتھ تفصیلی بات چیت کی ہے اور انہیں طے شدہ سمجھوتہ کی اہمیت اور افادیت اور اس سے ظاہر ہونے والے نتائج ذہن نشین کرائے۔ وہ ایک سمجھدار لڑکا ہے اور میرے خیال میں انہوں نے صورتحال بہت اچھی طرح سے سمجھی اور وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہیں۔ بیشک وہ ابھی کمسن ہیں اور انکو رہنمائی کی ضرورت ہوگی۔ میں ان کیلئے ایک معقول صلاح کار کی تلاش میں ہوں، جنکے مشورہ پر وہ بھروسہ کر سکتے ہیں۔ ہمیں ایک معقول شخص کا انتخاب کرنے میں بہت محتاط رہنا ہوگا"

اس خط وکتابت کے بعد ہم سب سردار پٹیل کی تجویز پر ڈیرہ ڈون چلے گئے۔ جہاں وہ آرام کر رہے تھے۔ یہاں میرے والدین نے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ لیکن پٹیل صاحب کی خاص دعوت پر میں سرکٹ ہاؤس (جو ڈون کورٹ کے نام سے مشہور تھا اور جو ایک وسیع اسٹیٹ میں تعمیر کیا گیا تھا۔ جہاں خوبصورت پھول، درخت اور جھاڑیاں تھیں) میں تین ہفتہ تک ان کا مہمان رہا ظاہر ہے کہ انہوں نے اور جواہر لعل نہرو نے فیصلہ کیا تھا کہ نئی ذمہ داریوں کو سنبھالنے سے پہلے میرے لئے پٹیل صاحب کے ساتھ کچھ وقت کیلئے قیام کرنا مفید رہے گا۔ اس دوران سردار پٹیل کی صحت خراب تھی اور انکی بیٹی مینی بن متواتر بڑی سعادت مندی سے انکی خدمت کر رہی تھیں۔ اکثر وہ کھانا اپنے کمرہ میں ہی تناول کرتے تھے لیکن بعض اوقات مجھے بلا لیتے اور کشمیر کے بارے میں گفتگو کرتے۔ اگرچہ انکے یہاں جواہر لعل نہرو جیسا جوش وخروش نہ تھا تاہم وہ مکمل اعتماد کے ساتھ بولتے تھے جو بہت ہی متاثرکن تھا۔ آدمی محسوس کرتا تھا کہ سردار پٹیل ایک ایسے شخص تھے جن کیلئے کسی بھی معاملہ سے نپٹنا زیادہ دشوار نہ تھا۔ کشمیر کا واحد مسئلہ تھا جسے جواہر لعل نہرو خود نپٹ رہے تھے جسپر سردار پٹیل ناخوش تھے۔ حالانکہ انہوں نے میری موجودگی میں جواہر لعل کی کبھی نکتہ چینی نہیں کی لیکن انکی گفتگو سے یہ

عیاں تھا کہ انہیں پنڈت جی کے شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ خصوصی تعلقات پسند نہ تھے۔ شیخ محمد عبداللہ پر وہ صریحاً اعتماد نہیں کرتے تھے اور نہ انکو پسند کرتے تھے۔

ڈیرہ ڈون میں قیام کے دوران ڈون اسکول کو دیکھ سکا جس کو میں تین سال پہلے چھوڑ چکا تھا۔ اس اثناء میں میں چھڑی کے سہارے کے بغیر چل رہا تھا حالانکہ لنگڑی چال میری باقی ماندہ زندگی کا حصّہ بن چکی تھی۔ اسکول میں دوبارہ آنا اور کمروں اور میدانوں کو پھر سے دیکھنا جہاں میں نے بحیثیت ایک طالب علم کے کئی برس گذارے تھے، عجیب سا لگ رہا تھا۔ مسٹر فٹ انگلینڈ واپس چلے گئے تھے اور جے۔ اے۔ کے مارٹن ہیڈ ماسٹر تھے جیک سن نے مجھے ایک مدّت سے بچھڑے دوست کی مانند خوش آمدید کہا جو اس وقت بھی کشمیر ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر تھے۔ اور ہم نے ان کے کا ٹیج پر شطرنج کھیلا۔ ہفتے کو میں مسوری چلا گیا۔ یہاں ہم نے زیادہ وقت لکشمی نواس برلا اور انکے گھر والوں کے ساتھ گذارا، جو سردار پٹیل اور وی۔ شنکر کے قریب تھے۔

میرے والدین دلّی پہلے لوٹے اور میرے آنے تک یہ فیصلہ کیا جا چکا تھا کہ میرے والد مجھے ریجنٹ مقرر کریں گے اور یہ کہ میں ۲۰ جون کو سرینگر اپنی نئی ذمّہ داریاں سنبھالنے کے لئے روانہ ہو جاؤں گا۔ مجھے پتہ چلا کہ میری والدہ بھی با دلِ ناخواستہ

ریاست چھوڑنے پر آمادہ ہوئی تھیں۔ لیکن چونکہ وہ بمبئی کی گرمی برداشت نہیں کر سکتی تھیں اسلئے وہ کسولی جائیں گی۔ میرے سرینگر جانے سے پہلے ایک کام کرنا باقی رہ گیا تھا۔ میری والدہ ایک کٹر ہندو تھیں انہوں نے اصرار کیا کہ سیکھل کی رسم ادا کی جانی چاہئے۔ یہ رسم ۵ ہاسٹنگس روڈ پر جہاں مہر چند مہاجن رہتے تھے، انجام دی گئی۔ پنڈت جموں سے آگئے اور میرے والد کے دو نوجوان راجپوت نوکر بھی میرے ساتھ اس رسم میں شریک ہوئے۔ ہم نے دھوتیاں پہنیں لیکن راج پنڈت کے اصرار کے باوجود میری تیز طراز احتجاج نے مجھے سرمنڈائی سے بچایا، جیسا کہ ایسے موقعوں پر کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس رسم کو پورا کرنے کیلئے بالوں کا ایک گچھا کاٹا گیا۔ مجھے اس صورتحال سے بچایا گیا جس سے ایک جوگی کی شکل میں مجھے جموں و کشمیر کی ریجنسی سنبھالتے وقت دوچار ہونا پڑا۔

۱۹ جون کی رات کو میں مشکل سے سو سکا۔ میرا ذہن متضاد جذبات اور خیالات میں منتشر ہو رہا تھا۔ میں ایک نازک کام میں شامل ہونے والا تھا جو خوف اور خطرات سے پُر تھا۔ اس صورت حال کے بارے میں میرے والد نے اپنی ناراضگی پوشیدہ نہیں رکھی تھی، حالانکہ وہ ناگزیر حالات کے سامنے جھک گئے تھے لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس کاروائی کے دوران ہمارے تعلقات کھٹائی میں پڑ گئے میری والدہ بھی خود بخود دور جا رہی تھیں، یہ بات بھی تمام

صورتحال کی جذباتی غیر استقامت کو مزید تقویت بخش رہی تھی۔ جواہر لعل نہرو کی حمایت کے بغیر میرے پاس کوئی اور سہارا نہ تھا۔ جسپر میں بھروسہ کرتا اور میرے پاس کوئی ایسے وسائل بھی نہیں تھے جن سے میں اس نازک موڑ پر ہمت حاصل کر سکتا تھا۔ ۲۰ جون ۱۹۴۹ئہ میری زندگی کا ایک تاریخی دن تھا۔ میرے والد، ان کا سٹاف اور نوکر صبح سویرے بذریعہ ریل بمبئی کیلئے روانہ ہوئے۔ اسکے فوراً بعد میری والدہ، ماموں اور نوکرانیاں موٹریں کاسولی کیلئے روانہ ہوئیں میں ماضی کے بوجھ اور مستقبل کی ذمہ داریوں کے درمیان توازن برقرار رکھتے ہوئے آدھا گھنٹہ تک تنہا ہوٹل کے کمرہ میں بیٹھا رہا۔ انسان کی زندگی میں نازک لمحات، جو ہمیشہ اسکی یادداشت میں محفوظ رہتے ہیں، یہ لمحات ان ہی میں سے تھے۔ کافی کوشش کے بعد میں نے حوصلہ سے کام لیا اور ہوٹل سے اپنے اسٹاف افسر کے ہمراہ باہر نکل آیا۔ ہم سیدھے کار میں صفدر جنگ ہوائی اڈہ چلے گئے۔ جہاں ایک ڈی، سی-۳ ہوائی جہاز مجھے سرینگر پہنچانے کیلئے منتظر تھا۔ میرے ساتھ چلنے کو وزیر اعظم نے وشنو سہائے کشمیر معاملات کے سکریٹری جو ایک بزرگ آئی۔ سی۔ ایس آفیسر تھے، تعینات کر دیا تھا

روانگی سے پہلے اسی صبح میرے والد نے ایک مختصر اور پراسرار حکمنامہ پر دستخط کئے تھے۔ چونکہ میں نے صحت کی بناء پر عارضی طور پر ریاست چھوڑنے اور یوراج کرن سنگھ بہادر کو اس دوران ریاست کی حکومت

سے متعلق اپنے سبھی اختیارات اور کام کاج کو سونپنے کا فیصلہ کیا ہے لہٰذا اب میں نتیجہ کے طور پر ہدایت دیتا ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ تمام اختیارات اور فرائض، چاہئے قانون سازیہ کے ہوں، انتظامیہ یا عدلیہ کے ہوں، جو ریاست اور اسکی سرکار کے سلسلہ میں میرے ذمہ ہیں، جس میں خاص طور سے میرا قانون بنانے کا حق، قطعی اختیار، حکم نامے جاری کرنا اور مجرموں کو معاف کرنا شامل ہے، میری ریاست سے غیر حاضری کے دوران یوراج کرن سنگھ بہادر کے حدِ اختیار میں ہوں گا۔

ہری سنگھ

مہاراجہ دھیراج

جب جہاز نے اڑان بھری تو مجھے خیال آیا کہ میری زندگی کے دو نازک واقعات اس ہوائی اڑان سے منسلک رہے ہیں۔ مجھے امریکہ کیلئے بحیثیت ایک معذور پرواز کرنے اور پھر حیرت انگیز طور پر خاموش استقبال کے ساتھ ہندوستان لوٹنے کا واقعہ یاد آیا۔ ایک بار پھر میں تقریباً ایک نامعلوم سفر پر روانہ تھا۔ بیشک وادی سے میں اچھی طرح سے واقف تھا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ جس کشمیر میں اب میں جا رہا تھا وہ اس کشمیر سے بہت ہی مختلف تھا۔ جسکو میں پہلے جانتا تھا۔ حالانکہ میں بحیثیت ریاست کے سربراہ جا رہا تھا لیکن حقیقت میں یہ شیخ محمد عبداللہ کے منشاء کے اوپر تھا جنکے پاس مؤثر اقتدار تھا۔ اپنے ترش قسم کے موڑ میں، دوپہر کے کھانے پر میرے

والدہ نے کہا تھا کہ اگر میں بحیثیت ریجنٹ چلا بھی جاؤں، شیخ محمد عبداللہ مجھے چند مہینوں میں بے عزتی کے عالم میں رو کھے پن سے نکال باہر کریں گے۔ جسپر میری والدہ چڑ گئیں۔ حالانکہ اس سنگین پیشگوئی پر مجھے بھی ناراضگی ہوئی لیکن جب میں نے پچھلے چند برسوں کے سیاسی اتار چڑھاؤ پر غور کیا، تو میں اس اندیشے کو آسانی سے جھٹلا بھی نہیں سکتا تھا۔

ہمیں براہ راست سرینگر کیلئے پرواز کرنا تھا لیکن خراب موسم اور اس زمانہ میں دقیانوسی سہولیات کیوجہ سے ہمیں جموں میں اترنا پڑا اور آگے کا سفر جاری رکھنے سے پہلے ہم وہاں تین گھنٹے رُکے رہے۔ جب جہاز نے جموں سے پرواز بھری تو ہم گھرے بادلوں میں گھر گئے۔ ہمارے بانہال کا درّہ پار کرنے پر ہی بادل چھٹ گئے، اور کشمیر کی وادی ہمارے سامنے پھیلی ہوئی تھی جو اس خوبصورتی سے چمک رہی تھی جسکو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ایک نایاب موتی کیطرح جو عظیم ہمالیہ میں پیوست تھا۔

باب ۹

سرینگر کے ہوائی اڈہ پر شیخ محمد عبداللہ اپنی پوری کابینہ اور سینئر افسروں کے ساتھ میرا استقبال کرنے کیلئے آئے ہوئے تھے شیخ صاحب مجھے زینہ کی آخری سیڑھی پر ملے اور اسکے بعد مجھے اپنے ساتھیوں سے متعارف کرایا۔ اس وقت کابینہ درجے کے نو وزیر تھے، جن میں اہم نائب وزیر اعظم بخشی غلام محمد، جو شیخ صاحب کی پارٹی کے خاص منتظم تھے اور عیّار وزیر مال مرزا محمد افضل بیگ تھے۔ جو کچھ برس پہلے میرے والد کے تحت خود مختار حکومت کے مختصر تجربہ کے دوران وزیر رہ چکے تھے۔ غلام محمد صادق۔ گردھاری لال ڈوگرہ، شام لال صراف، کرنل پیر محمد اور سردار بدھ سنگھ کابینہ میں شامل تھے جبکہ داڑھی والے مولانا مسعودی نیشنل کانفرنس کے جنرل سکرٹری تھے۔

استقبال کے بعد ہم سب بذریعہ کار کرن محل چلے گئے۔ کئی برس بعد مختلف حالات میں اس گھر میں واپس آنا کتنا ولولہ انگیز تھا جہاں میں نے بچپن کا بیشتر وقت گذارا تھا۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ موٹر سے اُتر کر میں خوبصورت بنگلے میں شگفتگی اور مشکوک احساسات لئے داخل ہو رہا تھا۔ باغ پھولوں سے مہک رہا تھا۔ جھیل کے اس پار سے ٹھنڈی ہوا آرہی تھی۔ دہلی میں شدید گرمی تھی اور محض گرمی سے دور بھاگنا ہی ایک بہت بڑی راحت تھی۔ وشنو سہائے نے جو عارضی طور بحیثیت صلاح کار کام کر رہے تھے، دہلی واپس لوٹنے سے پہلے سرینگر میں پندرہ روز تک بنگلہ کے قریب سڑک کے پار گیسٹ ہاؤس میں قیام کیا۔ وہ ایک قابل شخص تھے۔ ان کے مشاہدات باشعور اور شور شرابے سے مبرا ہوتے تھے۔ اور میرے ریجنٹ بننے کے اوائل ایام میں ہر چیز کو جذباتیت اور دھوم دھام کے بغیر مناسب جگہ پر رکھنے میں وہ میرے لئے مددگار ثابت ہوئے۔

حالانکہ اپنی نئی حاصل شدہ آزادی سے میں لطف اندوز ہو رہا تھا لیکن میں نے اچھی طرح سے محسوس کیا کہ درحقیقت میں ایک مشکل صورت حال سے دوچار تھا۔ شیخ محمد عبداللہ پوری سیاست پر چھائے ہوئے تھے اور جواہر لعل نے خاص طور سے مجھے ان کے ساتھ تال میل سے کام کرنے کو کہا تھا۔ جسمانی طور ایک متاثر

کن شخصیت کے حامل شیخ صاحب اس وقت اقتدار کے عروج پر تھے۔ وقتاً فوقتاً آکر وہ مجھے سیاسی صورت حال پر لمبی تقریریں سناتے۔ انہوں نے براہ راست میرے والد کا کبھی ذکر نہیں کیا اور میں نے دیکھا کہ انہوں نے میرے ساتھ کچھ حقیقی دوست کا سا برتاؤ کیا۔ میں واقف تھا کہ حالت عجیب سی تھی اور ایک طرح سے میری آزمائش سی ہو رہی تھی۔ میرے والد اصل میں میرے ریجنٹ بننے پر خوش نہ تھے اور جموں کے ڈوگرہ عوام نے بھی اپنے طور پر بیزارگی کا اظہار کر کے اسے نامنظور کیا تھا۔ اسلئے سبھی حرکات و سکنات میں مجھے کوشش کر کے درمیانی راستہ اختیار کرنا تھا۔ یعنی ایک طرف مجھے شیخ محمد عبداللہ کا تابعدار دکھائی دینا تھا اور دوسری طرف انکو اور جواہر لعل نہرو کو ناراض کرنا تھا۔

اسی اثناء میں بہت سارا دلچسپ کام کرنا باقی تھا۔ مسئلہ کشمیر سلامتی کونسل میں بہت زور و شور سے چل رہا تھا۔ اس دوران فرانس کے ایک شخص جنرل ڈلوائی کی قیادت میں سرینگر میں تعینات اقوام متحدہ کے مبصرین اور نمائندوں کو بہت اہمیت دیجاتی تھی۔ ان مبصرین کا تعلق یورپ اور جنوبی امریکہ کے ممالک سے تھا اور کئی مبصرین عیال بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔ کئی جگہوں پر دعوتیں ہوتی تھیں جن میں شاندار اور حاضر جواب ڈیویژنل کمانڈر جنرل ٹی۔ ایس۔ تھمیا اور انکی اہلیہ نینا کا گھر بھی شامل تھا۔ ٹمی بہت پُر مذاق تھے اور ان

سے خوبصورتی اور دلکشی ٹپکتی تھی۔ فوجی جوان انکی قدر کرتے تھے اور سول انتظامیہ میں بھی وہ ہر دلعزیز تھے۔ سرینگر میں قدم جمانے کے فوراً بعد میں انکے ساتھ جنگ بندی لائن پر واقع چند سرحدوں پر گیا۔ میں نے دس ہزار فٹ اونچا درہ ناشتا چور پار کیا اور ٹنگڈار اور ٹیٹوال کا دورہ کیا یہ کشمیر وادی سے آگے وسیع ہمالیہ کی میری پہلی سیر تھی۔ ساتھ ہی یہ ایک ناقابل فراموش تجربہ تھا۔ اپنے سرینگر کے بنگلے سے پہاڑوں کو دیکھنا الگ چیز تھی لیکن انکے درمیان ہونا ایک الگ ہی سنسنی تھی۔ فضا تر و تازہ تھی اور ہوا عظیم دیو داروں کے بیچ جن سے بیشتر علاقہ گھرا ہوا ہے لگاتار پھڑ پھڑا رہی تھی۔

ٹمی بہت ہی پُر جوش تھے۔ ہماری جیپ خود چلا رہے تھے۔ اور ہمیں حملہ آوروں سے اس علاقہ کو صرف ایک سال پہلے خالی کرانے کی لڑائی کے بارے میں تفصیلی منظر کشی کے ذریعہ محظوظ کر رہے تھے۔ فوجی جسمانی طور پر عمدہ حالت میں تھے اور ہم کو دیکھ کر واقعی خوش لگ رہے تھے۔ ہندوستانی فوجی جوان جو بہت مشکل حالات میں رہتے ہیں، جن سے میری بیشمار ملاقاتیں رہی ہیں ان میں یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی اور میں کبھی انکے فرض کے تئیں جذبۂ پرستش اور ماحول سے سمجھوتہ کرنے کی پُر اسرار صلاحیت سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ فوج اور سول آبادی کے درمیان دوستی بھی متأثر کن تھی۔ درہ کے پار لوگ کشمیری بولنے کے بجائے پنجابی بولتے ہیں۔ حالانکہ

انکے مقبوضہ کشمیر کے ساتھ جسمانی اور نسلی قربت کے باوجود مجھے ان میں دشمنی یا ناراضگی کے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ دراصل میں ڈوگرہ شاہی خاندان کا ان علاقوں کا دورہ کرنے والا پہلا فرد تھا اور انہوں نے بہت محبت سے میرا استقبال کیا۔ بعد میں ہم نے زوجیلا درہ اس پار بھی ایسا ہی دورہ کیا۔ جہاں ایک تاریخی فوجی مشق میں جس کی مشابہت اکثر نیپال کے ہاتھیوں کے الپس کو پار کرنے سے کی جاتی ہے۔ ٹمی نے بنی نوع انسان کی تاریخ میں پہلی بار اتنی اونچائی پر ٹینک پہنچائے تھے اور حیرت زدہ حملہ آوروں کو زبردست شکست دی تھی۔ زوجیلا کی دوسری طرف ہم ایک رات کے لئے ایک چھوٹے گاؤں دراس میں رہے جسکے بارے میں یہ خیال ہے کہ یہ انسان کی قدیم ترین سکونت کی جگہوں میں سے ایک ہے۔

اس دوران میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جس نے میری سیاسی زندگی میں ایک اہم رول ادا کیا۔ جن کا نام درگا پرشاد دھر تھا۔ خوبصورت، نرم طبیعت اور ہونہار ڈی۔ پی کشمیر کے ایک پنڈت گھرانے کا نوعمر فرزند تھا لیکن بہت پہلے وہ نیشنل کانفرنس کے ساتھ وابستہ ہوئے تھے۔ حالانکہ وہ محض نائب وزیر تھے۔ اکثر انکو شیخ محمد عبداللہ کی سرکار میں مشیر مانا جاتا تھا۔ فوج اور عوام کے درمیان تعلقات استوار کرانے میں وہ ماہر تھے اور انہوں نے ریاستی سرکار اور بھارت سرکار کے درمیان ایک رابطہ کے طور پر

کام کیا۔ وہ ایک قابل تعریف ذہن کے مالک تھے۔ جس کو وہ ٹھوس فتوحات کی راہ کے بجائے بیشتر شوخ قسم کی حکمت کے کام میں لائے۔ وہ دوسرے وزیروں سے کمعمر تھے اسلئے میری انکے ساتھ اچھی نبھتی تھی۔ یہ دوستی چار سال بعد کے آنیوالے ہنگامی وقت میں سودمند ثابت ہوئی۔

۱۹۴۹ء کی گرمیوں کے دوران جواہر لعل دوبار سرینگر آئے اور میں دوبار دہلی گیا اور انکے ساتھ تین مورتی ہاؤس میں قیام کیا۔ وہ عمدہ میزبان تھے اور اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود مہمانوں کے بارے میں دریافت کرنے کے لئے وقت نکالتے تھے۔ ہم اکثر کھانے پر ملتے تھے۔ یہیں میری پہلی ملاقات گووند بھلہ پنتھ سے ہوئی جو دریائی گھوڑے جیسی مونچھوں والے ایک لحیم شحیم شخص تھے۔ جن کا ہلتا ہوا سر انکے زیرک ذہن کو جھٹلاتا تھا اور یہیں پہلی بار میری ملاقات ہونق قسم کے کرشنا منن سے ہوئی۔

پدما جانائیڈو بھی اسی گھر میں رہتی تھیں جو متواتر خراب صحت کے باوجود عمدہ مذاق اور زندہ دلی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ جواہر لعل نہرو کے انتقال کے کئی برس بعد وہ ہماری ایک قریبی دوست بنیں اور ہمیں پتہ چلا کہ وہ ایک غیر معمولی، پُرجوش اور شفیق شخصیت تھیں۔ جہاں تک جواہر لعل نہرو کا تعلق تھا تو انکی جسمانی اور ذہنی برجستگی نے مجھے ہمیشہ متأثر کیا۔ جب وہ کمرہ میں داخل ہوتے تھے تو ایسا

لگتا تھا جیسے طاقت کی ایک لہر جسم کے اندر چلی گئی ہو۔ وہ چھلانگیں مارتے ہوئے چلتے تھے جیسے کہ کسی بھی وقت بھاگنے کیلئے تیار ہوں، تاہم جب وہ صوفہ پر بات چیت کیلئے بیٹھ جاتے تو ان کا چہرہ سنجیدہ ہو جاتا تھا اور ایک عجیب افسردگی انکے خوبصورت چہرہ پر بکھر جاتی تھی۔ وہ دلکش انداز میں بولتے تھے۔ ہر لفظ خطابت کے انداز میں، نرم اور مہذب لہجہ میں ادا کرتے تاہم ان کا تبسم بہت یاد رکھنے کے قابل تھا جو افسردہ اور عجیب ڈھنگ سے پُرکشش تھا۔

اس دوران موسم سرما میں، میں نے ان مقامات کی دوبارہ سیر کی جہاں بچپن میں ہم جایا کرتے تھے۔ خاصکر داچھی گام اور ترکر کی میں نے کچھ شکار کھیلا اور مچھلیاں پکڑیں اور سیر پر آئے ہوئے معززین اور مقامی دانشوروں کو میں نے متعدد بار طعام اور چائے کی دعوتیں دیں۔ میں محض اٹھارہ برس کا ہو چکا تھا لیکن پہلی بار اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کیوجہ سے پُراعتماد اور ولولہ انگیز جذبات سے مغلوب تھا۔ میں وادی میں بہت سارے ہندو تیرتھوں پر گیا جہاں میرے والد شاید ہی کبھی گئے ہوں۔ انکی مذہب سے دلچسپی زیادہ تر رسمی رہتی تھی لیکن ماں کی تقلید کرتے ہوئے میں کام کے چکر میں پڑنے سے پہلے ہر روز پابندی سے کچھ پوجا کرتا تھا اور اسطرح میرے اندر مندروں اور تیرتھوں سے متعلق دلچسپی پیدا ہوئی۔

ایک دفعہ ایک واقعہ رونما ہوا جو کھیر بھوانی کے

مشہور تیرتھ سے منسوب ہے۔ جس نے آنے والے تناؤ کا قبل از وقت اشارہ دیا، اور جہاں سالانہ میلہ جون کے ایک خاص مبارک دن منعقد ہوا۔ پنڈت پرمانند کی قیادت میں جو بڑے ہی ایماندار اور قابل افسر تھے اور حال ہی میں اکاؤنٹنٹ جنرل کے عہدہ سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ کشمیری پنڈت بہت بے چین تھے کہ مجھے اس موقع پر تیرتھ کو جانا چاہیے۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ شیخ محمد عبداللہ کے سیکولر اعترافات کے باوجود' کمزور پنڈتوں کی اقلیت نئے نظام کے تحت زیادہ خوش نہ تھی۔ میں نے بخوشی جانا مان لیا اور میرے دورے کا اعلان کیا گیا۔ اسکے فوراً بعد مجھے پیغام ملا کہ یہ بہتر رہیگا اگر میں اس دن وہاں نہ جاؤں۔ اس بات نے مجھے عجیب صورت حال میں مبتلا کر دیا لیکن میں نے پنڈتوں سے وعدہ کیا تھا اور میں نے محسوس کیا کہ میں انکو ذلیل نہیں کر سکتا تھا۔ تیرتھ گاہ پر جہاں ہزاروں لوگ جمع ہوئے تھے' میرا زبردست استقبال کیا گیا۔ بزرگ عورتوں نے مجھے گلے لگایا اور میری پیشانی کو چوما۔ ایسا وہ صرف انکے ساتھ کرتی تھیں جو انہیں بہت عزیز ہوں۔ مجھے مقدس تالاب کے گرد پوجا کرنے میں تین گھنٹے لگے۔ اس دوران وقتاً فوقتاً پانی کا رنگ پُراسرار طور پر تبدیل ہوتا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ پانی کا رنگ پیشین گوئی کرتا ہے اور سیاہ رنگ بدشگونی کی علامت ہے۔ یہ ایک عجیب سی حقیقت ہے کہ

پاکستانی حملہ کے مہینوں پہلے پانی کا رنگ بالکل سیاہ پڑ گیا تھا اور یہ کہ اس علاقہ میں تیرتھ کئی مہینوں حملہ آوروں کے قبضہ میں رہا۔ جنہوں نے ہندوؤں' سکھوں اور عیسائیوں کی دوسری سبھی عبادت گاہوں کو تباہ کیا تھا۔ لیکن کھیر بھوانی میں ایک پتّے کو بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ جتنی دیر میں وہاں رہا' فضا خوش آمدید کے نعروں سے گونجتی رہی' جن میں ڈوگرہ راج زندہ باد کے نعرے بھی شامل تھے۔ حالانکہ شیخ محمد عبداللہ نے میرے سامنے کبھی اس معاملہ کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن مجھے معلوم ہوا کہ میرے وہاں جانے سے بہت پریشان ہوئے تھے۔ کشمیر کا شیر کسی حریف کو کیسے برداشت کر سکتا تھا حالانکہ میں ابھی چیتے کا بچّہ ہی تھا۔

پنڈت پرمانند کا میرے اوُپر یہ بھی احسان ہے کہ انہوں نے مجھے سنسکرت سے متعارف کروایا تھا۔ میں نے اس شاندار زبان کا ایک بھی لفظ کالج یا اسکول میں نہیں پڑھا تھا۔ یہ پنڈت پرمانند تھے جنہوں نے مجھ سے اصرار کیا کہ مجھے سنسکرت سیکھنا شروع کرنا چاہیئے۔ اور وہ ہفتہ میں مجھے تین بار کچھ آسان شلوک پڑھانے آئیں گے۔ پس انگریزی ہی کی طرح میں نے سنسکرت گرائمر کے بجائے سن کر سیکھی اور جلدی ہی مجھے معلوم ہوا کہ غیر ضروری دشواری کے بغیر میں کتاب کے ٹکڑے یاد کر سکتا تھا اور انہیں زبانی بیان کر سکتا تھا۔ اس کی وجہ

سنسکرت کے شلوک کی شاندار سنگیت اور مواد کی خوبی میں پوشیدہ ہے۔ چاہئے ویدوں سے متعلق عظمت ہو، اُپنشدوں کی شاندار عقلمندی ہو، بھگوت گیت کی لافانی تعلیمات ہوں یا آدی شنکر اچاریہ کے عالیشان بھجن ہوں۔

اس اثناء ایک اور واقعہ نے میری آئندہ زندگی پر ایک اہم اثر ڈالا۔ سرینگر آنے کے فوراً بعد میں نے سوچا کہ تعلیمی دنیا سے دوبارہ رابطہ قائم کرنا بہتر رہیگا۔ میں نے شعبہ تعلیم کے ڈائرکٹر سے کسی عالم کے نام کی تجویز کرنے کو کہا جو میرے پاس پابندی سے آکر موجودہ اقتصادی اور سیاسی معاملات پر بحث کرے۔ انہوں نے پروفیسر چکّو کو بھیجا جن کے ساتھ میں نے فوراً اسودہ مندمیل جول پیدا کیا۔ پروفیسر چکّو ایک باکمال دانشور تھے اور انہوں نے مجھے بہت سارے اہم سیاسی اور اقتصادی تصورات سے متعارف کروایا، جن میں اقتصادیات کے میدان میں کینس کے خیالات، سیاست میں لاسکے اور ترقی پذیر اقتصادیات میں مارکس کے خیالات شامل تھے۔ تصورات کی دنیا میں، میں نے دوبارہ، حق بجانب دلچسپی پائی۔ اور میں نے وسیع پیمانے پر پڑھنا شروع کیا۔ اس وقت کے مصنفوں، برٹرن رسل اور اڈلس ہکسلے نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ رسل کی نیم شفاف نثر اور ہکسلے کی تصوراتی تحریر

نے میرے اوپر گہرا اثر ڈالا۔ بطور مدّاح میں نے ان عظیم مصنفوں کو خطوط لکھے۔ میرے پاس اب بھی انکے جوابی خطوط محفوظ ہیں۔ اور کچھ معاملات میں اختلافات کے باوجود میرا انکے تئیں احترام بدستور قائم ہے۔

بحیثیت ریجنٹ میں نے اپنے والد کے جموں و کشمیر فورسس کے نام و نہاد کمانڈر کی جگہ لے لی۔ اس دوران حقیقت میں یہ فوجیں انڈین آرمی کا حصّہ بن چکی تھیں تاہم ان بہت ساری ریاستی فوجوں کے برعکس جنہوں نے انڈین یونین کے ساتھ الحاق کیا تھا، ہماری فوج باضابطہ طور مدغم نہیں ہوئی تھی اور اسکی علیحدہ حیثیت باقی تھی۔ بے شک کمانڈر انچیف کا عہدہ محض رسمی تھا جس کا کام صرف وقتاً فوقتاً کچھ کاغذات پر دستخط کرنا تھا۔ نئی قائم شدہ یونیورسٹی کا چانسلر کا عہدہ بھی رسمی تھا لیکن اسکے ساتھ مجھے زیادہ دلچسپی تھی اور بحیثیت ریاست کے سربراہ میں نے یہ اعزازی عہدہ سنبھالا۔ سنہ ۱۹۴۷ء سے پہلے ریاست کے تعلیمی ادارے پنجاب یونیورسٹی جو لاہور میں قائم تھی، کے ساتھ منسلک رہے تھے لیکن ملک کی تقسیم کے بعد ریاست کے اندر ایک الگ یونیورسٹی کی فوری ضرورت محسوس کی گئی۔ اس کا قیام ایک آرڈیننس کے ذریعہ جسے میرے والد نے سنہ ۱۹۴۸ء میں جاری کیا کیونکہ اس وقت ریاست میں کوئی قانون سازیہ نہ تھی۔

عمل میں لایا گیا۔ نئی یونیورسٹی کا پہلا کنووکیشن ۲۴ ستمبر ۱۹۴۹ء کو سرینگر میں منعقد ہوا جسکی صدارت میں نے بحیثیت چانسلر کی جواہر لعل نہروؔ اس تقریب کیلئے سرینگر تشریف لائے۔ میں نے انکو اپنے خطبہ صدارت کی ایک نقل پیشگی بھیجی تھی اور ۱۱ ستمبر کے ایک خط میں انہوں نے مجھے لکھا۔ "شیخ صاحب آج شام یہاں پہنچے اور مجھے آپکی اس تقریر کی نقل دیدی جس کا آپ بحیثیت یونیورسٹی کے چانسلر پڑھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں نے سرسری اس پر نظر ڈالی اور مجھے یہ بہت دلچسپ لگی۔ بے شک آپ جیسا کم عمر چانسلر کسی بھی یونیورسٹی کا نہیں رہا ہوگا کنووکیشن بذات خود ایک رنگین تقریب تھی ہم نے کالے چغے اور گلابی پگڑیاں پہنیں اور احاطے میں ایک جلوس کی صورت میں داخل ہوئے۔ شیخ محمد عبداللہ پرو چانسلر تھے۔ پس وہ، جواہر لعل نہرو اور میں ساتھ ساتھ چلے۔ اسناد اور انعامات تقسیم کرنے کے بعد میں نے اپنی تقریر پڑھی اسکے بعد پنڈت جواہر لعل نہروؔ سے سامعین کو خطاب کرنے کی درخواست کی۔ اسکے بعد میں نے لگاتار اپنی تقریریں خود لکھنے کی پیروی کی۔ صرف اس زمرے میں وہ تقریریں نہیں آتی تھیں جو مجھے قانون ساز یہ کو مخاطب کرتے وقت کرنا پڑتی تھیں۔ تب بھی میں مسودہ منگوا لیتا تھا اور پھر میں مواد کو اپنے الفاظ میں ڈھالنے

کی کوشش کرتا۔ بظاہر میری اس دن کی تقریر کی بہت سراہنا کی گئی۔ جیسے کہ مجمع میں حاضرین کی بڑی تعداد نے مجھے مبارکباد دی لیکن شاید ایسا اسلئے ہوا کیونکہ میرا نوعمر چانسلر ہونا ایک انوکھی بات تھی بعد دوپہر ہم سب کو شکاروں کے ایک جلوس میں دریائے جہلم میں لے جایا گیا۔ مجھے کئی برس پہلے اپنے والد کے ساتھ ایسے ہی ایک جلوس کے دوران کا واقعہ یاد آیا، جب کیمخواب سے ڈھکی کشتیوں کو درجن بھر ماہر کشمیری کشتی بان چلا رہے تھے، جو سفید وردیاں اور پیلی پگڑیاں پہنے ہوئے تھے۔ کشتیاں اور کشتی بان اب بھی موجود تھے لیکن دس برس بعد پوری صورت حال ہی بیحد تبدیل ہو چکی تھی۔ جواہر لعل، شیخ محمد عبداللہ اور میں ایک بڑے شکارے میں بیٹھ گئے، جبکہ نہرو پارٹی کے دوسرے ارکان جن میں گوپالا سوامی آئنگر، سردار بلدیو سنگھ، راج کماری امریت کور اور این۔ وی گاڈگل (کابینہ درجہ کے وزیر) اور انڈین آرمی کے کمانڈر انچیف جنرل کریاپا شامل تھے ہمارے پیچھے پیچھے چھوٹے شکاروں میں چلتے رہے۔ دریائے جہلم کے کناروں پر سرینگر کے ہزاروں لوگوں کا مجمع تھا جو جواہر لعل کا استقبال کرنے کیلئے جمع ہوئے تھے۔ جب ہم ایک ایک کر کے سات تاریخی پلوں کے نیچے سے گذرے تو ایسا دکھائی دیا کہ یہ پل عوام کے بوجھ سے گر جائیں گے جو استقبالیہ جھنڈیاں لہرا رہے تھے۔ اسکول کے

بچے ہزاروں کی تعداد میں چست وردیوں میں جمع تھے۔ اس بات سے اس پورے منظر کو چار چاند لگ رہے تھے۔ میرے لئے یہ ایک ڈرامائی اور یادگاری واقعہ تھا اور ان حالات میں جواہر لعل نہرو کے رتبے کے قومی رہنما کے ساتھ ہونا فخر کی بات تھی

شیخ محمد عبداللہ اور انکی نیشنل کانفرنس کی طرف سے یہ ایک متاثر کن سیاسی مظاہرہ بھی تھا اور پاکستان کے متواتر بدخواہ پروپیگنڈہ کو جھٹلانا تھا کہ کشمیری ہندوستان کے فوجی تسلط کے تحت کراہ رہے تھے۔ ہر وہ شخص جس نے یہ جلوس دیکھا (یہاں غیر ممالک کے بہت سے صحافی اور کیمرہ ٹیمیں موجود تھیں) اس حق بجانب چھلکنے والی محبت، شفقت اور امید سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا جسے اس تاریخی موڑ پر جواہر لعل نے ابھارا تھا

کشمیر میں چھ ماہ کی میعاد ختم ہونے والی تھی اور ہم نے دربار موکے سلسلہ میں جموں جانے کی تیاریاں شروع کر دیں آج ہی کی طرح اس زمانہ میں بھی ریاستی سرکار کا چھ ماہ کے لئے جموں میں قیام رہتا تھا۔ مئی سے لیکر اکتوبر تک سرینگر موسم گرما کی راجدھانی رہتی۔ یہ ایک سیاسی ضرورت ہے کیونکہ ریاست جموں وکشمیر میں دونوں بڑے صوبوں کو برابر کی اہمیت دینا ہے۔ بے شک یہ ان دو صوبوں کے درمیان مساوات بھرنے کی نااہلیت کا نتیجہ تھا کہ مستقبل میں بہت زیادہ تناؤ اور اختلاف

کے بیج نظر آ رہے ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ہم ۷، نومبر کو روانہ ہو گئے۔ میں نے سوچا کہ اس سے پہلے میں کچھ اور مچھلیاں پکڑوں اور شکار کروں کیونکہ جب خزاں موسم سرما کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو شکار میں اضافہ ہوتا ہے۔ اپنے سخت کولہے کے باوجود میں نے کچھ ٹینس کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ میرا ارادہ جموں میں چند ہفتہ ٹھہرنے کے بعد اپنے والد سے بمبئی میں ملنے کا تھا۔ انکو نیپال کے رانا خاندان سے اطلاع ملی تھی اور میری شادی اگلے سال ۱۵ ار جنوری کو طے ہوئی تھی۔

۲۹ر اکتوبر کو سرینگر سے باہر چند میل دور کھریو کے مقام پر چکور کے شکار کا بندوبست کیا گیا تھا۔ ہم صبح روانہ ہوئے۔ میں ڈرائیور کے ساتھ سامنے کی نشست پر بیٹھا جبکہ برگیڈیر راوت، میرے اے۔ ڈی۔ سی کیپٹین ساحل سنگھ اور کالا شکاری کتا پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ پچھلی رات کو بارش ہوئی تھی اور پختہ سڑک کے علاوہ سڑکوں پر پھسلن تھی۔ ہمیں روانہ ہوئے زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ ہوئے تھے۔ ہم پاندریٹھن کے قدیم مندر سے ذرا آگے ہی بڑھے تھے کہ ایک ٹرک ہماری موٹر کیلئے راستہ چھوڑنے کی غرض سے کچی سڑک کی طرف چلا گیا۔ میں یہ دیکھکر خوف زدہ ہوا کہ یہ ٹرک ہماری طرف وحشتناک طور پر پھسل رہا تھا۔ فطری طور پر میں نے

اپنا بایاں پاؤں دائیں کولھے کو تحفظ دینے کیلئے آگے بڑھایا ۔ ٹرک نے ہمیں زوردار ٹکر ماری ۔ میں نے نیچے دیکھا کہ میری ٹانگ گھٹنے اور ٹخنے کے درمیان ٹوٹی تھی اور زاویہ قائمہ بناتے ہوئے مڑی ہوئی تھی اور خراب کولھے میں بھی شدید درد تھا ۔ میں نے سوچا کہ میں ایک ڈراونا خواب دیکھ رہا ہوں اور دوبارہ اپنے آپ کو بستر پر بیدار ہوتے ہوئے دیکھوں گا ۔ یہ سچ مچ ایک ڈراونا خواب تھا جو میں نے جاگتے ہوئے دیکھا ۔

کار سے مجھے کیسے چھٹکارا دلایا گیا ۔ کیسے مجھے ملٹری اسپتال میں جو چند سو گز دور تھا لے جایا گیا ۔ کسطرح میرا ایکسرے لے لیا گیا ۔ کسطرح مجھے بے ہوشی کی دوا سونگھائی گئی اور کسطرح میں اسپتال کے کمرہ میں جبکہ میری ٹانگ اور کولھا دونوں پلاسٹر کے اندر جکڑے ہوئے تھے، ہوش میں آیا ۔ یہ ایسی حالت تھی جو اتنا سارا وقت گذرنے کے بعد مجھے بیان کرنا ناممکن لگ رہا ہے ۔ آگے کے دو دن بے حد عذاب کے تھے ۔

شیخ محمد عبداللہ میرے کمرہ میں بہت تشویش کی حالت میں آئے اور میرے چہرہ اور سر کے اوپر حقیقی دردمندی سے ہاتھ پھیرا ۔ جب میرے والد نے اس حادثہ کے بارے میں سنا تو انہوں نے اصرار کیا کہ مجھے فوراً ہوائی جہاز کے ذریعہ بمبئی لایا جائے ۔ میں چند روز اور انتظار کرنا چاہتا تھا لیکن

وہ بعند ہے ۔ ائرفورس کا ایک جہاز ڈی ۔ سی ۔ ۳ کرایہ پر حاصل کیا گیا اور ایک بار پھر مجھے اس پر سوار کرکے باہر لیجایا گیا ۔ جہاز ایندھن بھرنے کیلئے دہلی میں رکا جہاں میری والدہ جو کاسولی سے آگئی تھیں مجھ سے ایک صدمہ کی حالت میں ملیں ۔ انکی زبان گنگ تھی ۔ اسکے بعد جہاز نے بمبئی کیلئے اڑان بھری جہاں میرے والد مجھے ہوائی اڈہ پر ملے ۔ جوں ہی میں ۱۹ نیپین روڈ پہنچا، دو مشہور آرتھوپیڈک ماہر ڈاکٹر کینی اور ڈاکٹر مولگاونکر بلائے گئے ۔ اس دوران میری ٹانگ خطرناک حد تک سوجھ گئی تھی ۔ اور ایک بار پھر بیہوشی کی دوا سونگھانے کے بعد پلاسٹر ہٹانے پر ڈاکٹروں کو چھالوں کا ڈھیر نظر آیا ۔ اگر میں نے یہاں آنے میں دیر لگائی ہوتی تو ممکن ہے کہ میری ٹانگ کاٹنا ہی پڑتی ۔

پس ایک بار پھر میں پہلی حالت پر واپس آگیا تھا ۔ میری حالت پہلے سے بھی ابتر تھی ۔ امریکہ میں صرف میرے کولھے میں تکلیف تھی ۔ اب کی بار میری بائیں ٹانگ کی دونوں ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں اور حادثہ کے دباؤ کی وجہ سے میرا کولھا دوبارہ تڑک چکا تھا ۔ نیچے کے اعضاء پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا ۔ اور میں عذاب میں مبتلا تھا ۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ مقدر یہ ارادہ کر چکا تھا کہ میں ایک ثابت انسان کیطرح زندگی نہ گذاروں ۔ اس درد کو یاد کرنا آسان نہیں کیونکہ اس دوسری

تباہی کے دوران مجھے اس سے زیادہ دیکھنا پڑ رہا تھا جو ایک عام انسان کو ساری زندگی میں دیکھنا پڑتا ہے ۔ میری والدہ کاسولی سے چلی آئیں اور سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ شادی کے بارے میں کیا کیا جائے ۔ آشا کے چچا جنرل بی جو ٹی' جو بعد میں دہلی میں نیپال کے سفیر تھے' میری حالت دیکھنے بمبئی آئے ۔ ظاہر ہے کہ جنوری کی تاریخ ملتوی کرنا تھی' لیکن کتنی دیر تک کیلئے ۔ یہ میری حالت پر منحصر تھا ۔ ڈاکٹر کینی اور ڈاکٹر مولگاونکر نے مجھے بے ہوشی کی دوا سونگھا کر کئی ترکیبیں آزمائیں لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا' جبکہ میری ٹوٹی ٹانگ پر چھالے ٹھیک ہونے میں صفرا شکن دوائی کے تحت کئی تکلیف دہ ہفتے لگ گئے ۔ کشمیر کی گرما کی مختصر شگفتہ آزادی کے بعد میں شدت کی اداسی میں دوبارہ واپس آ گیا تھا ۔ اسی دوران بے شک ملک میں حالات آگے کیطرف بڑھ رہے تھے ۔ ۲۶ ر جنوری کو ہندوستان کا نیا آئین منظور کیا گیا ۔ یہ بڑی مسرت کا دن تھا ۔ ہندوستان بالآخر ایک مکمل خود مختار جمہوری سلطنت کی صورت میں ابھرا اور ڈاکٹر راجندر پرشاد نے سبکدوش ہونے والے گورنر جنرل سی ۔ راجا گوپال اچاریہ سے پہلے صدر کا عہدہ سنبھالا ۔ بمبئی میں بے مثال جلوس نکلا ۔ جو کئی گھنٹوں جاری رہا ۔ اگرچہ میں بطور مریض بستر پر دراز تھا تاہم میں نے پہلی بار بحیثیت آزاد جمہوری ہندوستان کے

ایک شہری بننے پر خوشی کی ایک لہر محسوس کی ۔ خوش قسمتی سے میرا تعلق اس نسل سے ہے جس نے پرانے جاگیردارانہ نظام میں اقتدار کو نہیں برتا تھا ۔ پس جبکہ مجھے اپنی ریاست سے ایک خاص لگاؤ تھا لیکن یہ لگاؤ ایک ہندوستانی ہونے کے فخر کے سامنے بہت حقیر تھا ۔ مجھے صرف اس بات پر افسوس تھا کہ دونوں اہم موقعوں یعنی سنہ ۱۹۴۷ء کے یوم آزادی اور سنہ ۱۹۵۰ء میں یوم جمہوریہ کے روز میں کمر کے بل لمبا پڑا ہوا' ان تاریخی مواقع پر سرگرمی سے شرکت کرنے سے قاصر تھا ۔

جب میری ہڈیوں نے سرکشی سے جڑنے سے انکار کیا تو بالآخر ڈاکٹروں نے آپریشن کرنے کا فیصلہ کیا ۔ آپریشن کیا گیا ۔ میں جب صحت یاب ہوا تو میرے دائیں کولہے کے دھات کے بنے ہوئے پن کو متوازن رکھنے کیلئے میری بائیں ٹانگ میں ایک دھات کی پٹی اور چھ پیچ لگائے گئے ۔ آپریشن کے روز میری والدہ نے اپنے آپکو پوجا کے کمرہ میں بند کر دیا تھا اور یہ ہدایت دے رکھی تھی کہ آپریشن کے بعد جب مجھے ہوش آجائے تب انہیں مطلع کیا جائے ۔ معلوم یہ ہوا کہ ٹوٹی ہوئی ہڈیاں غیر معمولی صد ۔ پر ضدی ثابت ہو رہی تھیں اور یہ کہ مجھے مزید ایک سال پلاسٹر لگانا پڑتا ۔ پھر بھی وہ نہیں جڑتیں ۔ اسی لئے دھات کی پٹی لگائی گئی

تھی۔ قدرت کے طریقے نرالے ہیں لیکن بعض موقعوں پر ذہین ترمن کی مدد انمول ہو سکتی ہے۔

جب میں آپریشن سے صحت یاب ہو رہا تھا تو میرا ریاست کے لیڈروں شیخ محمد عبداللہ اور انکے نائب وزیر اعظم بخشی غلام محمد سے رابطہ قائم تھا جو ایک بہت ہی مختلف قسم کے شخص تھے اور جنہیں آنے والے سیاسی حالات میں اہم رول ادا کرنا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ نے وقتاً فوقتاً مجھے خطوط لکھے۔ نیویارک سے بھی انہوں نے مجھے خط لکھا جہاں وہ دوسری بار ہندوستانی وفد کے ساتھ بحیثیت ایک ممبر گئے ہوئے تھے، جبکہ مسئلہ کشمیر ابھی زندہ تھا۔ اسی دوران ڈاکٹروں میں کا خیال تھا کہ آپریشن کے چھ ہفتہ بعد چلنے کے لائق ہونگا، کے ساتھ صلاح و مشورہ سے میری شادی کی نئی تاریخ مقرر کی گئی۔ میرے والد طے کر چکے تھے کہ شادی کا مبارک دن انکے ریس پروگرام کو درہم برہم نہ کرنے پائے۔ پنڈت نے مناسب طور پر خبردار کیا اور ۵، مارچ کا دن موافق مہورت کیلئے تجویز کیا۔ آشا کے دادا ابھی بھی نیپال کے وزیر اعظم تھے جو رانا خاندان کے آخری حکمران تھے، جس نے حقیقت میں تقریباً سو سال تک نیپال پر حکومت کی تھی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہمارے دونوں سلاطین کے سلسلہ کی بنیاد بالترتیب

مہاراجہ گلاب سنگھ اور مہاراجہ جنگ بہادر نے بالکل ایک ہی وقت میں ڈالی تھی، اور ایک صدی بعد تقریباً ایک ہی وقت زوال پذیر ہوئیں۔

جب شادی کی تاریخ پکی ہوئی تو آشا کے والدین جنرل اور رانی سردار شمشیر اپنے پانچ بچوں کے ہمراہ بمبئی چلے آئے اور نیپین روڈ پر واقع ایک عالیشان عمارت کچھ کیسل میں قیام کیا۔ عام حالت میں ہم بارات لیکر نیپال گئے ہوتے لیکن جیسا کہ میں سفر کرنے کی حالت میں نہیں تھا اسلئے شادی کی رسم بمبئی میں انجام دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ جبکہ میرے والدین آشا کے والدین اور انکے افراد خانہ سے اس بار گئے ہمارے لئے حقیقی شادی سے پہلے ملنا نامناسب سمجھا گیا تھا۔ باضابطہ منگنی کشمیر ہاؤس کے سٹیٹ کیس ہال میں انجام پائی تھی جب رانا خاندان کا ایک نمائندہ دو نیپالی پنڈتوں کے ہمراہ ... زعفران کے نیک شگون تلک اور منگنی کی انگوٹھی لیکر آیا تھا۔

عام طور پر میں بستر سے اٹھ کر چھڑیوں کے سہارے جنہیں میں نے امریکہ سے خریدا تھا، ادھر اُدھر چلنا شروع کیا۔ جب شادی کی تاریخ قریب آگئی تو گھر مہمانوں اور رشتہ داروں سے بھرنا شروع ہوا۔ اگر شادی کہیں جموں میں انجام دیجاتی تو بیشک جموں کا پورا شہر اُمنڈ آیا ہوتا لیکن بمبئی میں

میرے والد نے صرف قریبی رشتہ داروں کو مدعو کیا تھا۔ کپتے انتظامات کی اپنی خصوصیت کو بروئے کار لاتے ہوئے انہوں نے شادی سے پہلے اور شادی کے بعد کی تفصیلات بنائیں جبکہ میری والدہ زیادہ تر خرید و فروخت میں لگی رہیں۔

اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ میں نے اس اہم واقعہ کا انتظار خوف اور اندیشے کے ساتھ کیا۔ اپنے والدین کے اکلوتے بچے کے طور پر مجھے پالا گیا تھا۔ اور میری تعلیم لڑکوں کے اسکول میں ہوئی تھی۔ اسلئے ابھی تک لڑکیوں سے میرا میل جول برائے نام تھا۔ جہاں تک سماجی حلقہ کا تعلق تھا تو میری ٹوٹی ہوئی ہڈیوں نے مجھے شادی سے پہلے تین سال تک مؤثر طور پر معذور بنا رکھا تھا۔ فروری تک میں یوں ہی بغیر سہارے کے چل سکتا تھا۔ لیکن شادی کی طویل رسومات کے دوران اچھی کارکردگی دکھانے اور بیچ میں گرنے سے بچنے کا مجھے یقین نہ تھا۔ جیسا بعد میں ظاہر ہوا کہ ایک جاگیردارانہ شریک نے میری مدد کی۔ راجپوت دولہا کیلئے شمشیر ساتھ رکھنا لازمی ہے۔ شمشیر ناحق شرمندگی اٹھائے بغیر ایک مؤثر چھڑی سے زیادہ میرے کام آئی۔

شادی سے ایک دن پہلے سوئمبر کی رسم انجام دی گئی۔ جو ایک مشہور قدیم ہندو رواج ہے جہاں دلہن ایک قطار میں کھڑے شادی کے طلبگاروں میں سے شوہر کو چنتی ہے۔ ہندو سماج میں زمانہ سے عورتوں کی حیثیت تباہ کن نتائج کیساتھ دھیرے دھیرے گھٹتی گئی لیکن اس رسم کی علامت کے طور پر کئی فرقوں خصوصاً نیپال کے رانا خاندان نے برقرار رکھا۔ خوش قسمتی سے میرے لئے انتخاب کو گھٹا کر ایک کر دیا تھا جو ایک طرح سے کئی درباروں کیلئے رائے دہندگی کی طرح تھا جہاں میدان میں صرف ایک امیدوار ہو۔ سوئمبر کی رسم کیلئے میں نے کمخواب کا ایک لمبا کوٹ پہنا۔ ایک پگڑی جس میں زمرد لگا ہوا تھا سر پر باندھی اور ہاتھ میں ایک تلوار جس میں ہیرا لگا ہوا تھا اٹھائی۔ میں اور میرے والد ایک لمبی کھلی کار جو دھرول کے ٹھاکر صاحب کی تھی جو دنیا کے سب سے موٹے آدمیوں میں سے تھے، میں بیٹھ کر کیتھ کیسل چلے گئے۔ یہ واحد موٹر تھی جسکے اندر میں آرام سے داخل ہو سکتا تھا، اسلئے بیحد کارآمد ثابت ہوئی۔ ہمارا استقبال جنرل سردارا اور جنرل سنگھا نے کیا۔ اور انہوں نے ہمیں ایک بڑے ہال میں جہاں آشا کو اس قدر بھاری لال رنگ کے کمخواب سے آراستہ کیا گیا تھا کہ ایک لمحہ کیلئے مجھے ایسا لگا کہ وہ کپڑوں کی ایک گٹھری تھی۔ آشا میرے سامنے فرش کے اس پار کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ تب سنسکرت کے شلوک پڑھے جانے لگے اور آشا نے کھڑے ہو کر مجھے ہار پہنایا جو منتخب کرنے کا ایک عام علامتی اقدام تھا جسکے بعد میں نے بھی ویسا ہی کیا۔ تب انکو نیپال کے نوکر

اور نوکرانیاں ایک سجی سجائی پالکی میں لے گئیں۔ ان کا چہرہ تمام رسم کے دوران مکمل طور پر چھپا رہا۔

دوسری صبح ۵۔ مارچ ۱۹۵۵ء کو میں بسم اللہ خان اور انکی پارٹی کا نغمہ سن کر جاگا جو باغ میں نیک شگون شہنائی بجا رہے تھے۔ شادی کرنا ایک طرح سے جوا تھا اور میں ایک ایسی لڑکی سے شادی کر رہا تھا جسکی عمر تیرہ سال تھی جس سے میں ایک یا دو بار دو جوڑے والدین کی موجودگی میں آدھ گھنٹے کیلئے ملا تھا۔ اسلئے میں نے کسی قدر بے چینی کی حالت میں شادی کے کپڑے پہنے۔ میں نے مدھم گلابی رنگ کی قمیض، چست پاجامہ، کمخواب کا لمبا کوٹ، لال پگڑی اور ہیرے جواہرات کا ایک سیٹ پہنا۔ میرے والد نے بھی اس موقع کیلئے خاص لباس پہنا تھا۔ وہ زمرد اور ہیرے لگے ہوئے اپنا روایتی تاج پہنے ہوئے تھے اور ہاتھ میں ہم رنگ تلوار تھی۔ اسکے ساتھ ساتھ تمغے جن پر انہیں ہمیشہ فخر تھا لٹکائے ہوئے تھے اور ہماری پارٹی کے دوسرے سبھی لوگ جن میں کئی سابقہ حکمران شہزادے بھی شامل تھے انہوں نے بھی کمخواب کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ جلوس کے آگے آگے فوجی بینڈ تھا اور اسکے پیچھے چوبیس وردی پوش نوکر تھے۔ ہر ایک نوکر کے ہاتھ میں چاندی کا تھال تھا۔ ان

تھالوں میں ہماری جانب سے دلہن کے لئے جواہرات، کپڑے، خشک میوہ اور مٹھائیاں تھیں۔ انکے پیچھے دوسرے شہزادوں، رشتہ داروں اور اسٹاف کے ارکان کے ہمراہ میرے والد پیدل چل رہے تھے۔ سب سے آخر میں میری کار تھی جسکو عمدگی سے سجایا گیا تھا اور میں پچھلی نشست پر تنہا شان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ۱۹ نبین کار وڈ پر واقع کنچھ کیسل تک پہنچنے میں کار کو آدھ گھنٹہ سے زیادہ لگ گیا۔ کنچھ کیسل کی ڈیوڑھی پر ایکدوسرے بینڈ باجے نے ہمارا استقبال کیا اور بالآخر ہم ایک بڑی عمارت کے سامنے رک گئے جہاں میرے والد اور آشا کے والد ملنی کی رسم کے طور پر ایکدوسرے گلے ملے اور دونوں طرف کی پارٹی ارکان نے ایکدوسرے کو خوش آمدید کہا

شادی کی رسومات کے کئی جز راجپوتوں کی شجاعت کی روایت کا اظہار کر رہے تھے۔ زمانہ وسطی میں سفر مشکل اور خطرناک ہوا کرتا تھا اور مخالف قبیلوں اور بدمعاشوں کا خطرہ ہمیشہ موجود رہتا تھا اسلئے تلواریں اپنی حفاظت کیلئے ساتھ رکھی جاتی تھیں۔ اس زمانہ میں دو قبیلوں کے سربراہوں کی باضابطہ ملاقات شادی کے بندھن کے موقع پر ہوتی تھی۔ ایکدوسرے کے قبیلہ کے اندر شادی کرنے کا رواج ایک سخت ضرورت تھی۔ یہ ایک اہم واقعہ ہوتا تھا۔ سبھی راجپوت راجپوتانہ کے بڑے قبیلوں سے اپنے شجروں سے جوڑتے ہیں۔ پس ہمارے قبیلہ کا تعلق کچھواہا

قبیلہ سے ہے جسکے سربراہ جے پور کے راجہ تھے جبکہ رانا خاندان والے اپنے قبیلہ کو اُدھمپور کے سسو دھیا زشجرہ سے جوڑتے ہیں۔ بھرپور ہتھیاروں سے لیس بارات کا جلوس، دلہن کے گھر آنا اور اُسے لیکر اپنے محفوظ قلعہ کو واپس لوٹنا یہ سب ایک ایسا تصور ہے جس سے گذرے ہوئے زمانہ کی مجبوریوں کا پتہ چلتا ہے۔ تاہم ایک رنگین تماشہ بھی مہیا کرتا ہے جو آجتک جاری ہے۔

ملنی کے بعد میرے والد اور باقی باراتیوں کو ایک وسیع خوبصورت شامیانہ کے نیچے جسے اس خاص موقع کے لئے سجایا گیا تھا، بٹھایا گیا، جبکہ مجھے پوجا کیلئے منڈپ میں لیجایا گیا۔ یہ ایک بند احاطہ تھا جہاں پر مذہبی رسومات ہونے والی تھیں۔ مختلف دیوتاؤں کی پوجا کے بعد جو سرایت کرنے والی قدرت کے مختلف پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں آشا کو پالکی میں بٹھا کر نوکر احاطہ میں لائے۔ اس سے پہلے نیپال کی آٹھ نوکرانیاں جو سرخ ساڑھیاں پہنے ہوئی تھیں اور گھوڑے کی دُم سے بنے ہوئے نیک شگون مورچھل ہاتھوں میں لئے ہوئی تھیں، داخل ہوئیں۔ آشا کے آنے پر شادی کی رسومات شروع ہوئیں جو ایک گھنٹہ سے زیادہ دیر تک جاری رہیں۔ آشا انکے والدین اور میں ان رسومات میں خاص شرکاء

تھے۔ دلہن کو سچ مچ بخشنے کی رسم کو ماں اور باپ دونوں مل کر انجام دیتے ہیں۔ یہ بات مغربی رواج کے برعکس ہے جہاں اس رسم کو صرف والد ہی انجام دیتا ہے۔

اسکے بعد رسم کی خاص بات اس وقت آتی ہے جب دُلہن اور دُولہا مقدس آگ کے گرد سات چکر لگاتے ہیں۔ جسے شادی کے رُوحانی رشتے کے بارے میں قدرتی شہادت کی علامت مانا جاتا ہے۔ آشا اس قدر تیز چلتی رہیں کہ مجبوراً مجھے انکے برابر چلنا پڑا۔ اپنی قابل اعتماد تلوار کو میں چھڑی کے طور پر استعمال کرتا رہا اور میرے والد کو کھڑے ہوکر آشا کے کان میں آہستہ چلنے کیلئے کہنا پڑا۔ طویل رسم کے بعد ہمیں مختصر دلفریب نیپالی رسم سے گذرنا پڑا جہاں نئے بیاہتے جوڑے کو ایک پلنگ پر بیٹھ کر ہاتھی دانت کے ملبے ٹکڑوں سے جُوا کھیلنا پڑتا ہے۔ نتیجہ کا اعلان کرنے سے پہلے میں نے نیپال کے بڑے پجاری کے چہرہ پر فتحیابی کے آثار دیکھے اور یہ کہ آشا بہت آسانی سے جیت چکی تھیں۔

شادی کی رسم ختم ہوئی تو ہم سب واپس کشمیر ہاؤس لوٹ آئے اور آشا کو کیتھ کیسل میں ہی چھوڑ آئے۔ دوسرا دن دلہن کیلئے نئے گھر میں داخل ہونے کے لئے نیک شگون رکھتا تھا۔ میں دوبارہ کیسل آیا اور مزید رسومات

کے بعد ہم بالآخر ایک ساتھ ۱۹ رنیپین روڈ کیلئے روانہ ہوئے جہاں ہمارا استقبال میرے والدین اور بہت سارے مہمانوں نے کیا۔ گاڑی سے اترنے سے پہلے ہمیں نظر بد سے بچانے کیلئے ایک بڑی بکری کو ہمارے سروں کے اوپر سے اتارا گیا او۔ تب ہم سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہال میں داخل ہوئے جہاں چکا چوند کرنے والی ایک قطار میں میری والدہ اور دیگر عورتیں خاص طور سے اس موقع کیلئے کلاہ اور جواہرات پہنی ہوئی تھیں۔ اتفاق سے بمبئی کے گورنر راجا مہاراج سنگھ تھے جو کئی برس پہلے تھوڑی مدت کیلئے میرے والد کے وزیر اعظم رہ چکے تھے۔ بیگم مہاراج سنگھ اور بمبئی کے وزیر اعلیٰ بی۔ ایچ کھیر بھی وہاں موجود تھے۔ ریاست کے وزیر داخلہ مرار جی ڈیسائی موجود نہ تھے۔ شاید ایسا اسلئے تھا کیونکہ شراب کا استعمال پانی کی طرح ہوا اور صبح کے وقت جب پارٹی اختتام کو پہنچی تو نوے فیصدی مہمان بہک چکے تھے۔

بالآخر جب ہم اپنے کمرہ میں داخل ہوئے تو رات کے دو بج چکے تھے۔ جب ہم اپنے تمام ہیرے جواہرات اور کمخواب کے کپڑے اتار چکے تھے تو ہم نے محسوس کیا کہ دراصل ہم بہت ہی کم عمر اجنبی تھے۔ پس اسطرح ہم میاں بیوی بن گئے۔

باب ۱۰

شادی کے بعد کے چند ہفتے دعوتوں کے چکر میں گذرے ان دعوتوں کا اہتمام ہم نے، نیپالیوں نے اور ہمارے آپسی دوستوں نے کیا تھا۔ بعض دعوتوں کے موقع پر میرے والد مجھ سے گواتے سنگیت سے دلچسپی میں نے برقرار رکھی تھی۔ کئی برسوں کے عادت چھوٹنے کے باوجود میں ان راگوں اور گانوں کو بالکل آسانی سے یاد کر سکتا تھا جو میں نے بچپن میں سیکھے تھے۔ شادی کے چار روز بعد میرا انیسواں جنم دن تھا۔ جنم دن پر آشا نے مجھے ایک جاپانی ٹرانسسٹر دیا جو اس وقت ایک خاص چیز مانی جاتی تھی۔ ہماری شادی سے پہلے آشا چند ماہ پہلے تیرہ برس کی ہوئی تھیں۔ پیچھے نظر دوڑانے پر یہ بات ناقابل یقینی لگتی ہے کہ ہم کس قدر

چھوٹے تھے اور یہ کہ نئے ماحول سے سمجھوتہ کرنے میں مشکلات کے باوجود ہم نے ایک خوشگوار ازدواجی زندگی اختیار کی۔ آشا کے لئے بیشک یہ تبدیلی کچھ زیادہ ہی تھی۔ پانچ بچوں کے ساتھ ایک بڑے کنبہ میں پرورش پانے والی آشا نے اچانک اپنی شادی ایک سچ مچ کے اجنبی سے ہوتی ہوئی دیکھی، جو اپنے خاندان کا اکلوتا بیٹا تھا اور جو ایک ایسی زبان بولتا تھا جو مشکل سے اُنکے پلے پڑتی تھی۔ اس پر یہ ستم کہ میری والدہ جو ہمیشہ میری طرف زیادہ مائل تھیں۔ ان کا برتاؤ آشا کے ساتھ اس حد تک سمجھداری کا نہ تھا جتنا کہ ہونا چاہئے تھا۔ میرے لئے بھی یہ تبدیلی بہت بڑی تھی۔ ایک اکلوتا بچہ ہونے کے ناطے جسکو درحقیقت تنہائی میں پرورش کیا گیا تھا۔ اسلئے میری زندگی میں ایک نئے شخص کے داخلے نے مجھے ایک نئی صورت حال سے دوچار کیا جس کیلئے میں جذباتی اور نفسیاتی طور پر مکمل طور پر تیار نہ تھا۔ کسی بھی کامیاب شادی کیلئے بہت زیادہ آپسی سمجھوتہ کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہمارے معاملہ میں اسکی معمول سے زیادہ ضرورت تھی۔

کئی مہینوں تک آرام اور شادی نے میرے ذہن کو ریاست کے سیاسی معاملات سے دُور رکھا ہوا تھا لیکن اب وقت آچکا تھا جب مجھے ریجنٹ ہونے کے ناطے کام پر واپس آنا تھا۔ یہ طے پایا کہ ہم ۲۸ اپریل کو بمبئی سے روانہ ہو جائیں گے۔ بمبئی میں گرمی شروع ہو چکی تھی اور میری ماں نے، جنہیں کبھی موسم گرما پسند نہ تھا،

واپس کشمیر جانے کا فیصلہ کیا۔ اس بات سے میرے والد پریشان ہوئے جیسا کہ شاید انہوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ میری شادی کے بعد میری والدہ وہیں ٹھہریں گی۔ ہماری روانگی سے تین دن پہلے بمبئی سے انہوں نے چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ جس شام انکی ٹرین کو روانہ ہونا تھا وہ کشمیر ہاؤس کی سیڑھیوں سے نیچے اتریں اور ہاتھ جوڑ کر میرے والد کے سامنے جھک گئیں اور الوداع کہی۔ اسوقت مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ اسکے بعد ان کے مقدر میں کبھی دوبارہ ملنا نہ تھا۔

آشا اور میں اپنے اسٹاف اور نوکروں کے ہمراہ صبح سویرے کرایہ کے ڈی۔ سی ہوائی جہاز سے بمبئی سے روانہ ہوئے۔ دس بجے ہم دہلی میں تھے، جہاں ہم کچھ دیر کے لئے رُکے تاکہ سردار پٹیل سے ملیں جو اس وقت اورنگ زیب روڈ پر قیام کرتے تھے۔ وہ بہت بیمار تھے لیکن انہوں نے ہمارے ساتھ کچھ وقت گذارنے کی خاص سعی کی اور ہمیں دیکھ کر وہ واقعی خوش ہوئے۔ یہ سوچتے ہوئے کہ ایک طرح سے ہماری شادی کرانے کے سلسلہ میں وہی ذمہ دار تھے، ہم نے سوچا کہ کچھ نہیں تو ہم یہ کر سکتے ہیں کہ ہم انکے یہاں حاضری دیں۔ جواہر لعل اس وقت دہلی میں نہیں تھے۔ اس لئے ہم اُن سے نہ مل سکے۔ ہم نے نیپال کے سفارتخانہ پر سفیر کے ساتھ جو آشا کے چچا کے باپ تھے،

دوپہر کا کھانا کھایا اور تب جموّں کیلئے پرواز کی جہاں ہم ٹھیک چار بجے پہنچے۔ وہاں واقعی ایک بھاری استقبال ہمارا منتظر تھا۔ بخشی غلام محمدؔ اور دوسرے افسروں کے علاوہ ایسا لگا کہ پورا جموّں شہر استقبال کرنے کیلئے امنڈ پڑا تھا اور لوگوں کا یہ بھاری مجمع بہت ہی پُرجوش اور شفیق تھا۔

ہمارے جموّں پہنچنے کے ایک دن بعد شیخ عبداللہ سرینگر سے چلے آئے اور پُرانے شہر کے محل منڈی مبارک میں ہمارے اعزاز میں ایک باضابطہ استقبالیہ دیا۔ جسمیں خوش اسلوبی سے میری دلجوئی کی اور ریاست کی طرف سے میری پگڑی پر لگانے کیلئے ہیرے کا سرپیچ پیش کیا۔ خواتین کی طرف سے بھی استقبالیہ دیا گیا اور محل میں بیشمار لوگ ملنے آئے۔ آشا نے یہ سب تماشہ پانی میں رہنے والی مچھلی کی طرح دیکھا حالانکہ وہ ڈوگری کا ایک لفظ تک نہیں جانتی تھیں لیکن جو کچھ تھوڑی بہت ہندی انکو آتی تھی اسکا انہوں نے اچھا استعمال کیا۔ جموّں میں پندرہ روز قیام کرنے کے بعد ہم نے سرینگر کیلئے پرواز کی اور واپس کرن محل آئے۔ اس بار ایک خوبصورت کمسن بیوی کے ساتھ بمبئی اور جموّں کی گرمی اور گہما گہمی کے بعد سرینگر کے گھر اور شاندار موسم سے آشا بے حد خوش تھیں۔

دھیرے دھیرے ہم نے اپنی نئی زندگی سے سمجھوتہ کرنا

شروع کیا۔ یہ محسوس کرنے میں مجھے کچھ وقت لگا کہ اب میں محض اکیلا نہ تھا اور یہ کہ کوئی اور بھی ساتھ ہے جو لگاتار میرا شریک حیات اور شریک کار ہوگا۔ پچھلے حالات پر نظر دوڑانے پر مجھے یہ غیر معمولی لگتا ہے کہ آشا نے کتنی پھرتی سے اپنے آپ کو نئے ماحول میں ڈالا۔ انہوں نے ہندی سمجھنا شروع کیا اور انہیں انگریزی پڑھانے کیلئے میں نے مسز ہاتلے کو مقرر کیا جو ایک ہندوستانی خاتون تھیں۔ جن کو کشمیر میں عیسائیوں کی تبلیغی ادارے نے پالا تھا اور اسوقت مصنف جرالڈ ہاتلے کی زوجیت میں تھیں۔ آشا نے پینٹنگ میں کچھ دلچسپی دکھائی پس میں نے مسز لینن پوری کو مقرر کیا جو ایک انگریز عورت تھیں جنکی شادی ایک پنشن یافتہ کشمیری افسر سے ہوئی تھی۔ ہم نے انکو آشا کو پینٹنگ کی تربیت دینے کو کہا۔ جہاں تک میرا سوال تھا میں نے دوبارہ پروفیسر چکّو کے ساتھ رابطہ قائم کیا۔ ایکدن جب ہم سیاسیات کے بعض نقطوں پر بحث کر رہے تھے انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ یہ اچھا رہیگا کہ اگر میں منتشر اور بے ترتیب مطالعہ کے بجائے جموّں وکشمیر کے بی۔ اے کورس کو پڑھوں اور اگلے برس بطور آزاد امیدوار امتحان میں شامل ہوجاؤں یہ خیال مجھے بہت پسند آیا اور میں سیاسیات، اقتصادیات اور انگریزی کا بطور مضامین مطالعہ شروع کیا۔ اس تجویز کیلئے میں پروفیسر چکّو کا احسانمند ہوں کیونکہ اس تجویز نے میرے اندر تعلیمی دلچسپیوں کو پھر سے اجاگر کیا اور آگے کی تعلیم کیلئے راہ ہموار کی۔ غالباً یہ ایک

بے نظیر مثال تھی کہ میں جس یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان دینے کی تیاری کر رہا تھا اس کا میں بذاتِ خود چانسلر تھا۔

بی۔ اے۔ کے کورس کے علاوہ پنڈت پرمانند نے آکر مجھے سنسکرت پڑھانا شروع کیا۔ پس سرکاری فرائض کے ساتھ ساتھ جس میں ابتدائی رسومات کے مواقع پر تقریر کرنا اور متواتر ملنے والوں کی خاطر...... تواضع کرنا شامل تھا ہم نے کافی سخت تعلیمی پروگرام شروع کیا۔ میں نے اپنے من پسند مفکروں برنارڈ رسل اور آلڈس ہوکلے کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا اور جس مہارت سے وہ با مقصد خیالات کو لیتے ہیں اور ان کا جس صفائی اور تصور کے ساتھ تجزیہ کرتے ' اس سے میں بے حد متأثر تھا۔ تب مجھے خیال آیا کہ انسانوں کی دُنیا سے تصورات کی دُنیا کتنی عظیم ہے۔ لالچ، کرپشن اور موقع پرستی سے مبرّا جسمیں صرف روشن خیالات ذہن سے اس طرح گشت کرتے ہیں جسطرح ہنس بے نشان انجان منزل کی طرف پرواز کرتے ہیں۔ اسی دوران میں نے پلاٹو کو دریافت کیا اور بہت محفوظ ہوا۔ مضامین کے مجموعے میری پسندیدہ کتابوں میں سے ہیں۔ حالانکہ بعد میں' میں ہندو فلسفہ کی طرف رجوع ہوا۔ لیکن مغربی دنیا کی اعلیٰ اہل بصیرت سے اپنی ابتدائی ملاقات کی میں بدستور قدر کرتا ہوں۔ جس کی سلطنت میں میرا واسطہ فلسفی بادشاہ کے تصور سے ہوا۔ اور اس عظیم اصول پرستی کی ہمسری کرنے کے امکان سے دوبارہ میرا جوان تصور بیدار ہوا۔

اسی دوران سیاسی تبدیلیاں جاری رہیں۔ ۱۳، جولائی ۱۹۳۱ کے دوران جب شیخ عبداللہ کی مسلم کانفرنس نے پہلی بار ڈوگروں کے خلاف تحریک چلائی اور ایک افسوسناک واقعہ پیش آیا' ہندوں دکانداروں پر حملہ ہوا جسکے نتیجہ میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور ڈوگرہ پولیس نے گولی چلائی جس سے بہت سارے کشمیری مارے گئے، تب سے نیشنل کانفرنس اس دن کو یومِ شہدآء کے طور پر مناتی آئی ہے۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں شیخ محمد عبداللہ اس موقع پر زیادہ سے زیادہ سیاسی فائدہ حاصل کرنے کی غرض سے کچھ ڈرامائی اعلانات کرنا چاہتے تھے اور ایک ماہ قبل انہوں نے جاگیرداری اور زمینداری بغیر کسی معاوضہ کے ختم کرنے کے سلسلہ میں میرے پاس دو تجویزیں دستخط کرنے کیلئے بھیجیں۔ تجویز کئے گئے اقدامات کے ساتھ ویسے میرا رویہ ہمدردانہ تھا لیکن ظاہر ہے کہ ان اقدامات سے عوام کے بہت سے طبقے متأثر ہوئے خاصکر ریاست کی غیر مسلم آبادی۔ وشنو سہائے سرینگر کے دورے پر آئے ہوئے تھے۔ اور میں نے اس بات کو مناسب سمجھا کہ معاملہ انکی نوٹس میں لایا جائے تاکہ بھارت سرکار ان تجویزوں کی پیچیدگیوں پر غور کر سکے۔ جب شیخ محمد عبداللہ نے کاغذات پر دستخط کرنے کے بارے میں مجھے یادداشت بھیجا تو میں نے اپنی کاروائی کے بارے میں مطلع کیا۔ اس بات پر انہوں نے جواب طلبی کا ایک غصہ سے بھرا میمورنڈم لکھا جسمیں انہوں نے مجھے معاملہ کو سیکرٹری برائے

کشمیر معاملات کی نوٹس میں لانے پر مجھے آڑے ہاتھوں لیا ۔ انہوں نے لکھا" لگتا ہے کہ ایک آئینی سربراہ کی پابندیوں پر یوراج نے غور نہیں کیا ہے ۔جو کارروائی یوراج نے کی ہے وہ ۵ر مارچ ۱۹۴۸ء کے اعلان نامہ کے جذبہ کے بالکل مترادف ہے جسکے تحت موجودہ سرکار قائم کیگئی تھی ۔اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ حکمران یا اس کا ریجنٹ محض ریاست کے ایک آئینی سربراہ کے طور پر کام کرے گا اور اسی واضح سمجھوتہ کے تحت موجودہ سرکار حکومت سنبھال رہی ہے" آگے چل کر معنی خیز انداز میں انہوں نے لکھا" یہ بات بھی واضح ہے کہ جن معاملات کے بارے میں گذارش کیگئی تھی ان کا تعلق اس معاملہ سے نہیں تھا جسکے تحت ریاست کا بھارت سلطنت کے ساتھ الحاق ہوا ہے ۔اسلئے موجودہ آئینی ڈھانچہ میں بھارت سرکار کو اس معاملے میں کوئی دخل نہیں ہے" ۔

یہ نمایاں طور پر سخت دھمکی تھی ۔لیکن میں نے جھکنے کا فیصلہ کیا وشنو سہائے یہ دو تجویزیں لیکر پہلے ہی دہلی کیلئے پرواز کر چکے تھے پس میں نے اپنے اے ۔ ڈی ۔ سی کو جلدی سے شیخ عبداللہ کا غصہ سے بھرا خط لے کر دہلی بھیجا اور وشنو سہائے سے کہا کہ وہ ہائی کمانڈ سے صلح و مشورہ کرے یعنی جواہر لعل نہرو، سردار پٹیل اور گوپالاسوامی آینگر سے ۔ دوسرے دن وہ ایک مسودہ لیکر واپس لوٹے جسکو میں نے شیخ صاحب کے میمورنڈم کے ساتھ نتھی کر کے

انہیں واپس ۱۲ر جولائی کو بھیجا گیا جسکی عبارت یوں تھی ۔

"۵ر مارچ ۱۹۴۸ء اعلان نامہ کے تحت میں آئینی حیثیت کی قدر کرتا ہوں ۔ پھر بھی مجھے لگتا ہے کہ یہ دوررس نتائج کی حامل تجویزیں جو آبادی کے ایک بڑے طبقہ کی اقتصادیات کو بیحد متأثر کریں گی اور جن تجویزوں کو منظور کرنے کے لئے اس وقت کوئی باضابطہ قانون سازیہ موجود نہیں ہے ۔ موجودہ نازک سیاسی صورت حال میں ان تجویزوں کی بھارت سرکار کے ساتھ مل کر چھان بین کرنی چاہئے اور ہمیں جلدبازی میں بھارت سرکار کو مطمئن کئے بغیر یہ قانون منظور نہیں کرنا چاہئے ۔ میں کابینہ کو معاملہ کے اس پہلو پر غور کرنے کو کہوں گا"۔

اس کے باوجود دوسرے دن سرینگر کے لال چوک میں شیخ عبداللہ نے ایک لمبی تقریر کی جسمیں انہوں نے نئے اقدام کا اعلان کیا اس حقیقت کے باوجود کہ انہیں اس معاملہ پر بات چیت کرنے کیلئے دلی بلایا گیا تھا اور یہ کہ یہ کارروائیاں میرے دستخط کے بغیر قانونی نہ تھیں انکے اور بھارت سرکار کے درمیان متضاد طریقہ کار اور رائے کے سلسلہ کی یہ پہلی کڑی تھی ۔ جو اگلے برسوں بڑھتے ہوئے ۱۹۵۳ء کے ڈرامائی واقعات پر اختتام پذیر ہوئے ۔ شروع سے میں نے بحیثیت ریاستی سربراہ اپنے رول کو ایک زاویہ سے دیکھا کہ جواہر لعل نہرو کے تحت بھارت سرکار نے وقتاً فوقتاً جو موقف اپنایا اس میں" میں قومی مفاد کو کیسے زیادہ سے زیادہ تحفظ دے سکوں ۔ ظاہر ہے کہ ان

اعلان ناموں پر دستخط کرنے سے انکار پر شیخ عبداللہ کو بہت صدمہ پہنچا، کیونکہ وہ مجھے محض ربڑ کی مہر سمجھتے تھے۔ پس ہمارے درمیان اختلاف رائے پیدا ہونا شروع ہوئی اور خیر خواہی کے آہستہ آہستہ خاتمہ کی ابتداء ہوئی۔ حالانکہ اس تضاد کو کشمیریوں اور ڈوگروں کے مابین پرانی دشمنی سے تعبیر کیا گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنے ڈوگرہ ہونے پر اگرچہ مجھے ناز ہے لیکن میں نے ایک ڈوگرہ سے زیادہ ایک ہندوستانی کے طور پر اپنا فرض نبھانے کی کوشش کی۔ بیشک یہ کہنا درست ہوگا کہ میرے اور شیخ عبداللہ کے درمیان بنیادی اختلاف اس حقیقت میں پوشیدہ تھا کہ جبکہ وہ اپنے آپ کو ایک کشمیری سمجھتے تھے جو اتفاق سے اپنے آپ کو ہندوستان میں پا رہے تھے۔ میں اپنے آپ کو ہندوستانی سمجھ رہا تھا جو اتفاقاً اپنے آپ کو کشمیر میں پا رہا تھا۔

جموں و کشمیر کی اصلی حیثیت کا غیر مبہم سوال بھی ابھی باقی تھا۔ میں تحریر کر چکا ہوں کہ کسطرح میرے والد مبہم طور پر آزاد ریاست سے دلچسپی رکھتے تھے لیکن تیزی سے بدلتے ہوئے حالات نے انہیں مغلوب کیا۔ بعد میں جو کچھ بھی ہوا تھا، جسمیں جنگ "جنگ بندی" اقوام متحدہ کی مداخلت کی باتیں شامل تھیں اسکے باوجود آزادی کے تصور کے شیخ صاحب ہرگز خلاف نہ تھے۔ یہ بات بعد کے دو تین برسوں میں بہت نمایاں ہوئی اور پبلک اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے دستاویزات جن سے امریکہ کے سفیر لائی ہینڈرسن کی انکے ساتھ ۱۹۵۰ء کے موسم گرما میں بات چیت

کا پتہ دیتے ہیں، اس حقیقت کی تصدیق کرتے ہیں۔ اُس سمت کی طرف بڑھنے سے پہلے تاہم شیخ عبداللہ نے محسوس کیا کہ انہیں ڈوگرہ راج کے سبھی نشان مٹانے تھے اور پورا اقتدار اپنے ہاتھ میں لینا تھا۔ اس غرض سے انہوں نے اپنا ذہن سنگدلی کی طرف موڑا جس میں انہیں ایک گروہ اعانت کر رہا تھا جسکی قیادت مرزا افضل بیگ وزیر مال کر رہے تھے اور وہ رول ادا کر رہے تھے جو ٹوڈرمل نے اکبر کے دربار میں کیا تھا۔ اس تاریک صورت حال میں میری واحد حکمت عملی بھارت سرکار کے ساتھ قریبی رابطہ رکھنا تھا اور جواہر لعل نہرو کے ساتھ ذاتی تعلقات برقرار رکھنا تھا۔

فرمان جاری کرنے کے فوراً بعد میں اور میری اہلیہ آشا دلی چلے گئے۔ آشا میری والدہ سے ملنے کا سولی چلی گئیں، جبکہ میرا قیام کچھ روز تک تین مورتی ہاؤس میں جواہر لعل نہرو کے مہمان کے طور پر رہا۔ اس دوران پرنا جا نائیڈو بھی وہاں قیام پذیر تھیں۔ وہ ہمیشہ ہی بہت ہی پُرمذاق شخصیت تھیں جو فوراً ہی دلچسپ گفتگو چھیڑ کر مجھے سکون بخشتیں۔ اندرا گاندھی میزبان تھیں۔ وہ خلیق تھیں۔ دور رہتی تھیں اور تکلف کر رہی تھیں۔ اس زمانہ میں راجیو اور سنجے بہت چھوٹے تھے۔ مجھے جواہر لعل کے ساتھ گھر کے پیچھے لان میں چلنا یاد ہے جب انہوں نے اپنے نواسوں کو بھاری ریچھ دکھائے جو حال ہی میں تحفہ کے طور پر چین سے آئے تھے۔

سردار پٹیل کی زندگی کے کچھ مہینے باقی بچے تھے اور ان سے بار بار ملنا ممکن نہ تھا۔ تاہم میں نے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد سے ضرور پابندی سے ملنا شروع کیا جو ایک مہربان اور عالم شخص تھے۔ وہ ہمیشہ میرے ساتھ شفقت سے پیش آتے اور کشمیر میں پائے جانے والی صورت حال کے بارے میں میری رپورٹ کو غور سے سنتے۔ یہ عیاں تھا کہ انکی رائے جواہر لعل کے بجائے سردار پٹیل سے ملتی تھی اور انہیں خاص طور سے اس مشکل صورت حال پر تشویش تھی جس میں ریاست کے ہندو گھرے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ انکو بھی سردار پٹیل ہی کی طرح شیخ محمد عبداللہ کے بارے میں گہرے شکوک تھے۔ لیکن چونکہ وہ بہت زیادہ نرم طبیعت تھے اسلئے اس کا اظہار غیر مبہم طور پر کرنے سے قاصر تھے۔ اس برس گرمی کے آخری دنوں میں ڈاکٹر راجندر پرشاد جی یونیورسٹی کے کنووکیشن سے خطاب کرنے آئے تھے جسکی صدارت میں نے ایک بار اور کی تھی۔

حالانکہ جاگیرداری اور زرعی اصلاحات کے معاملہ سے متعلق حکمنانہ کا تصفیہ ڈھونڈا گیا تھا۔ جب شیخ عبداللہ نے بادل ناخواستہ نئی دلی کے مشورہ پر کچھ ترمیمات کی تھیں یہاں تک کہ سردار پٹیل نے اپنی زندگی کے آخری ہفتوں میں اس معاملہ میں دلچسپی لی تھی۔ جلدی یہ بات عیاں ہوئی کہ یہ انکی محتاط طریقہ پر مرتب کی ہوئی حکمت عملی کا پہلا داؤ تھا جسکا مقصد اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنا اور آئینی جواز کو ٹھکرانا تھا۔

اس بات کو ذہن نشین کرنا چاہئے کہ اس وقت مسئلہ کشمیر ابھی تک اقوام متحدہ میں زندہ تھا جہاں جواہر لعل نہرو کی اصول پرستی اور انصاف نے پورے معاملہ کو بھارت کیلئے حیرت انگیز طور پر پیچیدہ بنایا ہوا تھا۔ تجویز شدہ رائے شماری کی سہولیت کو استعمال کرکے شیخ عبداللہ نے میرے والد کے خلاف بے دردی سے پیچھا کرنا جاری رکھا۔ انہیں ریاست سے باہر کروانے پر مطمئن نہ ہوتے ہوئے انہوں نے اب خاندانی حکمرانی کو ختم کرنے پر زور دینا شروع کیا۔ اور اس کیلئے جو طریقہ کار انہوں نے چنا وہ ریاست کی آئین ساز اسمبلی کا تصور تھا۔ تاہم دشواری یہ تھی کہ اس قسم کی اسمبلی میرے دستخط کے بغیر قانونی طور پر قائم نہیں ہو سکتی تھی۔

ریاست کا آئین مرتب کرنے کیلئے آئین ساز اسمبلی کو قائم کرنے کا تصور اس وسیع سیاسی حکمت عملی کا ایک حصہ تھا جسکا مقصد رائے شماری کے سوال کو فضول بنانا تھا۔ حالانکہ کئی موقعوں پر جواہر لعل نہرو نے اقوام متحدہ اور پاکستان کو یہ یقین دلایا کہ ہندوستان اپنے پرانے وعدہ پر قائم ہے لیکن یہ عیاں تھا کہ اگر آئین ساز اسمبلی کا اجلاس ہوا اور ریاست کے ہند کے ساتھ الحاق کی دوبارہ توثیق ہو جائے اس کا باہر کے ملکوں میں رائے عامہ پر بڑا اثر پڑے گا۔ شیخ عبداللہ کیلئے اس صورت نے بے شک ڈوگرہ راج پر آخری وار کرنے کیلئے اپنی زندگی کی عزیز ترین خواہش کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا ایک

سنہری موقع فراہم کیا۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں سال بھر اسکے متعلق ریاستی سرکار اور مرکزی وزارت برائے کشمیر معاملات کے درمیان گفتگو ہوتی رہی۔ حالانکہ میرے والد نے مجھے ریجنٹ نامزد کیا تھا لیکن وہ دستبردار نہیں ہوئے تھے اور ابھی بھی قانونی طور پر حکمران برقرار تھے۔ اسلئے حکومت ہند کیلئے ان سے آئین ساز اسمبلی کے بارے میں صلاح و مشورہ کرنا لازمی بن گیا اور ۳۔ نومبر سنہ ۱۹۵۰ء کو وشنو سہائے سیکرٹری برائے کشمیر افیئرس نے ان کو خط لکھا جسکے ساتھ اس اعلان نامہ کا مسودہ بھی بھیجا جسکو مجھے جاری کرنا تھا اور اس بارے میں انکی رائے مانگی۔ ۱۰ دسمبر کو میرے والد نے سردار پٹیل کو ایک طویل خط لکھا جس میں انہوں نے کئی نقطے ابھارے جسکا خلاصہ انہوں نے یوں بیان کیا۔

۱۔ "اعلان نامہ جسکے مقصد اور جذبہ کے ساتھ مجھے پورے دل سے اتفاق ہے کو مجھے بحیثیت ایک حکمران جسے صحیح طور پر قانوناً اسے جاری کرنے کے لئے مجاز مقرر کیا گیا کو جاری کیا جانا چاہئے نہ کہ میرے ریجنٹ کی جانب سے"۔

۲۔ "جس اسمبلی کا قیام زیر تجویز ہے اسکے کام اور اختیارات کو ظاہر کیا جانا چاہئے۔ اچھی طرح سے تشریح کی جانی چاہئے۔ مناسب طور بیان کیا جائے اور جن معاملات کو ظاہری طور پر انکے سپرد نہ کیا جائے انہیں انکی تحقیقات اور ملاحظہ کے حد اختیار سے مستثنیٰ رکھنا چاہئے۔ انہیں (ممبران کو) اس مجاز شخص کو رپورٹ پیش کرنی چاہئے

جس نے انہیں نامزد کیا۔ یعنی حکمران کو جو رپورٹ پر بھارت سرکار کی پارلیمنٹ کا مشورہ طلب کرے گا۔

اوپر جو رائے کی گئی اس کی روشنی میں دیکھتے ہوئے یہ صاف ظاہر ہوگا کہ اعلان نامہ جس صورت میں تیار کیا گیا اگر اسکو اسی صورت میں جاری کیا جائے تو یہ ضروری منظوری سے محروم اور خارج از اختیار ہوگا جیسا کہ اسکے مختلف مد ایک دوسرے سے متضاد ہیں اور تسلیم شدہ آئینی اصولوں کے برخلاف ہیں۔ اور جس نقطہ نظر کو سامنے رکھ کر اس اسکیم کو پیش کیا گیا حقیقی معنی میں وہ شدید قسم کی مشکلات پیدا کرے گا اور اس مقصد کو فوت کریگا جسکو اس کے ذریعہ حاصل کرنا مقصود ہے۔

انہوں نے مجھے بھی لکھا کہ چونکہ وہ اس معاملہ کو بھارت سرکار کے ساتھ اٹھا رہے ہیں مجھے اس وقت تک اعلان نامہ پر دستخط نہیں کرنا چاہئے جب تک معاملہ کو واضح نہ کیا جائے۔ اسکے بعد جلد ہی سردار پٹیل کے انتقال نے قومی زندگی میں ایک ایسا خلاء پیدا کیا جو درحقیقت کبھی پُر نہ ہو سکا۔ ۲۵ جنوری کو وشنو سہائے نے خط کے ساتھ مجھے اعلان نامہ کی نقل بھیجدی اور یہ تجویز پیش کی جب مجھے شیخ عبداللہ کی طرف سے اس بارے میں عرضداشت وصول ہو جائے تو مجھے اعلان نامہ پر دستخط کرنے چاہیئے۔ یہ عرضداشت ۲۷ جنوری کو موصول ہوئی جو یوں تھی۔

"موجودہ ریاستی حکومت ہمیشہ اس پوزیشن

کی پابند رہی ہے کہ یہ ریاست کے عوام کی مرضی ہے کہ وہ ریاست کیلئے ایک آئین مرتب کریں، جسطرح سے بھی وہ چاہیں۔ اور اس مقصد کے لئے مناسب وقت پر آئین ساز اسمبلی کا اجلاس بلانا ہے۔ حکمران نے بھی اس خیال کی تائید کی اور ۵ مارچ ۱۹۴۸ء کے اعلان نامہ میں معمول کے حالات بحال ہونے پر نیشنل اسمبلی کے اجلاس بلانے کی گنجائش رکھی گئی۔ اکتوبر ۱۹۴۹ء میں حالات کا جائزہ لینے اور بھارت سرکار کے ساتھ صلاح و مشورہ کے بعد حکومت نے فیصلہ کیا کہ آئین ساز اسمبلی قائم کرنے کا وقت آچکا ہے اور اس فیصلہ کی تعمیل میں ووٹر فہرستوں کی تیاری کیلئے اقدام اٹھائے گئے۔ تاہم یہ بات مناسب سمجھی گئی کہ ریاست میں آئین ساز اسمبلی کا اجلاس بلانے کیلئے ایک اعلان نامہ جاری کیا جانا چاہئے اور ۵ مارچ ۱۹۴۸ء کے اعلان نامہ کے دفعہ ۴ سے ۶ تک منسوخ کئے جاتے ہیں کیونکہ وہ موجودہ ضروریات کو پورا نہیں کرتے ہیں۔ اس اعلان نامہ کی شرائط اور آئین ساز اسمبلی کے اختیارات پر بہت مدت تک بھارت

سرکار کے ساتھ خط و کتابت اور بات چیت ہوتی رہی اور وزیر اعظم مطمئن ہیں کہ بالآخر اس معاملہ میں ہماری سرکار اور بھارت سرکار کے نظریات کے مطابق ایک مکمل سمجھوتہ ہو چکا ہے۔ ساتھ میں بھیجے گئے اعلان نامہ کو مشترکہ طور دونوں حکومتوں نے تیار کیا ہے اور اسے بھارت سرکار کی مکمل تائید حاصل ہے۔ بھارت سرکار کی خواہش ہے کہ یہ اعلان نامہ جتنی جلد ممکن ہو جاری کیا جائے۔ اس لئے عرض ہے کہ اعلان نامہ پر شری یوراج کے دستخط ثبت کرنے کے فوراً بعد لوٹایا جائے۔"

دستخط

ایس۔ ایم۔ عبداللہ

۲۷، جنوری ۱۹۵۱ء

ان واقعات نے مجھے بہت ہی کشمکش و پیچ میں ڈالا۔ ایک طرف میرے والد کی یہ واضح ہدایت تھی کہ مجھے اعلان نامہ پر دستخط نہیں کرنے چاہئیں۔ اور دوسری طرف حکومت ہند اور شیخ محمد عبداللہ مجھ سے دستخط کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ میں نے فوراً دہلی پرواز کرنے کا فیصلہ کیا، جہاں میں نے گوپال سوامی آینگر سے ملاقات کی۔ جنہوں نے وزیر برائے ریاستہا کا چارج

سنبھالا تھا اور میں نے انکو پوری صورت حال سمجھائی۔ واپسی پر میں نے شیخ عبداللہ کی عرضداشت پر یہ نوٹ لکھا۔

"جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ مجھے مہاراجہ صاحب کے ۲۰ رجون ۱۹۴۹ء کے اعلان نامہ کے ذریعہ بنائے گئے ریجنٹ کے اختیارات حاصل ہیں۔ اعلان نامہ کا مسودہ جو آپنے اب میرے سامنے رکھا ہے ایک بہت ہی اہم دستاویز ہے جس میں ریاست کے مستقبل کے لئے دور رس نتائج شامل ہیں۔ وزارت برائے ریاستہائے نے مہاراجہ صاحب کو اعلان نامہ کا مسودہ انکی رائے کیلئے بھیجا تھا۔ اس پر مہاراجہ صاحب نے اُس وقت کے وزیر برائے ریاستہاء (مرحوم سردار پٹیل) کو اپنی رائے بھیجی اور اسی دوران مجھے اس معاملہ میں کسی اعلان نامہ پر انکی واضح اجازت کے بغیر دستخط نہ کرنے کی ہدایت دی۔

اسلئے آپ اتفاق کریں گے کہ جیسا کہ مجھے ابھی تک ایسی کوئی اجازت ان سے نہیں ملی، میں اس موقع پر اس مسودہ پر دستخط کرنے سے قاصر ہوں جو آپنے مجھے پیش کیا ہے۔ اسلئے میری یہ تجویز ہے کہ آپ ہند سرکار کو کہیں کہ وہ اس معاملہ کی مہاراجہ

کے پاس پیروی کریں۔

کرن سنگھ (ریجنٹ)

۱۴ رجنوری ۱۹۵۱ء

اس طرح سے معاملہ واپس بھارت سرکار کے دربار میں پہنچ گیا۔ اسی دوران میرے والد نے وکلاء کی ایک مشہور فرم "کانگا اینڈ کمپنی" کی رائے حاصل کی جو اس میمورنڈم کی بنیاد بنی جو انہوں نے بعد میں صدر جمہوریہ کو پیش کیا۔ وکیلوں کی رائے نے اس نظریہ کی حمایت کی کہ وہ بدستور حکمران تھے اور صرف انکو ہی آئین ساز اسمبلی قائم کرنے کے لئے اعلان نامہ پر دستخط کرنے کا اختیار تھا۔ بدقسمتی سے زیر بحث معاملہ قانونی نزاکتوں کا نہ تھا بلکہ سیاسی اختیار سے متعلق ٹھوس حقیقتوں والا تھا۔ وی۔ پی۔ مینن بمبئی میں میرے والد سے ملے اور پھر ۵۔ اپریل کو گوپال سوامی آئنگر نے انکو خط لکھا جس میں صورت حال کو یوں دوٹوک بیان کیا گیا۔

"تاہم حالات تب سے ریاست اور لیک سکسیس LAKE SUCCESS کے موقف دونوں لحاظ سے بہت بدل چکے ہیں جنہوں نے اس بات کو لازمی بنایا ہے کہ اعلان نامہ کے مسئلہ کو مزید دیر کیلئے نہ لٹکایا جائے۔ ہند سرکار آئین ساز اسمبلی کا اجلاس بلانے کا وعدہ کر چکی ہے جسکی تیاریاں ریاست میں

زور وشور سے جاری ہیں۔ اسمبلی کا اجلاس منعقد ہوگا چاہئے باضابطہ اعلان نامہ جاری ہو یا نہیں۔ ہند سرکار کی نظر میں یہ اجلاس بلایا جانا چاہئے۔ اگر اس کا کشمیری عوام سے کیا گیا وعدہ اور لیک سکسیس میں اسکے موقف دونوں کو ہر لحاظ سے روبہ عمل لانا ہے۔ شروع سے اس بات کو مان لیا گیا ہے کہ اس اسمبلی کو آئین ہند کے دفعات کے تحت بلانا چاہئے۔ اور یہ کہ اسکو تدبیر اور آئینی نقطہ نظر کے لحاظ سے ریاست کے سربراہ کے جاری کردہ اعلان نامہ کے تحت عمل میں لایا جانا چاہئے۔ اعلان نامہ کا مسودہ حکومت ہند اور جموّں وکشمیر کی سرکاروں کے درمیان طے پایا ہے۔ اسلئے سرکار کی کسی حرکت سے جو شری یوراج کو اس اعلان نامہ پر دستخط کرنے سے روکے، کوئی مقصد حاصل نہ ہوگا۔

جن دو معاملات پر آپ نے خدشات ظاہر کئے ہیں وہ سمجھ سکتا ہوں۔ یعنی ریاست جموں وکشمیر یا اسکے ایک حصّہ کا ہند کے ساتھ الحاق کی برقراری اور ریاست کی سربراہی کا آپکے شاہی خاندان سے تعلق کے بارے میں آئین ساز اسمبلی کے اجلاس میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں لیا جائیگا۔ یہ ایسے معاملات ہیں جو سمجھوتہ

کے طور پر ایک طرف حکومتِ ہند اور پارلیمنٹ کے درمیان طے ہونگے اور دوسری طرف حکومت جموّں وکشمیر اور ریاست کی آئین ساز اسمبلی یا قانون سازیہ کے درمیان طے ہونگے۔ اس میں شک نہیں کہ مناسب موقع پر حکومتِ ہند ان معاملات پر فیصلہ کرے گی جس کی مجھے آپکو یقین دہانی کرانا شاید ہی ضرورت ہو۔ یہ فیصلہ لازمی طور آپکے سلسلہ شاہی خاندان اور ریاستی عوام دونوں کے نقطہ نظر سے لیا جائیگا۔ اس معاملہ میں آپکو صریحاً ریاستی عوام اور حکومت ہند پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ اسلئے مجھے امید ہے کہ آپ فوری طور شری یُوراج پہ سے پابندی ہٹائیں گے جو آپ نے ان پر منظور شدہ مسودۂ اعلان نامہ پر دستخط کرنے کے سلسلہ میں لگائی ہے۔ جس نے قدرتی طور پر انکو بڑے شش وپنج میں ڈالا ہے۔"

اس خط نے میرے والد کو راضی کیا اور انہوں نے باضابطہ لکھا کہ انہوں نے پابندی ہٹادی ہے اور اب یہ معاملہ میرے اختیار میں تھا۔ کچھ دن بعد مجھے وی۔ پی۔ مینن سے ایک خط موصول ہوا جس میں مجھ سے اعلان نامہ پر دستخط کرنے کی درخواست کی گئی تھی اور اس پر میں نے ۲۱ اپریل کو دستخط کئے۔ اسی دوران شیخ محمد عبداللہ نے شروع میں اعلان نامہ پر دستخط نہ کرنے پر مجھے معاف نہیں کیا تھا۔ دباؤ جاری رکھنے کی خاطر انہوں نے

جتوں سے کچھ میل دور ۹۔ اپریل کو میرے والد پر ایک عوامی جلسہ میں شدید ذاتی حملہ شروع کیا۔ انہوں نے پھر میرے والدین پر ۱۹۴۷ء میں فرقہ وارانہ فسادات کو ہوا دینے کا الزام دیا اور کہا کہ اگر میں محتاط نہ رہا تو مجھے بھی اپنے والد کی طرح یہاں سے جانا ہوگا۔ میں نے فوراً انکو خط لکھا جسکی نقل میں نے جواہر لعل نہرو کو بھیجی جو ابھی کشمیر سے واپس لوٹے تھے۔ اس نقل کے ساتھ میں نے انکو ذاتی خط بھی بھیجا جس میں میں نے لکھا۔

"شیخ صاحب کے عوامی جلسہ میں اس طرح کی باتیں کرنے سے مجھے بہت رنج پہنچا۔ خاص طور پر اسلئے کہ وہ صداقت پر مبنی نہیں ہیں اور جو نتیجتاً بہت ہی گمراہ کن ہیں"۔

شیخ صاحب نے میرے خط کا پانچ صفحوں والے ایک طویل مراسلہ کی صورت میں جواب دیا جس میں انہوں نے یہ بات واضح کردی کہ انکو مجھ سے یہ امید تھی کہ میں انکی سرکار کے سچ مچ ایک ایجر کے طور پر کام کروں یہانتک کہ عوام میں نمودار ہونے سے پہلے ان سے مشورہ کروں اس خط سے ظاہر ہوا کہ اگرچہ وہ مجھے بحیثیت ریاست کے سربراہ کے برداشت کریں گے وہ میرے خاندان سے دلی نفرت پر قابو پانے سے قاصر تھے۔ اس زمانہ میں وہ بہت ہر دلعزیز تھے تاہم میں وقتی طور پر چپ رہنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے جواہر لعل کے ساتھ اپنا رابطہ قائم رکھا۔ جب بھی میں دلی جاتا میں اُن سے ملتا اور وہ بہت سے معاملات پر تفصیل سے گفتگو کرتے۔ کشمیر کو انکے ذہن میں ہمیشہ فوقیت حاصل

تھی اور اس دوران میرے نام بہت سے انکے ایسے خطوط تھے جو ریاست سے متعلق اندرونی اور بین الاقوامی کئی معاملات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ ان میں میرے لئے کچھ چاہت پیدا ہوگئی تھی کیونکہ وہ ہمیشہ بجا طور پر مجھے دیکھ کر خوش لگتے تھے۔ ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو میرے والد کے نام ایک خط کے اختتام پر لکھتے ہیں۔

"میں نے ٹائیگر کو وقتاً فوقتاً دیکھا اور میں نے انکو بہت زیادہ پسند کرنا شروع کیا۔ وہ ایک عمدہ نوجوان ہیں۔ اور میرے خیال میں انکی خوبیاں انہیں مشکلات کا سامنا کرنے کے لائق بنا دیں گی۔ میں یقیناً انکی ہر طرح سے مدد اور راہنمائی کروں گا۔"

میں نے اس کا حوالہ اسلئے دیا کیونکہ اس سے ان حالات کی سمت کا اشارہ ملتا ہے جو بعد میں رونما ہوئے اور اسلئے بھی کہ اس سے پتہ لگتا ہے کہ شیخ عبداللہ کی مخصوص حیثیت کے باوجود مطلب یہ نہیں تھا کہ جواہر لعل نہرو دوسرے نقطہ نظر کو نہ سنتے تھے۔ ڈی۔ پی۔ دھر کی بھی جواہر لعل نہرو کے ساتھ براہِ راست رسائی تھی اور ہم کسی حد تک مسلم جارحیت کا توڑ کرتے تھے جسکی نمائندگی شیخ محمد عبداللہ اور نیشنل کانفرنس میں مرزا افضل بیگ کی قیادت میں سخت مزاج افراد کر رہے تھے۔ اس سلسلہ میں جواہر لعل کی نفسیات دلچسپ تھی۔ اگر وہ کسی کے خلوص کو رد کرتے تو تب اس طرف

کسی بھی نظریہ یا مشورہ پر فوراً شک کرتے تھے ۔ پس جموں کے پرجا پرشد کے لیڈروں سے انکو خاص چڑ تھی کیونکہ انکے خیال میں وہ فرقہ پرست تھے اور انکی حرکات کشمیر کے بارے میں بھارت کی حیثیت کو خطرے میں ڈالتی تھیں ۔ لیکن اگر وہ کسی پر اعتماد کرتے اور جہاں تک انکے دوستوں کا سوال تھا تو وہ انکی غلطیوں کی حد تک بھی انکے وفادار تھے اور اُنکے نظریات کو غور سے سنتے اگر وہ انکی سوچ سے مطابقت نہ بھی رکھتے ہوں ۔

اس سال جون کے شروع میں جواہر لعل نے سرینگر کا دورہ کیا بظاہر شیخ عبداللہ نے انہیں انکی چند ہفتے پہلی جموں والی تقریر کی پاداش میں ہماری نوک جھوک کے بارے میں کہا تھا اور یہ تجویز پیش کی تھی کہ میرے اسٹاف میں ایک سیکریٹری مقرر کیا جانا چاہئے ۔ جواہر لعل نے مجھے اس بارے میں چشمہ شاہی ہاؤس سے لکھا جہاں وہ ہمیشہ رہنا پسند کرتے تھے ۔ یہ ہاؤس ہمارا تھا اور یہیں پر ۱۹۲۱ء میں میرے والدین کی شادی ہوئی تھی ۔ بعد میں اسکو ایک مخصوص مہمان خانہ کے طور پر استعمال کیا گیا اور سرتیج بہادر سپرو یہاں اپنے افراد خانہ کے ہمراہ گرمیوں میں کئی ہفتے قیام کرتے ۔ بعد میں یہ سوامی سنت دیو کی قیامگاہ رہی اور ۱۹۴۷ء کے بعد یہ جواہر لعل کی پسندیدہ رہائش گاہ بنی ۔ اس مکان سے جھیل ڈل کا شاندار نظارہ کیا جا سکتا ہے ۔ شنکر چاریہ اور ہاری پربت پہاڑیوں اور انکے پیچھے اونچے پہاڑوں کے مسلسل

مناظر بھی دیکھے جا سکتے ہیں ۔ یہاں سے غروب آفتاب کے مناظر دیکھنے خاص طور سے دلفریب یا دلکش ہوتے ہیں ۔ اور جواہر لعل خاموشی سے برآمدے میں بیٹھ کر افق کے نیچے سورج کو ڈوبتے ہوئے دیکھتے ۔

اسی دوران میں بی ۔ اے ۔ کے امتحان کی تیاری میں لگا ہوا تھا جبکہ آشا نے بھی انگریزی اور ہندی سیکھنا شروع کیا تھا اور اسکے ساتھ ساتھ انہوں نے پینٹنگ سیکھنا بھی شروع کی تھی ۔ ہماری زندگی ایک قاعدے سے چلنا شروع ہو رہی تھی ۔ صبح میں ہم اپنے پرائیویٹ معلموں سے دو گھنٹے پڑھتے جسکے بعد میں افسروں اور ملنے والوں سے کچھ رسمی ملاقاتیں کرتا ۔ ہفتے میں دو یا تین بار ہم لوگوں کو دوپہر کے کھانے پر بلاتے ۔ جن میں سیر پر آئے ہوئے عہدیدار جیسے کہ بیرونی سفیر، اقوام متحدہ کے افراد اور مقامی حضرات شامل ہوتے تھے ۔ آشا نے گفتگو کرنے کیلئے انگریزی سیکھنا شروع کی تھی لیکن ابھی وہ شرما رہی تھیں اسلئے مجھے دونوں کی طرف بات چیت کرنا پڑتی تھی جو اکثر فرحت انگیز ہوتی تھی ۔ ہم کھانے کی میز پر ایکدوسرے کے آمنے سامنے بیٹھتے، مہمان ہمارے دونوں اطراف فہرست کے مطابق ترجیحی بنیاد پر بیٹھتے ۔ ہماری میز پر زیادہ سے زیادہ سولہ افراد آتے تھے اس لئے پارٹیاں بے تکلف ہوتی تھیں ۔ برسوں میں نے ان پارٹیوں کو بہت فائدہ مند پایا کیونکہ لوگوں کا ایک وسیع دائرہ جس میں بعض بہت ذہین اور تحریک پیدا کرنے والے ہندوستان کے کئی حصوں اور بہت

سے دیگر ممالک سے آتے۔ ہمیشہ جلدی سیکھنے والا ہونے کی بدولت میں نے ان پارٹیوں میں ہوئی گفتگو سے قیمتی عام معلومات اور خیالات سیکھے تصورات میں دلچسپی رکھنے کے علاوہ' میں نے اپنے آپ کو تعلیم کی طرف کھینچتے ہوئے پایا۔ اور اس بات نے مجھے اپنے والد کو یہ تجویز کرنے پر آمادہ کیا کہ ہم اپنا سرینگر کا بڑا محل گلاب بھون جموں وکشمیر کی نئی قائم شدہ یونیورسٹی کو نذرانہ کے طور پر دیں گے۔ میں نے اس کا ذکر جواہر لعل نہرو اور گوپال سوامی آئنگر سے کیا۔ جنہوں نے موافق رد عمل کا اظہار کیا۔ جواہر لعل نے لکھا۔

" مجھے یہ جانکر بہت مسرت ہوئی کہ آپ گلاب بھون محل کو جموں وکشمیر یونیورسٹی کو نذرانہ کے طور پر دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اسطرح سے آپ عمارت کا بہترین استعمال کریں گے اور مجھے یقین ہے کہ لوگ اس کی سراہنا کریں گے۔"

اس وقت میرے والد ہندوستان سے باہر تھے لیکن اُن کے پرائیویٹ سیکرٹری بھیم سین ماہی (کمیونسٹ لیڈر دھنونتری ماہی کے بھائی) سرینگر آئے ہوئے تھے اور میں نے انکو اس نذرانہ کے بارے میں اپنے خیالات میرے والد کو گوش گذار کرنے کو کہا تھا۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اسی اثناء میں گوپال سوامی آئنگر نے میرے والد کو اس پیش کش کے بارے میں لکھا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اسے قبول کریں۔ میں نے واپس خط لکھا جس میں' میں نے ان وجوہات کی وضاحت کی جنہوں نے مجھے یہ تحفہ دینے کی تجویز پیش کرنے پر اکسایا اور یہ کہتے ہوئے میں نے اس کا خلاصہ پیش کیا۔

" ان وجوہات پر غور کرتے ہوئے' ایک تیزی سے ابتر ہو رہی عمارت اور جو یونیورسٹی کیلئے بے حد مناسب رہے گی اور جو یوں ہی بے کار اور فراموش پڑی ہوئی ہے اور یہ حقیقت کہ ہماری یونیورسٹی کو ایک مناسب عمارت کی بہت ضرورت ہے اور یہ کہ تعلیم سے بڑھ کر بلند اور لائق مقصد کو حاصل کرنا ممکن نہیں۔ میں دیانتداری سے محسوس کرتا ہوں کہ اس عمارت کو نذرانہ میں دینا آپکا ایک شاندار کارنامہ ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا عوام پر برق رفتاری سے اثر پڑیگا۔"

تاہم میرے والد نے اتفاق نہ کیا اور جواب میں غصّہ سے کہا " جموں وکشمیر سرکار نے مجھے ذاتی طور حد سے زیادہ ستایا اور ہمارے خاندان کو عوام کی نظروں میں ذلیل کیا۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس بات کو ذہن نشین کریں گے کہ موجودہ حالت میں تحفہ دینے کا غلط مطلب لیا جائیگا۔ اسکے پیچھے عظیم مقاصد

ہی کارفرما کیوں نہ ہوں۔ یہ ایک اور مثال ہوگی جس میں
حکمران غیر اہم اور ہیچ ثابت ہوگا۔"

اور یہاں پر وقتی طور معاملہ ٹھپ ہوگیا۔ اسکے فوراً بعد گلاب بھون کو ایک خوبصورت ہوٹل میں تبدیل کیا گیا جو کشمیر آنے والے سیاحوں کو پہلی بار شاندار رہائش گاہ فراہم کر رہا تھا۔ تاہم میں نے یونیورسٹی کیلئے اپنے وعدہ کو نہیں بھولا اور کچھ برس بعد میں نے حضرتبل کے نزدیک ۱۲۰ ایکڑ کا باغ (جسکو میرے دادا کے نام گلاب سنگھ باغ کہا جاتا تھا) کشمیر یونیورسٹی کو تحفہ میں دیا جہاں موجودہ یونیورسٹی قائم ہے۔

اکتوبر کے آخر میں، میں بی۔ اے کے امتحان میں شریک ہوا۔ چونکہ میں چانسلر تھا اسلئے یونیورسٹی حکام نے میرے گھر پر مخصوص سنٹر کھولنے کی پیش کش کی لیکن میں نے سوچا کہ یہ بیجا نامناسب ہوگا۔ اسلئے میں نے دوسرے طلباء کے ساتھ سری پرتاب کالج مرکز پر امتحان دینے کا فیصلہ کیا۔ مجھے صرف ایک اونچی کرسی اور ڈیسک کی رعایت ملی تھی کیونکہ سخت کولہے کیوجہ سے مجھے نیچی کرسی پر بیٹھنے میں دقت ہوتی تھی۔

۵ نومبر ۱۹۵۱ء کو جموں و کشمیر آئین ساز اسمبلی کا اجلاس ہوا۔ اس معزز ایوان کا چناؤ پہلے ہوا تھا جسے میں نے ایک اعلان نامہ کے ذریعہ طلب کیا تھا لیکن جو واحد مؤثر گروپ جموں کے پرجا پرشید کا تھا اس نے صحیح معنی میں ان چناؤں کا بائیکاٹ کیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۷۵ میں سے ۷۲ ممبر نیشنل کانفرنس کے ٹکٹ پر بلامقابلہ

چن لئے گئے۔ پرجا پریشد کے تین ممبر چن لئے گئے جن میں آزمودہ کار ایک کافی معزز لیڈر پنڈت پریم ناتھ ڈوگرہ بھی شامل تھے۔ میں نے پہلے اجلاس میں شرکت نہیں کی لیکن شیخ عبداللہ کیلئے یہ بیشک بہترین گھڑی تھی جسکا انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ کسی حد تک اپنے طمطراق اور ابتدائی رنگین خطاب میں انہوں نے تھامس اقیوناس کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔

"مستقبل کیلئے ملک کی حکمرانی کیلئے آئین مرتب
کرنے کے علاوہ یہ اسمبلی الحاق سے متعلق فیصلہ کا اعلان
کرے گی۔ اور سرکار کی طرف سے پاس کئے گئے زرعی اصلاحات
پر بھی غور و خوض کرے گی۔"

لطف لیکر انہوں نے مزید کہا۔

"دوسرا جو اہم معاملہ قوم کو درپیش ہے وہ شاہی
خاندان کے مستقبل سے ہے:"

اپنے نقطہ نظر سے ڈوگرہ شاہی کے بارے میں تاریخی پس منظر کے طویل ذکر اور اس کی کارکردگی کے بعد انہوں نے میرے والد کے خلاف شدید نکتہ چینی شروع کی۔ انہوں نے کہا۔

"عوام کے ہاتھ میں مکمل اختیارات آنے کے بعد
مہاراجہ ہری سنگھ کو ریاست کا پہلا آئینی سربراہ تسلیم کرنا
خیرخواہی کا مناسب قدم رہتا، لیکن مجھے یہ کہنا چاہئے

کہ انہوں نے عوام کے ہر طبقہ کا اعتماد کھو دیا ہے۔ ان کی نئے حالات سے سمجھوتہ کرنے کی نااہلیت اور اہم معاملات کے بارے میں انکے قدامت پسند نظریات ایسی باتیں ہیں جو انکو ایک جمہوری ریاست کے سربراہ کے عہدہ کیلئے نااہل بنا رہی ہیں۔"

تاہم آگے چل کر انہوں نے مجھے ریاست کا سربراہ بنانے کی پُر زور وکالت کی۔ انہوں نے یوں کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی مہاراجہ کے خاندان سے متعلق ذاتی مباحثہ میں دلچسپی نہیں رکھتا ہے۔ عوام سے برتاو کے بارے میں یہ ضروری ہے کہ ہر شخص کے ذاتی اعمال کو غیر جانبداری سے دیکھا جائے ہمارا فیصلہ ذاتی رنجش اور عداوت پر منحصر نہیں ہونا چاہئے۔ ان پچھلے برسوں میں یوراج کرن سنگھ کے ساتھ صحبت کے دوران' میں اور حکومت کے دیگر رفقاء یوراج کی ذہانت' انکے وسیع نظریہ اور انکی ملک کی خدمت کرنے کی شدید خواہش سے متاثر ہوتے ہیں۔ یوراج کی یہ خصوصیات انہیں ریاست کے سربراہ کی عزت افزائی کیلئے مناسب اور ممتاز بنا رہی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بحیثیت ریاست کے باشندہ کے یوراج کرن سنگھ اپنے آپ کو جمہوری نظام کی منتقلی میں بہترین نمونہ ثابت کریں گے۔ جس میں کل کا حکمران عوام کا اولین خادم بن جاتا ہے' جو عوام کے منشاء کے تابع اور انکی طرف سے کام کرتا ہے۔"

صاف طور پر یہ ایک تصفیہ تھا جس کو جواہر لعل نہرو نے ہند سرکار کے نمائندوں کے ساتھ طویل بحث و مباحثہ کے بعد ڈھونڈا تھا۔ ایک طرف سے یہ ڈوگروں کے جذبات کو بھڑکانے سے احتراز کرنے کی ایک سیاسی چال تھی اور دوسری طرف اس کا مقصد ہمارے خاندان کی آئینی حیثیت کو چالاکی سے قائم رکھنا تھا۔ کیونکہ ہند سلطنت کے ساتھ جموں و کشمیر کے الحاق کا قانونی اور آئینی دارومدار دستاویز الحاق پر تھا جس پر میرے والد نے دستخط کئے تھے اور اب ایسے شخص کو وہ اسمبلی سے باہر دھکیل رہی تھی جبکہ اجلاس اس کے بیٹے اور ریجنٹ کی حیثیت سے میں نے ایک اعلان نامہ پر دستخط کرکے بلایا تھا۔ اسلئے ایک عجیب آئینی پیچیدگی پیدا کی گئی تھی۔ کیونکہ جواہر لعل نہرو اور شیخ عبداللہ دونوں کا خیال تھا کہ میرے باپ کو مکمل طور پر سیاسی افق سے ہٹا دینا ایک سیاسی مجبوری تھی۔ اس غیر معمولی صورت حال میں' میں بالکل مناسب بیٹھا تھا اور سبھی متعلقہ پارٹیوں کو کسی حد تک خجالات سے بچا سکتا تھا۔

حل چاہئے کتنا ہی سلجھا ہوا تھا' حقیقت میں یہ تبھی چل سکتا

تھا جب مجھے یہ قبول ہو۔ اور اس صورت نے مجھے اکیس برس سے کم عمر میں اب تک کے اپنے پُرجوش سیاسی کیریر میں سب سے زیادہ کشمکش و پیچ میں ڈال دیا۔ بعد میں مجھے بہت سے موقعوں پر مشکل اور اہم فیصلے لینے پر مجبور کر دیا گیا۔ لیکن یہ فیصلہ میری یادداشت میں سب فیصلہ جات میں شدید ترین اذیت رساں فیصلہ کے طور پر محفوظ ہے۔

باب ۱۱

شخصی راج کے خاتمہ کے بعد یہ مباحثہ تیزی سے متحرک ہوا خاص طور پر جموں میں کہ آیا مجھے ریاست کے منتخب سربراہ کا عہدہ قبول کرنا چاہئے کہ نہیں۔ جموں والے پہلے ہی اس بات پر برانگیختہ تھے کہ میرے والد کو کس طرح دستاویز الحاق پر دستخط کرنے کے بعد نظام حیدرآباد کے بالکل برعکس جلاوطن کیا گیا تھا جو بدستور اپنی ریاست کے اندر قیام پذیر رہے حالانکہ انکی حکومت نے نئی ہند سلطنت کو چیلنج کیا تھا یہاں تک کہ اس کے خلاف ہتھیار اٹھائے تھے۔ جموں کے عوام نے ڈوگروں کے خلاف موقف اور شیخ محمد عبداللہ اور انکے ساتھیوں کی تقاریر کے سلسلہ میں سخت ردِ عمل دکھایا۔ دراصل آزادی کے بعد

ملک بھر کے حکمران خاندان زوال پذیر ہو رہے تھے اور وہ مؤثر حکمرانی کھو چکے تھے لیکن شیخ عبداللہ کا ہمارے شاہی سلسلہ کو ختم کرنے کا خاص ڈرامہ جموں کے ڈوگروں کو بیحد ناگوار گذر رہا تھا۔ ان حالات میں میرے پہلے نام و نہاد سربراہ ریاست کا عہدہ قبول کرنا بہت سوں کی نظر میں غداری کے مترادف تھا جس سے شیخ عبداللہ کی حرکات کو جوازیت کی دلیل مہیا ہو سکتی تھی۔ جس طریقہ پر میرے والد کے ساتھ برتاؤ کیا گیا تھا اس پر وہ حق بجانب غصہ میں بھرے ہوئے تھے۔ مجھے بادل ناخواستہ ریجنٹ مقرر کرنے کے بعد یہ خیال کہ دور رکھکر انہیں ختم کرنے کے بعد میں ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے عہدہ سنبھالوں یہ انکے لئے بہت ہی ناخوشگوار تھا۔ اور ۱۹۵۳ء کے ڈرامائی واقعات کے بعد ہی وہ جزوی طور پر صورت حال سے مصالحت کر پائے۔

گذرے برسوں پر نظر دوڑانے سے میں اچھی طرح سے انکے جذبات کو سمجھ سکتا ہوں۔ تاہم زمانہ کے علاوہ کچھ اور باتیں کارفرما ہیں۔ شاید کسی گہری نفسیاتی خواہش کی وجہ سے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ میں اپنے بل بوتے پر چل سکتا ہوں۔ ایک وجہ یہ تھی کہ مجھے یقین تھا کہ چاہے میں مانوں یا نہ مانوں شیخ محمد عبداللہ آگے بڑھنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ اور

اگر میں نے انکار کیا تو وہ آسانی سے میرے بجائے کسی اور کو منتخب کریں گے۔ دراصل نیشنل کانفرنس کے کچھ حلقوں میں پونچھ کے ایک ہریجن لیڈر مہاشہ نہار سنگھ کے نام کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ پس میرے انکار کرنے کا مطلب یہ تھا کہ مجھے بھی جلاوطنی کی حالت میں بمبئی میں اپنے باپ کے پاس جانا تھا۔ شیخ عبداللہ میری موجودگی کو ریاست میں مشکل سے ہی برداشت کر سکتے تھے کیونکہ میری موجودگی ڈوگروں کی مزاحمت اور بے اطمینانی کا ایک امکانی مرکز بنی رہتی۔ یہ کہ نہ صرف بمبئی میں مستقل طور پر رہنے کا امکان دلچسپی سے خالی تھا بلکہ اسکا یہ مطلب بھی نکلتا کہ ہمارے خاندان کا آخری رابطہ بھی ریاست سے منقطع کرنا تھا۔ مجھے کوئی شک نہیں تھا کہ اگر میں چلا گیا تب خاندان کا کوئی فرد وہاں نہ رہتا اس لئے شیخ عبداللہ مناسب وقت پر نہ صرف ہماری جائداد اور زمین چھین لیتے اور اس کے ساتھ ہمارے بزرگوں کا قائم کردہ مذہبی اور خاندانی ٹرسٹ بھی لے لیتے۔

تاہم ذاتی وجوہات کے علاوہ، اس پورے معاملہ میں وسیع پیچیدگیاں تھیں جنکا تعلق قومی مفاد سے تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ نئی حیثیت پر برقرار رہنے سے میں غالباً اس نازک اور حساس ریاست میں قومی مفاد کو تحفظ دینے میں فائدہ مند رول ادا کرنے کے قابل ہوں اور ظاہر ہے کہ جواہر لعل نہرو

بھی یہی چاہتے تھے۔ پس ایک بار پھر جواہر لعل نہرو اور میرے والد کے درمیان ٹکراؤ میری زندگی کی مرکزی خصوصیت بنی۔ میرے والد کے اسٹاف کے کئی ارکان اور سینئر ڈوگرہ لیڈروں کے ذریعہ میرے اوپر زبردست دباؤ ڈالا گیا۔ مجھ سے کہا گیا کہ اگر میں نے اس عہدہ کو قبول کیا تو یہ ڈوگروں کو کشمیریوں کے ہاتھ بیچنے کے مترادف ہوگا اور تاریخ میں اس سلسلہ شاہی کے تئیں غدار مانوں جاؤں گا جسے مہاراجہ گلاب سنگھ نے قائم کیا تھا اور یہ کہ اگر میں نے والد کی خلاف ورزی کی تو مجھے کئی کروڑوں کی اپنی آبائی جائداد سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

ان راست حملوں کے علاوہ اور بھی دلائل تھے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ پورا انتظام شیخ محمد عبداللہ کی طرف سے ایک طرح سے احتیاط سے تیار کیا ہوا جال تھا۔ ہمارے خاندان سے دلی نفرت کے پیش نظر کیا وہ میری چشم پوشی سے شاہی سلسلہ کا خاتمہ حاصل کرنے کے بعد جلد ہی کوئی نہ کوئی بہانہ تراش کر کے میرے خلاف ہو کر مجھے چلتا نہیں کریں گے؟ کیا حال ہی میں انہوں نے جموں کے ایک عوامی جلسے میں میری ملامت نہیں کی تھی اور میری پوزیشن مشکل بنانے میں انہیں کونسی چیز روک سکتی تھی تاکہ یا تو میں خود ہی کشمیر چھوڑنے پر مجبور ہو جاؤں یا یہ کہ مکمل ذلت کا سامنا کروں؟ کیا

شیخ عبداللہ نے رفتہ رفتہ ہند سرکار کو میرے والد سے کئے گئے سبھی وعدوں سے انحراف کرنے پر مجبور نہیں کیا اور کیا وہ نئے وعدوں کے بارے میں جو مجھ سے کئے جائیں گے ایسا ہی نہیں کریں گے؟

پس اسلئے میں ایک بھیانک کشمکش و پیچ میں مبتلا تھا، آیا اس عہدہ کو قبول کروں یا نہ کروں۔ اس طرح کی صورت حال میں میری جبلت کوشش کرنا اور وقت لینا تھا اور ایسا میں نے بہت ہی مضبوط بنیاد پر کیا۔ شیخ محمد عبداللہ کی سرکار، ہند سرکار کے ساتھ نئے آئینی انتظامات، جس پر نہ صرف ریاست کے سربراہ کا مسئلہ شامل تھا، بلکہ دوسرے اہم معاملات، شہریت، بنیادی حقوق، سپریم کورٹ، اقتصادی یکجہتی، جھنڈا، صدر کے قتل کے مجرم کو معاف کرنے کا اختیار اور دوسرے متعلقہ معاملات شامل تھے، کی تفصیل گفت و شنید کی کارروائی میں مصروف تھی۔ جواہر لعل نہرو نے ان معاملات کے بارے میں ۲۶، جولائی ۱۹۵۲ء کو ایک خط لکھا جس میں انہوں نے اور باتوں کے علاوہ کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ جو میں لکھ رہا ہوں اسکی آپ قدر کریں گے۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس وقت اور آئندہ آپ میرے ذہن میں رہیں گے اور آپ ہمیشہ مشورہ یا مدد جو میں دے سکتا ہوں کے لئے میرے پاس آسکتے ہیں۔ بہترین مشورہ یہ ہے کہ تجویز شدہ

تبدیلیوں کو خوشی خوشی رضامندی سے قبول کریں اور اسکی بدولت آپ اپنے آپ کو سب سے آگے رکھیں بجائے اسکے ایسا لگے کہ آپ نے بادِل ناخواستہ ایک ایسی بات کو قبول کیا جسے آپ ناپسند کرتے ہیں۔ اگر ہمیں کچھ کرنا ہے، ہمیں اُسے خوش اسلوبی سے کرنا چاہئے اور اسکے ذریعہ دوسروں کی خیرخواہی اور عزت حاصل کریں۔"

جواب میں، میں نے ترغیب دینے والی دلیل پر اظہار خیال کیا۔ میں نے کہا۔

آگے لکھنے سے پہلے، میں آپ کا بہت شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جو آپ نے پچھلے تین برسوں کے دوران جب سے میں ریجنٹ بنا، معاملات کے بارے میں ہمدردانہ اور مشفقانہ دلچسپی لیتے رہے۔ مجھے یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ میں کسقدر آپکی رہنمائی اور مشورہ کی قدر کرتا ہوں۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ مجھے پانچ برس کے لئے منتخب سربراہ ریاست کا عہدہ قبول کرنا چاہئے یا نہیں۔ دس روز پہلے جو آپ نے پارلیمنٹ میں تقریر کی تب سے میں اس معاملہ کے مختلف پہلوؤں پر بے حد گہرائی سے غور کرتا رہا ہوں۔

میری سب میں بڑی خواہش یہ ہے کہ میں مؤثر طور

پر اپنے ملک کے عوام کی خدمت کرنے کے لائق بنوں اور کوئی بھی حیثیت جو مجھے یہ موقعہ فراہم کرے اسکی قدرتی طور پر خوش آمدید کرتا ہوں۔ تاہم موجودہ صورت حال میں، میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے لئے تب تک کسی نتیجہ پہ پہنچنا ممکن نہیں جب تک آئین ساز اسمبلی سے حتمی طور پر کشمیر کا آئین برآمد نہیں ہوتا اور جب تک اسے بھارت سرکار کی منظوری حاصل نہیں ہوتی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اتفاق کریں گے کہ صاف اور واضح طور پر اس عہدہ سے منسلک فرائض اور کام کاج اور ذمہ داریاں جو مجھے نبھانا ہوں گی اور شرائط جن کے تحت مجھے کام کرنا ہوگا، جانے بغیر اس عہدہ کو قبول کرنا شاید ہی میرے لئے ممکن ہے۔"

اسکے بعد شیخ عبداللہ نے مجھ سے ملاقات کی۔ پھر کہا کہ مجھے جلدی فیصلہ کرنا چاہئے کہ آیا میں صدر ریاست کا عہدہ قبول کروں یا نہ کروں۔ میں نے ایسے دلائل پر زور دیا لیکن انہوں نے انہیں یہ کہتے ہوئے کہ آئین مرتب کرنے میں شاید کافی وقت لگے گا اور وہ تب تک انتظار کرنے کیلئے تیار نہ تھے، رد کر دیا۔ میں نے اس برتاؤ کے خلاف احتجاج کے طور پر جواہر لعل نہرو کو خط لکھا۔ کچھ دن بعد ۸۔ اگست کو انہوں نے تین صفحوں پر مشتمل خط کے ذریعہ

جواب دیا۔ پورے آئین کو مرتب کرنے تک انتظار کرنے والے
میرے نقطہ نظر کے سلسلہ میں انہوں نے کہا۔

" میں آپ سے بالکل اتفاق کرتا ہوں کہ
آئین کے ایک حصے پر زبردستی آگے بڑھنے
کا کام نہ تو باقاعدہ ہے اور نہ ہی عام طور پر
مناسب ہے۔ مناسب طریقہ یہ رہتا کہ پہلے
پورے آئین کو منظور کیا جاتا اور تب اس پر
عمل کیا جاتا۔ لیکن جب کشمیر کا وفد یہاں
تھا تو ہم نے اس معاملہ پر تفصیل کے ساتھ
بحث کی اور بالآخر ہم جن نتائج پر پہنچے انکو
تصفیہ کے نقطوں کے ساتھ شامل کیا۔ ان پر
پھر غور کرتے اور دلائل کو دوبارہ زندہ کرنے
سے کوئی خاص فائدہ نہیں۔ بہت کچھ کیا جاچکا
ہے جسے اس موقع پر ختم نہیں کیا جاتا اور
اس قسم کی کوئی کوشش مزید پیچیدگیاں
پیدا کرے گی۔ اس لئے موجودہ پوزیشن کو
جیسی بھی ہے' ہمیں قبول کرنا ہے۔ اس کا
مطلب ہے کہ ریاست کے سربراہ کے متعلق
آئین کا حصہ اسی صورت میں قبول کرنا چاہئے

جس پر تصفیہ ہو چکا ہے"۔

اور خط کے اختتام پر انہوں نے مندرجہ ذیل نصیحت کی۔

" آپکا اسے قبول نہ کرنا نہ صرف ریاست
کیلئے برا ہوگا لیکن اس موقع پر آپکے لئے بھی
کوئی سودمند نہ ہوگا۔ آپ نے مجھ سے ملک
سے باہر تعلیم حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی'
ایک برس یا اس سے زیادہ ملک سے باہر رہنے
سے شاید آپکا بھلا ہو۔ لیکن ہم زندگی اولیں
کے مسائل کے بارے میں محض جغرافیائی ماحولیاتی
تبدیلیوں کے بجائے ان کا مقابلہ کرنے سے زیادہ
جانکاری حاصل کرتے ہیں۔ آپکے پاس غالباً
تعلیم کیلئے بہت سارا وقت رہیگا۔ آپ اس
کی طرف مائل ہیں پس آپ اپنے آپ کو ملک
سے باہر جاکر۔ ریاست کے اندر کئی طریقوں سے
بہتر طور پر تیار کر سکتے ہیں۔ بیشتر بیرونی
ممالک جنگ کے شور اور اسکی تیاری سے
بھرے ہوئے ہیں اور مختصر دوروں کے
علاوہ یہ جگہیں خوشگوار نہیں ہیں۔
میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کے لئے

تاکہ اگر مستقبل میں کوئی مشکل درپیش آئے تو میں کام آؤں۔
جب میں نے انکی حمتوں کی رائے عام کے بارے میں اپنی مشکل بتائی تو انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا کہ میں حمتوں کے کچھ لیڈروں کو بات چیت کیلئے سرینگر بلاؤں۔ یہ جاپر شید سے انکی مانی ہوئی چڑ کے پیش نظر یہ انکے نظریہ میں ایک بڑی تبدیلی تھی اور اس سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی تھی کہ انہیں میری مشکلات کا احساس تھا۔

اس دورے کے دوران، ایک چائے کی دعوت کے موقعہ پر جس کا اہتمام جواہر لعل نہرو نے تین مورتی ہاؤس کے لان میں کیا تھا، میری ملاقات سی راجا گوپال آچاریہ سے ہوئی جو اس وقت مدراس کے وزیر اعلیٰ تھے۔ چونکہ میں پہلے ان سے اس وقت ملاقات کر چکا تھا کئی برس پہلے جب وہ گورنر جنرل تھے۔ میں انکے پاس گیا اور خوش آمدید کہا۔
"شاید آپ مجھے نہیں پہچانتے ہونگے" میں نے کہا۔ "میں کرن سنگھ ہوں"۔ وہ پلٹے اور میری طرف دیکھکر کہنے لگے، "بیشک میں آپ کو پہچانتا ہوں۔ آپکی آنکھیں اس قدر خوبصورت ہیں" اکثر میں الفاظ کی کمی محسوس نہیں کرتا ہوں لیکن اس لمحہ میری زبان گنگ رہی۔ میں نے مولانا آزاد سے بھی ملاقات کی جو تہذیب اور علم کا مجسمہ تھے اور

مناسب رہیگا کہ آپ جس طریقہ پر میں نے تجویز کیا پیش کش کو قبول کریں اور اسطرح بجا طور پر اپنے آپ کو اپنے لوگوں میں شامل کریں اور کئی طرح انکی بہت سی خدمات انجام دیں، جو بظاہر زیادہ دکھائی نہ دیتی ہوں لیکن جو اہم ہیں۔ اگر موقع کا تقاضا ہو پھر بعد میں آپکو اپنی مرضی کی آزادی حاصل رہیگی"۔

میں نے دلی جاکر ذاتی طور اس معاملہ پہ بات چیت کرنے کا فیصلہ کیا جواہر لعل نے حسب معمول تین مورتی ہاؤس کے شاندار ڈرائینگ روم میں میرا شفقت کے ساتھ استقبال کیا۔ اس وقت وہ اقتدار کی بلندیوں پر تھے انہوں نے نرم انداز مگر بڑے اعتماد کیساتھ باتیں کیں۔ انہوں نے مجھے تفصیل سے سمجھایا کہ وہ اور انکے ساتھی آرزومند تھے کہ مجھے پیش کش کو قبول کرنا چاہئے۔ یہ ظاہر تھا شیخ عبداللہ کی آئین پر گفت وشنید کرنے والی ٹیم نے سخت رویہ اپنایا جو انکے علاوہ مرزا افضل بیگ، ڈی پی۔ دھر اور انکے آئینی مشیر ایم۔ اے۔ شاہمیری پر مشتمل تھی، کیونکہ پہلی بار میں نے جواہر لعل کے لہجہ میں شیخ عبداللہ کے بارے میں ناراضگی کا خفیف سا اشارہ دیکھا۔ حالانکہ انہوں نے واضح الفاظ میں نہیں کہا لیکن میں نے نمایاں تاثر کا اندازہ لگایا کہ وہ مجھے موقع پر موجود دیکھنا چاہتے تھے۔

کر مولانا آزاد، ڈاکٹر کے۔ این کاٹجو جو اس وقت وزیر داخلہ تھے اور گوپالا سوامی آئنگر، منسٹر برائے کشمیر معاملات کو جموں کے لیڈروں سے ملنا چاہئے اور انکی بات کو ہمدردی سے سننا چاہئے میں نے خط کے اختتام پر اپنے والد کے افواہی رپورٹ کا ذکر کیا حالانکہ میں جانتا تھا کہ اس پر جواہر لعل خوش نہیں ہونگے لیکن میں نے اپنے آپکو خط کو اس پیرا پر ختم کرنے پر مجبور محسوس کیا۔

"میں حیران ہوں کہ اس بارے میں آپکی رائے کیا ہے۔ اگر رائے عامہ معلوم کرنا ممکن ہے تو میرے خیال میں اسے کیوں نہ کرایا جائے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ ایک اچھی بات ہوگی، کیونکہ اس سے ریاست کے لوگوں کو ایک مکمل جمہوری طریقہ پر اپنا فیصلہ ظاہر کرنے کا موقعہ ملیگا کہ آیا وہ شاہی خاندان کے ایک فرد کو آئینی سربراہ بنانا پسند کریں گے یا وہ وقفے وقفے سے کسی اور کو منتخب کرنے کو ترجیح دیں گے۔ پس کوئی حصّہ یا طبقہ محسوس نہ کرے کہ اس اہم سوال پر فیصلہ کرنے سے پہلے اسکے خیال کو فراموش کیا گیا۔ مزید یہ کہ جموں اور وادی دونوں خطوں کی علامات کو دیکھتے ہوئے میں محسوس کرتا ہوں کہ اس قسم کی رائے شماری کا نتیجہ ہرگز قبل از وقت نہیں ہوگا۔"

جواہر لعل نے دوسرے روز ہی جواب دیا۔ یہ مانتے ہوئے کہ جموں کے لوگوں کو بہت سی شکایات ہیں۔ جن کی گفتگو ہمیشہ باعث مسرت ہوتی تھی۔

واپسی پر سرینگر میں، میں نے جموں کے لیڈروں کیساتھ صلاح ومشورے کی کاروائی شروع کی۔ ان لیڈروں میں پرجا پرشد کے صدر پنڈت پریم ناتھ ڈوگرہ بھی شامل تھے۔ ملاقات کے بعد انہوں نے ایک بیان جاری کیا جس میں مکمل الحاق کے مطالبہ کو دھرایا گیا اور اختتام پر انہوں نے کہا کہ جب تک ریاست کا آئین ٹھوس شکل اختیار نہیں کرتا تب تک شری یوراج بہادر کے صدر ریاست کے عہدہ کے واحد مسئلہ پر رائے دینا قبل از وقت ہوگا۔ دراصل وہ میرے اس عہدہ کو قبول کرنے کے بہت مخالف تھے لیکن تین دن کی بات چیت کے بعد انہیں کم از کم اس درمیانی پوزیشن کے لئے راضی کرنے پر کامیاب ہوا۔ مجھے پتہ چلا کہ میرے والد نے صدر کو ایک طویل میمورنڈم بھیجا تھا اور اخباری اطلاعات کے مطابق انہوں نے شاہی حکمرانی کی برقراری یا خاتمے کے مسئلہ کے بارے میں ریاست میں رائے عامہ جاننے کا مطالبہ کیا تھا۔

ستمبر کے شروع میں، میں نے جواہر لعل کو خط میں جموں کے لیڈروں کے ساتھ اپنی ملاقات کی رپورٹ بھیجی اور ان ظاہر کردہ حق بجانب شکایات اور خدشات کی نشان دہی کی۔ میں نے درخواست کی کہ بھارت کے سینئر رہنما خاص

میں بعض حق بجانب تھیں۔ انہوں نے برجا پرشد کو اسکے کام کرنے کے طریقہ کار پر خوب لتاڑا۔ میمورنڈم کے بارے میں انہوں نے لکھا۔ "میں نے آپکے والد کے لمبے میمورنڈم کو دیکھا جو انہوں نے صدر کو بھیجا ہے۔ اس میں رائے شماری کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ میمورنڈم تعصب کی ایک دستاویز ہے۔ لگتا ہے کہ آپکے والد ہرگز یہ محسوس نہیں کر رہے ہیں کہ دنیا بدل چکی ہے بلکہ یہ کہ تیزی سے بدل رہی ہے۔ انہوں نے خط کو میرے میمورنڈم کے ذکر کے بارے میں رائے ظاہر کرتے ہوئے ختم کیا۔ انہوں نے لکھا۔

"مجھے میمورنڈم کے بارے میں آپکے تذکرہ پر حیرت ہے۔ یہ لوکل یا بین الاقوامی نقطہ نظر سے بالکل ممکن نہیں۔ ہم دوسرے معاملات کے بارے میں رائے شماری کے بارے میں باتیں کرتے رہے ہیں یہانتک کہ یہ بھی پورا نہیں ہوگا کیونکہ اس پر کوئی اتفاق رائے نہیں ہے۔ اگر ایک محدود مسئلہ پر رائے شماری کا سوال اٹھایا گیا تو اسکا نتیجہ طرح طرح کی بین الاقوامی پیچیدگیوں اور وسیع دائرہ میں رائے شماری کے مطالبہ کی صورت میں نکلے گا۔ یہانتک کہ اگر اس مسئلہ پر رائے شماری کرائی بھی جائے جس میں وہ علاقہ بھی شامل ہے جس پر پاکستان کا قبضہ ہے۔ ریاست کی موجودہ حدود کے اندر اندر جس پر ہمارا کنٹرول ہے' رائے شماری کا مسئلہ قدرتی طور تلخی اور جھگڑے کا باعث بنے گا اور جس کا نتیجہ بلا لحاظ بٹوارہ نکلے گا...

بیشک میرے خیال میں موجودہ حالات میں ایسی تجویز غیر دانشمندی ہے۔ بیشک پاکستان کو اس سے فائدہ ملے گا۔ کسی اور کو نہیں۔ اسی دوران مجھے مشرقی لدّاخ میں چشول کے نئے تعمیر شدہ ہوائی اڈہ پر جواہر لعل نہرو کے ہمراہ جہاز میں جانے کا ڈرامائی تجربہ ہوا۔ یہ ہوائی اڈہ سطح سمندر سے ۱۴۲۷۰ کی بلندی پر بنایا گیا تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کی سب میں اونچی جگہ پر واقع ہے۔ ہوائی سفر میں مسز اندرا گاندھی' شیخ محمد عبداللہ اور کئی افراد بھی ساتھ تھے اور جہاز کو ممتاز ہوا باز ایر مارشل مہر سنگھ چلا رہے تھے۔ میں نے ایک ڈی۔ سی۔ ۳ میں بیس ہزار فٹ سے بھی زیادہ بلندی پر پرواز کی۔ اور سفر میں بیشتر وقت آکسیجن کے بوتلوں کا استعمال کرتے رہے۔ فضا سے عظیم ہمالہ کا منظر قابل دید تھا۔ پہاڑ ہر طرف لامتناہی انداز میں پھیلے ہوئے کئی وسیع جمے ہوئے سمندر کی طرح لگ رہے تھے۔ ننگا پربت کی چوٹی جو دنیا کی اونچی چوٹیوں میں سے ایک ہے' تنہا اور شاہانہ انداز میں چمکیلی برف میں استادہ تھی۔ یہ منظر ناقابل فراموش تھا۔ چشول ہوائی اڈہ پر اترنے سے کچھ ہی دیر پہلے ہمارے جہاز نے ایک وسیع فیروزی' نیلے رنگ کی جھیل کے اوپر اڑان

بھری اور جب ہمارا جہاز اڈہ پر اترا تو مجھے ایک عجیب
دماغی کیفیت کا احساس ہوا۔ ہوائی پٹڑی کے پاس پہاڑ اس
قدر قریب لگ رہے تھے کہ مسز اندرا گاندھی انکے پاس جانا
چاہتی تھیں۔ تاہم ہم یہ سنکر حیران ہوئے کہ یہ پہاڑ کم از کم
دس میل دور تھے۔ اس نادر میدان میں چیزیں حقیقت سے
کہیں نزدیک لگ رہی تھیں۔ ہم ہوائی اڈہ پر قریب
نوے منٹ ٹھہرے جبکہ جواہر لعل نہرو نے ہوائی فوج کے
افسروں سے بات چیت کی۔ یہاں کہیں آبادی یا سبزہ
نظر نہیں آرہا تھا اور ملکوتی خوبصورتی کا یہ نظارہ کسی اور
ستیارے کا لگ رہا تھا۔

چشول کے ہوائی سفر نے اپنے طور پر لداخ کے دورے
کی میری خواہش کو تقویت بخشی اور اسکے بعد جلد ہی میں نے
۳۶۰۰۰ مربع میل کے دور افتادہ خطہ جسے بہت پہلے مہاراجہ
گلاب سنگھ کے وقت میں جنرل زورآور سنگھ اور انکے دلیر ڈوگرہ
فوجوں نے ریاست کے ساتھ ملایا تھا انکا دورہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہمارے
پاس ریاست کا جو حصہ باقی بچا ہے لداخ رقبہ کے لحاظ سے اسکا دو تہائی
حصہ ہے۔ ہمارے خاندان کے کسی فرد نے کبھی لداخ کا دورہ
نہیں کیا تھا۔ لداخ کا نظام ڈوگرہ دور میں وزیر وزارت
(جو ڈپٹی کمشنر کے برابر ہوتا ہے) چلاتا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں

بڑی مشکل سے اسے پاکستانی حملہ آوروں کے قبضے میں جانے
سے بچایا گیا تھا اور یہ دنیا میں لاماؤں اور بدھوں کا سب سے
بڑا غیر ممالک سے گھرا ہوا علاقہ ہے۔ یہ جواہر لعل نہرو کی کم
کامیاب خارجی پالیسی کا نتیجہ تھا کہ تبت چین کے قبضہ میں
چلا گیا تھا۔ آشا اور میں لداخ میں اترے۔ یہاں ہمارا پرتپاک
استقبال کیا گیا۔ قصبے اور آس پاس کی پوری آبادی کوشک
بکولا کی قیادت میں استقبال کرنے کیلئے اُمنڈ آئی تھی۔ جہاز
سے باہر قدم رکھنا کسی اور ہی دنیا، جہاں دوستانہ ماحول
ہو، میں قدم رکھنا تھا۔ گہرا نیلا آسمان، نادر زمین کی صاف
ہوا، لداخی اپنے روایتی پوشاکوں میں ملبوس اور عورتیں
فیروزی رنگ کی زرق برق ٹوپیاں پہنے ہوئے تھیں۔ لداخ میں
ہم تین دن رہے۔ اس دوران ہم نے مشہور بدھ خانقاہیں
دیکھیں جہاں ہم نے نذرانے چڑھائے اور پوجا کی۔ مہاتما بدھ
کے بعض بت انتہائی خوبصورت تھے اور لاماہتوں پر تازہ
لکڑی کے ساز و سامان سے نقاشی کی گئی تھی۔ ان پر بیش قیمت
بیل بوٹے یا ٹھنگاس لٹکے ہوئے تھے جو مختلف بدھ
دیو کی عکاسی کر رہے تھے۔ سفید دھات کے سینکڑوں تیل
کے فلیتے والے پیالے تھے جو خانقاہوں کو دھیمی اور
مدہم ٹمٹماہٹ بخش رہے تھے اور اس پر لاماؤں کا

لگاتار گنگنا نا اس سے عجیب خواب آور سماں پیدا ہو رہا
تھا۔ مجھے خاص طور سے شائی خانقاہ والا مہا تما بدھ کا
کھوکھلے دھات کا بُت یاد ہے۔ یہ اسقدر بڑا ہے کہ پرانے
زمانہ میں لیہہ کے پورے اناج کے گودام کے طور پر استعمال
ہوتا تھا۔ ہم نے اپنے ساتھ کئی ہزار گز کپڑا ساتھ لیا تھا۔
تاکہ لداخ کے ہر باشندے کو کوٹ کیلئے کافی کپڑا ملے۔
یہ رقت انگیز بات تھی کہ ان کپڑے کے ٹکڑوں کو یہاں تک
کہ دور دراز گاؤں میں رہنے والے لوگوں نے حکمران ڈوگرہ
خاندان کیطرف سے تحفے کے طور پر احترام اور محبت سے
لے لیا۔ صاف ظاہر تھا کہ وقت نے کسی بھی تلخ نشان
کو مٹا دیا تھا اور اسکی جگہ لداخیوں میں ہمارے خاندان کے
لئے صحیح معنی میں احترام پیدا ہو گیا تھا۔ ہمیں بہت سے
رنگین تحفے ملے جن میں لداخ کے کپڑوں کا وہ جوڑا بھی
شامل تھا جس میں میرا فوٹو کھینچا گیا تھا۔ کئی برس بعد جب
ہم نے لاماؤں کی یادگاری جگہوں کا دورہ کیا تو مجھے یہ
دیکھکر کہ یہ فوٹو تقریباً ہر جگہ موجود تھا، حیرت ہوئی
لداخی عورتوں نے فیروزی رنگ کے جو بالوں کے لمبے
زیورات پہن رکھے تھے آشا انہیں دیکھکر خوش ہوئیں
لیہہ سے ہم ہوائی جہاز میں کرگل گئے جو لداخ کا دوسرا

قصبہ ہے اور جو شیعہ مسلمانوں کا مرکز ہے۔ کرگل سے جنگ بندی
لائن بہت قریب ہے۔ اور فوج یہاں زیادہ دیکھنے میں آتی
تھی۔ برگیڈیر ہیڈکوارٹر جہاں ہمارا قیام تھا دریائے سندھ
(Indus) کے کنارے واقع تھا۔ مجھے یہ عجیب لگا کہ حالانکہ
ہمارے ملک کا نام اور اسکے قومی مذاہب دریائے سندھ سے
ماخذ ہیں اور ہندوستان کی سرزمین پر جس واضح جگہ پر یہ
دریا بہہ رہا ہے وہ لداخ ہے۔

اپنے لداخ کے قیام کے دوران میں نے کوشک بکولہ
اور انکے ساتھیوں کے ساتھ کچھ سنجیدہ گفتگو کی۔ جموں سے
بھی زیادہ لداخی اپنے آپکو شیخ عبداللہ کی انتظامیہ کے تحت
بے چین اور غیر محفوظ محسوس کر رہے تھے کہ نئے نظام میں،
جس میں انکو آبادی کے لحاظ سے اسمبلی کے اندر صرف دو
ممبر تھے، وہ انتہائی محتاج تھے اور اس صورت حال نے انہیں
مکمل طور پر کشمیریوں کے ماتحت بنا دیا تھا۔ انہوں نے تجویز
کیا کہ ایک قانونی صلاح کار کمیٹی بنائی جانی چاہئے اور
لداخ سے متعلق اہم قانون سازی کے معاملات کو لازمی طور
پر رائے جاننے کیلئے اس کمیٹی کو بھیجا جانا چاہئے۔ انہوں
نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ انہیں شیخ عبداللہ کی سرکار کے رحم
وکرم پر چھوڑنے کے بجائے مرکز سے ایک منتظم بھیجا جائے۔

سرینگر میں واپسی پر میں نے جواہر لعل نہرؤ کو خط لکھا جسکے ساتھ میں نے ایک مختصر یاداشت (نوٹ) بھیجی جس میں میرے لداخ سے متعلق تأثرات اور صورت حال کو بہتر بنانے کیلئے تجاویز درج تھیں۔ میں نے لکھا کہ لداخ فوجی لحاظ سے بہت اہم ہے وہ بھی ریاست سے زیادہ پورے ملک کیلئے اور یہ المیہ ہوگا کہ جذبہ شمولیت کی وجہ سے لداخ کے لوگ ناخوش اور غیر مطمئن رہیں۔ اور اس طرح کمیونسٹ اور فرقہ پرست دونوں آسانی سے ہر طرح سے ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ حسب معمول جواہر لعل نے ایک ہفتہ کے اندر جواب دیا۔ انہوں نے کہا کہ لداخ کی اصلی مشکل اسکی شدید پسماندگی ہے اور اپنے خط کے اختتام پر لکھا کہ ہم کلو وادی سے لداخ تک سڑک بنانے کے لئے خواہاں ہیں لیکن یہ بہت مہنگا کام ہے اور فی الحال اسے ہاتھ میں لینا مشکل ہے۔ یہ سڑک لداخ کے معدنیاتی ذخائر کو کھول دیگی اور اس خطہ کیلئے کچھ حد تک خوشحالی پہنچا دیگی۔

میرا یہ تجربہ رہا ہے کہ بیرونی بحران اکثر اندرونی ردعمل کو بھڑکاتا ہے گو کہ یہ حالات کے ظاہری رُخ سے بالکل غیر متعلق دکھائی دیتا ہے جبکہ یہ سب سیاسی حالات زور پکڑ رہے تھے۔ اندرونی حالات کا عمل بھی جاری تھا

اس دوران میں نے رُوحانی خیالات سے رغبت پیدا کرنا شروع کی۔ زندگی کے بارے میں ایڈوین آرنالڈ کی شاندار نظم "دی لائٹ آف ایشیا" اور گوتم بدھ کی تعلیمات نے میرے اوپر گہرا اثر ڈالا۔ دریں اثناء میں داچھی گام گیا اور یہاں ایک ریچھ کا شکار اس وقت کیا جب یہ ایک درخت کے اوپر توت کھا رہا تھا۔ یہ چیختے ہوئے ایک بچے کیطرح قابل رحم طریقہ پر زمین پر گرا۔ وہ چیخیں ہفتوں میرا پیچھا کرتی رہیں اور اسکے نتیجہ میں مچھلیاں پکڑنے اور شکار نہ کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ بچپن سے ان کھیلوں کے ساتھ وابستہ رہنے کے باوجود میں نے تب سے نہ کبھی مچھلیاں پکڑیں اور نہ ہی شکار کھیلا۔ اسی تاثیر نے مجھے خفیہ طور پہلی جنوری ۱۹۵۲ء کو اس سلسلہ میں ایک نوٹ لکھنے پر آمادہ کیا کہ میرا طویل مدت کیلئے مقصد رؤحانی روشن خیالی اور امن حاصل کرنا ہے اور کامیابی کے ساتھ اس پیغام کو دنیا بھر میں پھیلانا ہے تاکہ دنیا کو جو کہ یل تاریکی اور تباہی کے خوفناک پاتال کی طرف نفرت، حسد، بے رحمی اور جنگوں کے راستے تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے بچایا جاسکے اور اسے امن، خوشی، محبت اور بین الاقوامی خوشحالی کے تابناک راستے پر ڈالا جائے۔ جس وقت میں نے یہ نوٹ لکھا اس وقت میری عمر ۲۱ برس سے

کچھ کم تھی۔ حالانکہ یہ تحریک اب بھی میرے اندر موجود ہے
لیکن برسوں سے میں نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ دنیا کو
بچانا اتنا آسان نہیں جتنا اس وقت دکھائی دیا تھا۔

اسی دوران میرے امتحان کے نتیجہ کا اعلان کیا گیا۔
میں نے بی۔ اے پاس کیا (فسٹ کلاس میں نے چھ نمبروں سے
کھویا) اور اس طرح شاید میں دنیا کی تاریخ میں پہلا چانسلر
تھا جس نے اپنی ہی یونیورسٹی سے گریجویشن کی۔ اس برس
فلسفی سیاستدان ڈاکٹر رادھاکرشنن کنووکیشن پر خطاب
کرنے آئے۔ میں انکی تحریروں کی بہت سراہنا کرتا تھا۔
اس متاثر کن طریقہ کی جسکے ذریعہ وہ اپنے خیالات صاف
مختصر اور فصیح جملوں میں قدیم سنسکرت کے محاوروں کے
اعراب نگاری کے ساتھ متاثر کن طریقہ کے ذریعہ پیش
کرتے تھے۔ اس زمانہ میں، میں نے اپنی عوامی تقریریں
انکے انداز میں کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سال انہوں نے
کنووکیشن پر بغیر تیاری کے ایک شاندار خطاب کیا۔
جس کا انعقاد دریائے جہلم کے کنارے واقع پرانے محل
کے صحن میں ایک شاندار چنار کے سایہ میں ہوا، جو کسی
سماعت خانہ (AUDITORIUM) سے زیادہ متاثر
کن تھا۔ چانسلر ہونے کے ناطے مجھے اس سال گریجویٹس

میں اسناد تقسیم کرنا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ میں اپنے آپ کو
سند تو نہیں دے سکتا تھا۔ پس اسناد بانٹنے کے بعد
میں نیچے اترا اور اپنی سند ڈاکٹر رادھاکرشنن سے وصول کی۔

اس دوران میں نے جو بیشمار کتابیں پڑھیں۔ ان میں
ایک کتاب کا ذکر لازمی ہے کیونکہ اس نے مجھے ایسے دو
شخصیتوں سے متعارف کرایا جنہوں نے آنیوالے برسوں میں
میری اندرونی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔ یہ کتاب الگ دی گریٹ
دلیپ کمار رائے کی تھی۔ یہ کتاب دنیا کے پانچ ممتاز
فلسفیوں، برنارڈ رسل، رومین رونالڈ، مہاتما گاندھی، رابندر
ناتھ ٹیگور اور اروبندو گھوش کے ساتھ ملاقاتوں کی روداد ہے۔
شری اروبند گھوش کے اوپر مضمون خاص طور سے دلچسپ
تھا، حالانکہ میں ان سے ذاتی طور کبھی ملا نہ تھا۔ لیکن ...
انسانی روحانیت آمیز شعور کی انکی بصیرت کی طرف میں نے
زیادہ سے زیادہ کھینچنا شروع کیا۔ زیادہ اہم بات یہ تھی
کہ اس مضمون میں رونالڈ نکسن نامی ایک انگریز کا ذکر
تھا جو سری کرشنا پریم کے نام کے تحت ایک ویشنو سنیاسی
بن گیا تھا۔ اس بات نے مجھے بالآخر ایک انتہائی قابل
قدر آدمی کے پاؤں تک پہنچا دیا تھا جس سے ملنے کا شرف
مجھے کبھی نہ ملا تھا۔ اسکے لئے میں دلیپ رائے اور قدرت

دونوں کا مشکور ہوں، جنہوں نے میری زندگی کے اس نازک موڑ پر میرے ہاتھ میں انکی کتاب تھمادی۔ سری اربندو اور سری کرشنا پریم کو میری اندرونی جستجو یعنی ابدی بانسری بجانے والے کے سنہری سروں کی طرف مائل کرنے کے سلسلہ میں رہنمائی کرنے والے دو کردار بننا تھا۔

آئینی صورت حال سے متعلق پورا سوال بے رحمی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ میرے والد اسٹیٹ منسٹری کے ساتھ طویل خط و کتابت کر رہے تھے لیکن میرے والد اور بھارت سرکار اسقدر مختلف موقف پر تھے کہ یہ کام بے مقصد تھا۔ میرے والد اپنے حقوق اور انکو وقتاً فوقتاً دیئے گئے وعدوں کے بارے میں اصرار کر رہے تھے جبکہ وزیر برائے اسٹیٹس ڈاکٹر کے۔ این۔ کاٹجو ریاست کے تبدیل شدہ سیاسی حالات اور بین الاقوامی وسیع سیاسی مجبوریوں کو دہراتے رہے۔ منسٹر آف اسٹیٹس کے سکرٹری سی۔ ایس۔ وینکٹا چار ستمبر میں پونا میں میرے والد سے ملے جس کے بعد میرے والد نے ڈاکٹر کاٹجو کو ایک کرب آمیز خط لکھا۔ صدر جمہوریہ کو بھیجے گئے میمورنڈم کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے یاد دلایا کہ کس طرح میرے حقوق کی بے حرمتی کر کے مصیبت کھڑی کی گئی جن کو برقرار رکھنے کے سلسلہ میں حکومت

ہند نے یقین دلایا تھا، جسکی رُو سے میری پوزیشن کمزور کر کے میرے جفا شعاروں کو نامناسب اور غیر واجب فائدہ پہنچایا جا رہا ہے۔ انہوں نے مزید لکھا "کیا مجھے آپ سے یہ پوچھنے کا حق ہے کہ   کیا میں غلط ہوں یا یہ کہ حکومت ہند شیخ عبداللہ سے صادر   ایک خاص پالیسی کی تعمیل کرنا چاہتی ہے، چاہئے اسکا مقصد میرا میرے شاہی سلسلہ اور انصاف اور عدل کے بعض عزیز اصولوں کا خاتمہ ہی کیوں نہ ہو۔ کیا میں ایک ایسے شخص کے بنیادی حقوق سے محروم ہو چکا ہوں جو اپنے آپ کو دکھی سمجھتا ہے اور انصاف مانگتا ہے۔ تاہم کسی قدیم یونانی المیہ کی طرح میرے والد نے صورت حال کو بے رحمی سے اپنے خلاف پایا۔ انکے اوپر دستبردار ہونے کیلئے انتہائی دباؤ تھا لیکن ایسا کرنے سے انہوں نے مضبوطی سے انکار کیا۔ انکے جیب خاص اور رعایات کے متعلق بعض دوسرے وسیع معاملات پر بات چیت ہوئی اور تجویز کے طور پر ایک فارمولا ڈھونڈا گیا۔ معاملہ کو ٹالنے کی میری اپنی کوششیں بھی انتہا کو پہنچ رہی تھیں۔ اور میری یہ امید بھی ایک فریب ہی ثابت ہوئی تھی کہ میرے والد اور ہند سرکار کے درمیان کوئی متفقہ سمجھوتہ تلاش کیا جائے گا تاکہ میرے لئے میدان

دونوں کا مشکور ہوں، جنہوں نے میری زندگی کے اس نازک موڑ پر میرے ہاتھ میں انکی کتاب تھمادی۔ سری اربندو اور سری کرشنا پریم کو میری اندرونی جستجو یعنی ابدی بانسری بجانے والے کے سنہری سروں کی طرف مائل کرنے کے سلسلہ میں رہنمائی کرنے والے دو کردار بننا تھا۔

آئینی صورت حال سے متعلق پورا سوال بے رحمی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ میرے والد اسٹیٹ منسٹری کے ساتھ طویل خط و کتابت کر رہے تھے لیکن میرے والد اور بھارت سرکار اسقدر مختلف موقف پر تھے کہ یہ کام بے مقصد تھا۔ میرے والد اپنے حقوق اور انکو وقتاً فوقتاً دئے گئے وعدوں کے بارے میں اصرار کر رہے تھے جبکہ وزیر برائے اسٹیٹس ڈاکٹر کے۔ این۔ کاٹجو ریاست کے تبدیل شدہ سیاسی حالات اور بین الاقوامی وسیع سیاسی مجبوریوں کو دہراتے رہے۔ منسٹر آف اسٹیٹس کے سکرٹری سی۔ ایس۔ وین کٹا چار ستمبر میں پونا میں میرے والد سے ملے جس کے بعد میرے والد نے ڈاکٹر کاٹجو کو ایک کرب آمیز خط لکھا۔ صدر جمہوریہ کو بھیجے گئے میمورنڈم کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے یاد دلایا کہ کس طرح میرے حقوق کی بے حرمتی کر کے معیبت کھڑی کی گئی جن کو برقرار رکھنے کے سلسلہ میں حکومت

ہند نے یقین دلایا تھا، جسکی رُو سے میری پوزیشن کمزور کر کے میرے جفا شعاروں کو نامناسب اور غیر واجب فائدہ پہنچایا جا رہا ہے۔ انہوں نے مزید لکھا "کیا مجھے آپ سے یہ پوچھنے کا حق ہے کہ   کیا میں غلط ہوں یا یہ کہ حکومت ہند شیخ عبداللہ سے صادر   ایک خاص پالیسی کی تعمیل کرنا چاہتی ہے، چاہئے اسکا مقصد میرا میرے شاہی سلسلہ اور انصاف اور عدل کے بعض عزیز اصولوں کا خاتمہ ہی کیوں نہ ہو۔ کیا میں ایک ایسے شخص کے بنیادی حقوق سے محروم ہو چکا ہوں جو اپنے آپ کو دُکھی سمجھتا ہے اور انصاف مانگتا ہے۔ تاہم کسی قدیم یونانی المیہ کی طرح میرے والد نے صورت حال کو بے رحمی سے اپنے خلاف پایا۔ انکے اوپر دستبردار ہونے کیلئے انتہائی دباؤ تھا لیکن ایسا کرنے سے انہوں نے مضبوطی سے انکار کیا۔ انکے جیب خاص اور رعایات کے متعلق بعض دوسرے وسیع معاملات پر بات چیت ہوئی اور تجویز کے طور پر ایک فارمولا ڈھونڈا گیا۔ معاملہ کو ٹالنے کی میری اپنی کوششیں بھی انتہا کو پہنچ رہی تھیں۔ اور میری یہ امید بھی ایک فریب ہی ثابت ہوئی تھی کہ میرے والد اور ہند سرکار کے درمیان کوئی متفقہ سمجھوتہ تلاش کیا جائے گا تاکہ میرے لئے میدان

صاف ہو جائے۔ سچائی کا لمحہ تیزی سے قریب آرہا تھا اور میں نے محسوس کیا کہ جلد ہی مجھے اپنی ذمہ داری کے بارے میں فیصلہ لینا ہوگا اور جو بھی نتائج بعد میں واقع ہوں انہیں بھگتنے کیلئے مجھے تیار رہنا چاہئے۔ میرے لئے انتخاب کرنے کا کام کوئی آسان نہ تھا اور مجھ پر یہ بات بالکل واضح ہو رہی تھی کہ یا تو مجھے عوامی زندگی سے بالکل دور بھاگنا ہے اور سابقہ شہزادوں کی صف میں کھڑا ہونا تھا جو بمبئی کے ریس کلب کی سرپرستی کر رہے تھے یا یہ کہ ہنگامہ میں رہ کر رہ کر مقابلہ کیا جائے چاہئے اس کا آخری نتیجہ شکست ہی کیوں نہ ہو۔ مجھے دو مضبوط قوت ارادی والی شخصیتوں کے اثر اور نصیحت کے درمیان ایک کا انتخاب کرنا تھا۔

۲۰ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو جواہر لعل نے مجھے ایک خط لکھا۔ جس میں انہوں نے یہ لکھا کہ ریاست کے سربراہ کے بارے میں شیخ عبداللہ کے ساتھ طویل گفت شنید کے بعد بالآخر یہ سمجھوتہ طے پایا کہ صدر جمہوریہ کو دفعہ ۳۷۰ کے تحت عمل کرنا چاہئے اور اس عہدہ سے متعلق دی ہوئی تشریحات میں ترمیم کریں۔ اس معاملہ کو مزید لٹکائے رکھنا مناسب نہیں ہے اور نومبر کے بیچ میں اس سلسلہ میں ضروری

کاروائی کیجائیگی۔ "مجھے امید ہے جو قدم ہم نے اٹھایا ہے اسکے ساتھ آپ اتفاق کریں گے"۔ انہوں نے لکھا کہ "اب ہمارے سامنے بس یہی ایک راستہ کھلا ہے۔ معاملہ کو ملتوی کرنے کے کسی دوسرے طریقہ یا کوشش کا نتیجہ صرف دشواری اور تکلیف کی صورت میں نکلے گا"۔ انہوں نے مزید لکھا۔ "مجھے افسوس ہے کہ آپکے والد مہاراجہ نے کوئی خاص تعاون نہیں دیا۔ ہم نے انہیں معاملات سمجھانے اور ہر ممکن مدد کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن لگتا ہے وہ ان تبدیلیوں سے بالکل بے بہرہ ہیں جو رونما ہوئیں اور جو دنیا میں وقوع پذیر ہو رہی ہیں اور ایسے دلائل پیش کرتے ہیں جن کا حال کے ساتھ کوئی اطلاق نہیں۔

اسکے نتیجہ میں، میں نے ڈاکٹر کاٹجو کو ایک خط لکھا۔ جس میں تجویز شدہ صدر ریاست کے عہدہ (جو نام نئے آئین کے تحت ریاست کے سربراہ کو دیا گیا تھا) کی حیثیت اور کام کاج کی وضاحت طلب کی۔ اس کی نقل میں نے جواہر لعل کو بھیجی۔ کشمیر کے معاملات کے تئیں جواہر لعل نہرو کی گہری دلچسپی کی یہ شہادت کہ انہوں نے میرے خط کا فوراً جواب دیا یہاں تک کہ ڈاکٹر کاٹجو سے پہلے — میرے اٹھائے ہوئے نقطوں کا مختصراً جواب دینے کے بعد

انہوں نے آخیر میں لکھا۔ "اگر آپ کو ایک نئے تعلق کی شروعات کرنی ہے تو جہاں تک ممکن ہو سکے یہ موافق نیک شگون اور خیر خواہی کا ہونا چاہئے۔ یہ دوسری کسی اور بات سے زیادہ بڑی ضمانت ہے۔ دو دن بعد ڈاکٹر کاٹجو نے بھی جواب دیا۔ انہوں نے کئی نقطوں پر تفصیل کے ساتھ بحث کی تھی جن میں حبیب خاص (جسکو ۲۸ لاکھ سے گھٹا کر ۱۰ لاکھ کر دیا تھا اور جسے میرے والد، میری والدہ اور میرے درمیان تقسیم کیا گیا تھا) صدر ریاست کا مشاہرہ، جھنڈا اور عہدہ کی میعاد وغیرہ باتیں شامل تھیں۔

جو کھم میں پڑنے سے پہلے میں نے ایک بار پھر دہلی جانے کا فیصلہ کیا۔ یہاں میں حسب معمول جواہر نہرو سے ملا۔ انہیں میری مشکلات کا شدید احساس تھا۔ اور میرے فیصلے سے متعلق قومی پیچیدگیوں کے بارے میں تفصیل سے باتیں کیں اور یہ کہ ایک انسان کو نازک موڑ پر دباؤ اور تبذیب کی پرواہ کئے بغیر واضح موقف اپنانا چاہئے۔ انہوں نے بعض الجھنوں کو دہرایا جو انہوں نے شیخ صاحب کے ساتھ کام چلاتے ہوئے محسوس کرنا شروع کی تھیں اور انہوں نے کہا کہ اس صورت حال نے اس بات کو اور بھی اہم بنا دیا ہے کہ اگر مستقبل میں کوئی مسائل

پیدا ہونگے تو میں مدد کرنے کیلئے موقع پر موجود رہوں۔ اور اسی آخری پہلو نے جہاں تک میری ذات کا سوال تھا مسئلہ کو حتمی طور پر طے کر دیا۔ حالانکہ انہوں نے کوئی یقین دہانی نہیں چاہی اور نہ ہی میں نے کوئی یقین دہانی کرائی لیکن میں نے تین مورتی ہاؤس یہ طے کرنے کے بعد چھوڑا کہ میں اس عہدہ کو قبول کروں گا۔

میں سرینگر لگ بھگ ۱۲، نومبر کو لوٹا۔ ۱۵، نومبر کو قانون ساز اسمبلی کا اجلاس ہوا اور مجھے پانچ سال کے لئے صدر ریاست چنا گیا۔ کچھ ہی ماہ پہلے میں ۲۱، برس کا ہوا تھا اسلئے حسب معمول ایک آئینی سربراہ کی عمر ۳۵ برس سے گھٹا کر ۲۱، سال کر دی گئی تھی۔ نیز ر بھی خط لکھا جو یوں تھا

میرے پیارے یوراج

جموں و کشمیر کے لوگوں نے آپکو صدر ریاست چنکر جو بہت عزت بخشی ہے اس پر میں آپکو مبارکباد دیتا ہوں میں ریاست کے لوگوں کو بھی انکے دانشمندانہ فیصلہ پر مبارک باد دینا چاہوں گا۔ اس طرح سے آپ پر بھاری ذمہ داری عائد ہوئی کیونکہ آپ کو محض قائم شدہ رواج کی پیروی ہی نہیں کرنا ہے بلکہ آپکو مستقبل کیلئے ریت روایتوں کو بنانے

۱۶۔ کی رات کو میں اور آشا صبح ہونے تک بیٹھے رہے۔
میں جانتا تھا کہ میں نے ناقابل تنسیخ طور پر جاگیردارانہ نظام
سے اپنے تعلقات منقطع کئے تھے اور یہ بھی کہ بظاہر اگر ہمارے
تعلقات خوشگوار بھی ہونگے۔ میرے والد مجھے آسانی سے اس
عہدہ کو قبول کرنے کے بارے میں معاف نہیں کریں گے۔ میں نے
محسوس کیا کہ شیخ صاحب ہمارے شاہی خاندان کے ازلی
دشمن تھے اور یہ کہ صدر ریاست کا عہدہ قبول کرنے سے میں
درحقیقت اپنے آپکو ان کے رحم وکرم پر چھوڑ رہا تھا۔ میں یہ
بھی جانتا تھا کہ میرے اپنے فرقہ کے لوگ جموں کے ڈوگرے
کم از کم شروع میں بہت مخالف رہیں گے۔ تاہم مجھے پکا یقین
تھا کہ پرانا نظام ختم ہو چکا ہے اور کبھی واپس لوٹ کر نہیں آئے
گا۔ میری قسمت میں چاہئے کچھ بھی ہو۔ تب تک میرے لئے
یا میرے لوگوں کے لئے کوئی مستقبل نہ ہوگا جب تک نہ میں
اپنی تقدیر کو جواہر لعل نہرو اور نئے ہندوستان کے ساتھ وابستہ
کروں جسے قائم کرنے میں انہوں نے بہت کچھ کیا تھا اور
جسکی رہنمائی وہ ہمت اور دوراندیشی سے کر رہے تھے۔
جبکہ میں پرانے جاگیردارانہ نظام سے اپنے آپ کو دور لے
جا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ نیا چیلنج قبول کرنے سے میں
ایک قوم کو قائم کرنے اور اسکی تقدیر کو سنوارنے کے ایک

میں مدد کرنا ہے۔ آپکو معلوم ہے کہ ریاست کے مستقبل سے مجھے
کتنا لگاؤ ہے۔ مجھے اسکے ساتھ پیار ہے۔ کشمیر کے ساتھ میرے
قریبی لگاؤ کی وجہ سے ہے۔ اور مجھے یہ ان بیشمار بندھنوں
کیوجہ سے بھی عزیز ہے جو ریاست کو ہندوستان کیساتھ
باندھ رہے ہیں۔ ہمارا مستقبل ایکدوسرے کے ساتھ جڑا ہوا
ہے اور ہم کو بُرے اور بھلے دن ساتھ ساتھ ایک جیسے طریقہ
پر دیکھنے ہیں۔

جموں وکشمیر میں ایک نیا باب کھل رہا ہے۔ حالانکہ
اگرچہ یہ نیا ہے یہ پرانے باب کا سلسلہ ہے لیکن ایک مختلف
صورت میں۔ زندگی کے مراحل چاہئے کسی واحد شخص کے ہوں
یا قوم کے۔ دونوں ہی سلسلہ وار اور متواتر تبدیل پذیر ہیں۔

میں دیانتداری سے امید کرتا ہوں کہ جو تبدیلیاں
جموں وکشمیر کے آئین میں لائی گئی ہیں۔ وہ ریاست کے
عوام کیلئے زیادہ بہبودی اور خوشی کا باعث بنیں گی اور
انہیں مزید ہندوستان کے قریب لائیں گی، جسکا وہ اس
قدر قریبی حصّہ ہے۔

آپکے لئے جنکو یہ بوجھ اور ذمہ داری اتنی کم عمری
میں اٹھانا ہے میں نیک خواہشات اور پیار بھیج رہا ہوں

مخلص
جواہر لعل نہرو

وسیع کام میں شامل ہو رہا تھا جو دنیا کی آبادی کے ساتویں حصّے کی نمائندگی کر رہی تھی۔ پانی سرسے گذر چکا تھا اور صبح کو میں اپنی زندگی اور قسمت کے ایک نئے اسٹیج پر قدم رکھ رہا تھا۔

دوسری صبح یعنی ۱۷، نومبر ۱۹۵۲ء کو میں کار میں دریائے جہلم پر واقع پُرانے راج گڈھ پیلس گیا جو میرے والد کے مہیل ڈل کے پاس منتقل ہونے تک پرانے مہاراجوں کی قیام گاہ رہ چکا تھا۔ شاندار پیپر ماشی کا چھت والا دربار ہال کو آئین ساز اسمبلی کے ایوان میں تبدیل کیا گیا تھا جو پرانے نظام کی ایک عمدہ نشانی تھی۔ جہاں ماضی میں درباری قالین پر بیٹھتے تھے اور جہاں صرف میرے والد ہی سونے کے تخت کے اوپر بیٹھتے تھے، وہاں پر اب بینچ بنائے گئے تھے اور اسپیکر خوبصورت ہال کی مخالف سمت میں ایک اونچے پلیٹ فارم پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دروازہ پر شیخ عبداللہ، بخشی غلام محمد اور اسپیکر جی۔ ایم صادق نے میرا استقبال کیا اور مجھے اسپیکر کے پلیٹ فارم تک لے گئے، میں ہال میں داخل ہوا تو ممبروں نے کھڑے ہوکر زور زور سے تالیاں بجائیں۔ میں پرانے نظام کا آخری نمائند تھا جو لوگوں کی منظوری سے نئے نظام میں پہلا خادم بن

رہا تھا۔ جب میں ڈائس پر بیٹھ گیا تو چیف جسٹس وزیر جانکی ناتھ کھڑے ہوئے اور مجھے حلف دلایا۔ انکے ساتھ ساتھ میں نے بھی حلف دہرایا۔ تب میں نے ایک مختصر سی تقریر جس پر میں نے کئی روز تک مغز ماری کی تھی، پڑھی۔ جس میں، میں نے اور باتوں کے ساتھ ساتھ کہا۔

" مجھے معلوم ہے کہ ریاست کے سربراہ کا کام اہم اور مشکل ہے۔ خاص طور پر ایک ایسی ریاست میں جہاں حالات غیر معمولی ہوں جیسے کہ یہاں رہے ہیں۔ مجھے یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ اس پوزیشن سے میرے اوپر جو ذمّہ داریاں عائد ہو رہی ہیں انہیں سنبھالنے میں مجھے کچھ پس و پیش تھی۔ چونکہ مجھے معلوم تھا یہ عہدہ پر کرنے کیلئے قابلیت اور تجربہ کے لحاظ سے بہت سارے بہتر لوگ ہونگے۔ لیکن جو اعتماد اور بھروسہ میرے اوپر کیا گیا اس نے مجھے ان نئی ذمّہ داریوں کو سنبھالنے کی اُمید اور ہمت بخشی اور میں آپکو یقین دلا سکتا ہوں کہ مجھے جو بھی قابلیت اور صلاحیت ہوگی وہ مکمل طور پر ریاست اور اس کے عوام کے لئے وقف ہوگی۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ ہماری ریاست انتہائی غیر معمولی حالات سے گذرتی رہی ہے اور پچھلے چند برسوں سے اسے بے انتہا دباؤ اور کھینچاؤ سے واسطہ پڑا ہمارے خوش

حال ملک پر بے رحم اور ظالمانہ حملے نے تکالیف اور مصائب کو جنم دیا۔ سینکڑوں لوگ قتل کئے گئے۔ اور ہزاروں گھر سے بے گھر کر دئے گئے جنہیں ایک بھیانک خواب اور آفت میں جھونک دیا گیا۔ ہمارے ملک کی طویل گوناگوں تاریخ میں شاید اس وقت ہمارے لوگوں کو شدید ترین بحران کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ انکی اور انکے لیڈروں کی داد دینا پڑے گی جو انہوں نے وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے حالات کا اطمینان اور ہمت سے سامنا کیا۔ اولاً اگر ہماری فوجیں جو دشمن کے مقابلہ میں بہت کم تعداد میں تھیں اور جو ایک دوسرے سے کٹی ہوئیں تھیں بہادرانہ طور پر مزاحمت نہ کرتے دوسرے یہ کہ اگر بھارت سے اس شدید ترین ضرورت کے وقت پر ہمیں مدد نہ ملتی، تو یہ غازیانہ کوشش بارآور ثابت نہ ہوئی ہوتی۔" میں نے اپنی تقریر ان الفاظ کے ساتھ ختم کر دی۔

"ہماری ریاست ان سب اہم مسائل کا صرف متحدہ قوت سے ہی مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں ہو سکتی ہے۔ اس بوقلموں اور حسین ملک میں مختلف عقائد اور مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ آپس میں عظیم ماضی اور تہذیب کے مشترکہ وارثوں کے طور پر رہ رہے ہیں۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ مستقبل کے مشترکہ معماروں کے طور پر ہم انکے درمیان مزید اتحاد پیدا

کریں۔ ایسا پائیدار اتحاد اوپر سے ٹھونسا نہیں جا سکتا ہے بلکہ اسکی بنیاد ریاست کے سبھی حصوں میں رہنے والے عام لوگوں کے مفادات کے اوپر رکھی جائی ہوگی۔ ریاست کے سبھی لوگوں اور سبھی خطوں کی شراکت تعمیر کرنے کے سلسلہ میں ہم میں ہر ایک کے اوپر یہ اہم قرض عائد ہوتا ہے کہ ہم اپنا مقدور بھر حصّہ ادا کریں۔ آپکی دعاؤں اور نیک خواہشات کے طفیل مجھے اُمید ہے کہ اس سلسلہ میں میں مؤثر طور پر اپنا حصّہ ادا کر سکوں گا۔"

باب ۱۲

صدر ریاست کا عہدہ سنبھالنے کے ایک ہفتہ بعد حکومت سرما کیلئے جموں منتقل ہوگئی۔ پرجا پرشد بیشک میرے صدر ریاست کا عہدہ قبول کرنے پر آگ بگولہ ہوئی تھی، اور جموں میں میری آمد کے موقع پر کالی جھنڈیوں سے مظاہروں کی دھمکی تھی۔ ۲۴، نومبر کو میں انڈین ائر لائنز کے جہاز میں جموں گیا۔ پیشتر کے بالکل برعکس جب میں امریکہ سے لوٹا تھا یا شادی کے بعد جموں آیا تھا۔ جب جموں کے لوگوں نے میرا پُرجوش اور محبت بھرا استقبال کیا تھا، اس دفعہ تحقیر آمیز اور مخالفانہ نعرے لگ رہے تھے، اور ہوائی اڈہ سے لیکر محل کے دروازے تک پورا شہر کالی جھنڈیوں کا ایک

سمندر لگ رہا تھا۔ بخشی غلام محمد کھلی جیپ میں میرے ساتھ تھے، حالانکہ نیشنل کانفرنس نے کچھ نہ کچھ استقبال کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اسے ڈوگرہ عوام کی شدید مخالفت نے دبا دیا تھا، مجھے یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ یہ ایک طرح سے دل شکن تجربہ تھا لیکن میں نے بہادری سے حوصلہ رکھا۔ اور بدستور مسکراتا رہا اور لوگوں کو آداب کرتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ کئی لوگوں نے جوابی آداب کیا۔ درحقیقت یہ مظاہرہ میرے خلاف اتنا نہیں تھا جتنا کہ اس کا مقصد میرے والد کے تئیں وفاداری جتانا تھا، اس سے ۱۴، نومبر کو پرجا پرشد کی طرف سے شروع کئے گئے شیخ محمد عبداللہ کے خلاف ایجی ٹیشن کا پتہ چلتا تھا۔ ریاست کے ہندوستان کے ساتھ مکمل ادغام کا اظہار ایک ہی آواز سے ہوتا تھا۔ " ایک وطن، ایک نشان، ایک پردھان (ایک آئین ایک جھنڈا اور ایک صدر) اگلے چند مہینوں میں اس ایجی ٹیشن نے زور پکڑ لیا کیونکہ اس نے مؤثر طور پر ڈوگروں کے غصے کے احساس کو جو وہ نہ صرف اپنی مغلوب حیثیت کو کھونے کی صورت میں محسوس کرتے تھے بلکہ اسلئے بھی کہ انہیں ایک جنبش سے اپنے ازلی دشمن شیخ محمد عبداللہ کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا تھا، مؤثر طریقہ پر تقویت بخشی۔ اپنی طرف سے شیخ صاحب نے نہ صرف یہ کہ انہوں نے جموں کے لوگوں کے جذبات کو

ٹھنڈا کرنے میں کوئی کوشش نہیں کی۔ بلکہ انہوں نے مخالفت اور جھگڑالو رویہ جاری رکھا۔ مثال کے طور پر جموں کے سکریٹریٹ کے اوپر جھنڈا لہرانے کا سوال تھا۔ ریاست کے پرانے جھنڈے کو اتارنے کے بعد میں نے حکومت کو مشورہ دیا تھا کہ نئے جھنڈے کے ساتھ ساتھ قومی جھنڈا بھی لہرایا جائے۔ اسکو شیخ صاحب نے سختی سے مسترد کردیا اور اسکے جواب میں، میں نے ذاتی طور نیا جھنڈا لہرانے کا مشورہ ماننے سے انکار کیا۔

جموں میں قدم جمانے کے بعد میں نے حالات کا تجزیہ کرنا شروع کیا اور جلد ہی محسوس کیا کہ پرجا پرشد کا ایجی ٹیشن جموں خطے کے طول و عرض میں پھیل گیا تھا۔ حالانکہ میں پنڈت جواہر لعل کے پرجا پرشد کے تئیں نفرت کو جانتا تھا تاہم میں نے انہیں صحیح صورت حال کے بارے میں مطلع کرنا اپنا فرض سمجھا۔ میں نے ایک تفصیلی نوٹ تیار کیا جو پوری صورت حال کا تجزیہ کرتا تھا اور سیاسی اور اقتصادی اقدام کے سلسلہ میں چند ٹھوس تجویزیں پیش کیں جو جموں اور لداخ کے عوام کی حق بجانب امنگوں کو پورا کرنے میں مددگار ثابت ہوتیں۔ میں نے لکھا۔ "حالت یہ ہے جموں اور لداخ شدت سے ریاست کا مکمل طور پر بھارت کے ساتھ ادغام چاہتے ہیں، شیخ صاحب اور انکے ساتھی محدود الحاق پر انتہائی بضد ہیں اور مکمل الحاق کیلئے تیار نہیں ہیں"۔ یہ نوٹ میں نے جواہر لعل کو پہلی دسمبر ۱۹۵۲ء کو بھیجے گئے نوٹ کے بعد ایک خط کے ساتھ ۲۲، دسمبر کو ارسال کیا۔ میں نے صاف صاف لکھ دیا تھا کہ "حالت بہت سنگین ہے۔ فوجی لحاظ سے نہیں لیکن اس لحاظ سے کہ جموں صوبہ کی بھاری اکثریت ایجی ٹیشن کے پرزور حامی لگ رہی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ بنیادی طور کئی گہرے اور حق بجانب اقتصادی اور نفسیاتی وجوہات ہیں۔ اور میرے خیال میں پورے معاملہ کو محض رجعت پسند مٹھی کی پیداوار سمجھ کر نظر انداز کرنا صحیح تشخیص نہ ہوگی۔

اسکے بعد میں نے دہلی کا دورہ کیا جہاں میں نے جواہر لعل نہرو، وزیر داخلہ ڈاکٹر کاٹجو اور ڈاکٹر راجندر پرشاد سے بات چیت کی اور صورت حال کے بارے میں اپنی رائے سے انہیں آگاہ کیا۔ میں نے درخواست کی کہ بھارت سرکار کو مداخلت کرنی چاہئے۔ تاکہ ریاستی سرکار جموں کے ایجی ٹیشن کے ساتھ نہ صرف پولیس کی زیادتی کی صورت میں پیش آئے بلکہ ٹھوس سیاسی، اقتصادی اور انتظامیہ اقدامات کرکے اس سے نپٹے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے اسی ماہ شیخ صاحب کو لکھا جنہوں نے ایک طویل خط کی صورت میں جواب دیا اور سرکار کے قدم کو حق بجانب ٹھہراتے ہوئے جموں کے پورے معاملہ کو متعصب تنظیموں اور جموں کے جاگیرداروں اور دیگر اونچے طبقوں کا شدید رد عمل کہکر ٹھکرا دیا۔ جواہر لعل نے میرے خط کا بھی جواب دیا اور کہا۔ "میں جموں کی صورت حال پر آپ

کی گہری تشویش کو سمجھ سکتا ہوں۔ قدرتی طور پر مجھے بھی ان پر بہت تشویش ہے اور میں نے انکو قریب سے پرکھا ہے۔ میں آپ سے پورے طور پر اتفاق کرتا ہوں کہ جبکہ پولیس کے اقدامات بیشک ضروری ہیں تاہم یہ صورت حال سے نپٹنے کا منفی طریقہ ہے۔ جموں کی صورت حال بہت سنگین ہے اور ہمارے بہت زیادہ غور وخوض کی اور ضروری مثبت کاری کی مستحق ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ آدمی کو ان معاملات اور دوسرے اہم معاملات کو ٹھنڈے دل اور پُرسکون طریقہ سے دیکھنا چاہئے۔"

بعد میں اسی مہینے مجھے جواہر لعل نہروؔ کا پیغام ملا کہ صدر جمہوریہ نے مجھے فروری کے شروع میں ہونے والی گورنروں اور راج پرمکھیوں کی کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی ہے اور یہ کہ وہ اس میں شرکت کرنا پسند کریں گے۔ میرے لئے یہ قومی سطح پر ایک میٹنگ میں شمولیت کرنے کا پہلا موقع تھا۔ میرے ماضی کے تمام تجربات جموں وکشمیر تک ہی وابستہ رہے تھے۔ اس لئے ایک طرح سے ایک قسم کی گرم جوشی کے ساتھ میں نے اس دعوت کو قبول کیا۔ میں دہلی ۳ر فروری کو پہنچا اور مجھے راشٹرپتی بھون کے وسیع دوارکا سیوٹ میں ٹھہرایا گیا جو معزز مہمانوں کے لئے مخصوص تھا۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد کے ساتھ ایک رسمی ملاقات کے بعد میں واپس ہوا اور بہت جلدی سوگیا۔ اس رات میں نے

ایک عجیب شگفتہ خواب دیکھا۔ میں ایک بڑے کمرے میں کھڑا تھا کہ مہاتما گاندھی اندر آگئے۔ میں نے انہیں نمایاں طور پر پہچانا' جب میں نے انکو کئی برس پہلے سرینگر میں سچ مچ دیکھا تھا اس سے زیادہ انکے پورے خدوخال اور کپڑے میری یادداشت میں زیادہ نمایاں طور پر محفوظ ہیں۔ وہ میرے قریب آئے اپنا بایاں ہاتھ میرے شانے پر رکھا اور میری ہتھیلی اپنے دوسرے ہاتھ میں لے لی۔ انہوں نے لمحہ بھر اسے دیکھا اور تب انگریزی میں کہا۔ "آپ ایک بہت ہی عقلمند آدمی ثابت ہونگے۔"

دوروزہ کانفرنس کو بذات خود میں نے دلچسپ پایا بعد کی ایک طویل کڑی' جس میں مجھے مستقبل میں ایسی ہی پندرہ کانفرنسوں میں شرکت کرنا تھا ان میں یہ پہلی کانفرنس تھی۔ اس کی ابتداء صدر کی رسمی تقریر سے ہوئی جسکے بعد ایک گھنٹہ تقریر کے دوران موجودہ قومی اور بین الاقوامی منظر کا جائزہ پیش کیا اور اقتصادیات کے فروغ کے مختلف پہلوؤں پر زور دیا۔ عالم قسم کے نائب صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے دوسرے روز تقریر کی۔ انہوں نے شاندار انداز میں تعلیم اور قومی ترقی پر اچھے خیالات کا اظہار کیا۔ اس زمانہ میں نوابوں کی ریاستوں کا ابھی مکمل طور پر مملکت میں پوری طرح سے مدغم ہونا باقی تھا اور یہ ریاستیں کئی جغرافیائی خطوں میں تقسیم کی گئی تھیں اور

ہر ایک خطے کا ایک سینئر شاہزادہ سربراہ ہوتا تھا جو راج پرکھ
کہلاتا تھا۔ پس کانفرنس میں گورنروں، جن میں چندو لال ترویدی
کے۔ ایم۔ منشی، آر آر دیواکر، جے رام داس، دولت رام، فضل علی
اور پاتا بھائی سیتا رامیا شامل تھے، کے علاوہ میسور، نونگر، پٹیالہ
ٹراونکور، گوالیار اور جے پور کے سابقہ حکمران بھی شرکت کر رہے تھے۔
بائیس برس کی عمر میں، میں بیشک بیشتر شرکار کی ایک
تہائی عمر کا تھا۔ عام تقریروں کے بعد ہر شرکت کرنے والے نے
اپنی ریاست کی صورت حال کی ایک مختصر رپورٹ پیش کی،
جن میں وہاں درپیش اہم مسائل کی خاص طور سے نشاندہی کی گئی۔
اپنی تقریر کے دوران میں نے پچھلے سال کے اہم واقعات پر تبصرہ کیا
اور جموں میں چل رہے ایجی ٹیشن کا ذکر بھی کیا۔ صدر کی طرف سے
رسمی عصرانہ کے علاوہ جس میں کابینہ کے ارکان نے شرکت کی، اس
کے علاوہ پنڈت جواہر لعل نہرو نے بھی کانفرنس میں شرکاء کے
اعزاز میں دعوت دی۔ علاوہ ازیں انہوں نے مجھے دوپہر
کے کھانے پر پرائیویٹ دعوت بھی دی جس میں اندرا گاندھی
میزبان تھیں اور پدما جا نائیڈو اس محفل کی جان تھیں۔

اسی دوران جموں کے ایجی ٹیشن میں کمی کے کوئی آثار
نظر نہیں آرہے تھے۔ بلکہ دلی میں ہم خیال جماعتوں نے خصوصاً
نئی نئی قائم شدہ جن سنگھ جسکی قیادت ڈاکٹر شاما پرشاد مکرجی

اور این سی۔ چٹرجی کر رہے تھے، نے اسے ہاتھ میں لے لیا تھا
جنہوں نے قومی سطح پر ستیہ گرہ (احتجاج) کرنے کا فیصلہ کیا۔
میں بدستور یہ کہتا رہا کہ ایجی ٹیشن چلانے والے لیڈروں اور ریاستی
حکومت کے درمیان بات چیت ہونی چاہئے لیکن شیخ محمد
عبداللہ اس کے لئے تیار نہ تھے اور پنڈت جواہر لعل نہرو بھی
اس قسم کی بات چیت کے خلاف تھے۔ ۲۲، مارچ ۱۹۵۳ء میں
خط میں انہوں نے مجھے لکھا۔ "میرے خیال میں جو کچھ ان لوگوں
نے کیا وہ ملک کیلئے غداری سے کچھ ہی کم ہے اور لوگوں کو اسے
سمجھنا چاہئے۔" شیخ صاحب نے میری یہ تجویز کہ '۲۵، مارچ کے میرے
قانون ساز اسمبلی والے رسمی خطاب کو مصالحت کے لئے ایک
مناسب موقع کے طور پر استعمال کیا جائے' ٹھکرا دی۔

حالانکہ شیخ محمد عبداللہ نے سارے معاملہ کو رجعت پسندوں
کی ایک سازش کہہ کر ٹالنے کی کوشش کی اور یہ کہ شروع میں
بھارت سرکار بھی اس خیال کی حمایت کرتی ہوئی دکھائی دے
رہی تھی۔ میں بہت زیادہ پریشان تھا کیونکہ میں نے محسوس کیا
کہ ڈوگروں اور کشمیریوں کے درمیان خوشگوار تعلقات کا
آخری موقع بھی ہاتھ سے جا رہا تھا، جس کی بدولت ریاست
کے استحکام اور خوشحالی کو یقینی بنایا جا سکتا۔ جواہر لعل نہرو کے
نام اپنے خطوط میں، میں بدستور اس موضوع پر بحث کرتا

رہا۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ انہیں جن سنگھ اور پرجا پرشد کے لیڈروں سے چڑ تھی۔ ۲۷ر مارچ کو ایک خط میں میں نے لکھا "دراصل مجھے جو بات پریشان کر رہی ہے وہ یہ حقیقت ہے کہ پچھلے چند مہینوں سے جموں اور کشمیر کے درمیان خلیج بہت زیادہ بڑھ گئی ہے اور اس شگاف کو پاٹنے کے بجائے لگتا ہے کہ دھیرے دھیرے یہ کشادہ ہوتی جا رہی ہے۔ کوئی بھی پارٹی اس نزاکت کو محسوس کرتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ مجھے ڈر ہے کہ آنے والے برسوں میں ہمیں بہت ہی برا خمیازہ اٹھانا پڑے گا"

تقریباً اسی دوران بخشی غلام محمد جو اس وقت نائب وزیراعظم تھے اور وزیر خزانہ گردھاری لال ڈوگرہ نے جو کابینہ میں جموں کے واحد نمائندہ تھے، دلّی میں جواہر لعل نہرو سے ساری صورت حال پر بات چیت کی۔ بخشی صاحب شیخ صاحب سے بہت مختلف تھے۔ وہ زیادہ عملی آدمی اور شاندار منتظم تھے اور جموں کے بہت سارے لوگوں سمیت ہر طبقہ کے لوگوں سے انکے بہت عمدہ تعلقات تھے۔ حالانکہ وہ شیخ صاحب اور نیشنل کانفرنس کے ساتھ قریبی طور وابستہ تھے، تاہم انہوں نے کبھی شیخ صاحب اور محمد افضل بیگ کی طرح ڈوگروں سے مخالفانہ رویہ کا اظہار نہیں کیا۔ الحاق کے بارے میں بھی ان کا رویہ نمایاں طور پر ریاست اور مرکز کے درمیان تعلقات مضبوط

کرنے کیلئے زیادہ اطاعت پذیر تھا۔ اور یہ کہ انکے رویہ میں کشمیری جارحیت کم تھی جسے شیخ صاحب بہت مستعدی سے پال رہے تھے۔

جموں ایجی ٹیشن کے علاوہ ریاست اور مرکز کے درمیان آئینی تعلقات پر دہلی سمجھوتہ کے عمل درآمد کا بھی سوال تھا۔ جو شیخ محمد عبداللہ کی ٹیم اور بھارت سرکار کے نمائندوں کے درمیان طویل بحث و مباحثہ کے بعد پہلے حل کیا گیا تھا۔ جبکہ شاہی حکمران کو ختم کرنے کے بارے میں فیصلہ پر تیزی سے عمل درآمد کیا گیا تھا کیونکہ یہ بات شیخ صاحب کے لئے مناسب تھی، لیکن جہاں تک دوسری باتوں کا تعلق تھا تو انہوں نے دامن بچانا شروع کر دیا تھا۔ شروع سے ہی مجھ پر یہ بات بالکل واضح تھی کہ وہ اپنے قول میں بہت کم مخلص تھے اور یہ کہ وہ بھارت سرکار کے سلسلہ میں اپنے آپ کو محض مستحکم بنانے کی چال چل رہے تھے۔ اگر وہ مخلص ہوتے تو باقی سمجھوتہ پر عمل درآمد کرنے میں تاخیر نہ کرتے۔

درحقیقت شیخ صاحب نے نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی میں بھارت سرکار کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کے بارے میں بحث چھیڑنے کا اپنے ایک من پسند حربہ کا استعمال کیا۔ ایک گروپ جسکی قیادت محمد افضل بیگ کر رہے تھے، شور مچا رہا تھا کہ تعلقات ان تین موضوعات سے آگے نہیں بڑھنے چاہئیں جو دستاویز الحاق میں درج ہیں جبکہ دوسرا گروپ جس

کی قیادت بخشی غلام محمد کر رہے تھے اور جس میں گردھاری لال ڈوگرہ اور ڈی۔پی دھر شامل تھے، زیادہ جامع تعلقات کے حق میں تھا جن میں دوسرے اہم معاملات جیسے کہ عدلیہ، اقتصادی انتظامات وغیرہ شامل ہوں۔ نیشنل کانفرنس کے اندر اس کشمکش نے آہستہ آہستہ سنگین صورت اختیار کر لی۔ جبکہ شیخ محمد عبداللہ نے کچھ وقت کے لئے اپنے آپ کو بظاہر اس جھگڑے سے دوٗر رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن بعد میں انہوں نے تیزی سے سخت رویہ رکھنے والوں کا ساتھ دینا شروع کیا۔ جموں ایجی ٹیشن سے زیادہ اس صورت حال نے پنڈت جواہر لعل نہرؔو کو پریشان کرنا شروع کیا۔

میں نے انکے ساتھ ۲۱ اپریل اور ۲۳ مئی کو دو طویل ملاقاتیں کیں۔ دوسری ملاقات کے دوران پہلی بار وہ کھل گئے، واضح طور پر جو رُخ ریاست کے حالات اختیار کر رہے تھے اس پر اپنے گہرے رنج کا اظہار کیا۔ انہوں نے یہ تسلیم کیا کہ جب پارلیمنٹ کے اندر یا باہر یہ پوچھا جاتا ہے کہ دہلی سمجھوتہ پر عمل درآمد کیوں نہیں کیا گیا، تو اس بارے میں انکے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ شیخ صاحب کو ایک طویل خط لکھ چکے ہیں جس میں انہیں بتایا گیا کہ اس مسئلہ میں بہت دیر ہو گئی ہے اور چونکہ وہ چند ہفتوں بعد بیرونِ ملک جا رہے تھے اس لئے وہ ملک سے باہر جانے سے پہلے یہ سوال حتمی طور پر طے کرنا

چاہیں گے۔ جب میں نے ان سے دریافت کیا کہ انہیں کیا جواب موصول ہوا تو وہ میری طرف مڑے اور بے اعتقادی اور صدمہ بھرے لہجہ میں کہا۔ "مجھے بالکل کوئی جواب نہیں ملا۔" انہوں نے مزید کہا کہ شیخ محمد عبداللہ بالکل الجھن میں ہیں اور بظاہر مجھ سے ملاقات کرنے کو ٹال رہے ہیں۔

میں نے ذکر کیا کہ اگر ریاستی سرکار نے کوئی ایسا قدم اٹھایا جس سے یہ ظاہر ہو جائے کہ وہ بھارت سرکار کے ساتھ کئے گئے اہم سمجھوتہ سے پیچھے ہٹ رہی ہے تو میری پوزیشن ناممکن بن جائیگی۔ میرے لئے اپنے آپکو انکے ساتھ ساجھی کے طور پر قائم رکھنا مشکل ہو جائے گا کیونکہ بھارت کے ساتھ دھوکے میں، میں ہرگز شریک نہیں ہوں گا۔ انہوں نے اس پر تھوڑی دیر کے لئے غور کیا لیکن فوری طور کوئی جواب نہ دیا۔ جب میں چلنے کے لئے کھڑا ہوا وہ میری طرف مڑے اور کہا۔ "دیکھئے میں بالکل متفق ہوں کہ اگر ہمارے سمجھوتوں کو ترک کیا جاتا ہے یا ایسی ہی کوئی اور بات ہوتی ہے تو آپکی پوزیشن بالکل ناممکن بن جاتی ہے۔ یہ عیاں تھا کہ وہ شدید پریشان تھے لیکن وہ نے واضح طور پر صورت حال سے نپٹنے کے لئے ذہنی طور پر تیار نہ تھے۔ انکو خاصکر اپنے پرانے حامی اور دوست شیخ محمد عبداللہ کے طریقہ کار پر صدمہ بلکہ حیرانی تھی اور جب میں نے کہا لگتا ہے کہ لا محدود اختیارات نے شیخ

محمد عبداللہ کی خراب ترین فاشسٹ اور مطلق العنان رجحانات کو اُجاگر کیا ہے۔ تو انہوں نے میرے ساتھ اتفاق کیا۔

دھیرے دھیرے شیخ محمد عبداللہ کا رویہ زیادہ سے زیادہ انتہا پسند ہوتا گیا۔ جموّں کے نزدیک ایک سرحدی قصبہ رنبیر سنگھ پورہ میں انہوں نے ایک تقریر کی جہاں انہوں نے جموّں ایجی ٹیشن پر شدید ردِ عمل ظاہر کیا اور مزید یہ کہ بھارت پر فرقہ پرستی کا الزام لگایا اور واقعی دھمکی دی کہ ریاست کے الحاق کو مسلّم نہیں سمجھا جا سکتا۔ میں نے یورپ کے دورہ کا ارادہ کیا تھا اور یہاں تک کہ میں نے باضابطہ طور پر صدر جمہوریہ اور پنڈت جواہر لعل نہرو کو اس بارے میں مطلع کیا تھا لیکن جموّں ایجی ٹیشن کے پاداش میں بڑھتے ہوئے تناؤ اور نیشنل کانفرنس کے اندر بڑھتے ہوئے آپسی تفرقہ کے پیش نظر میں نے یہ ارادہ ترک کیا۔

جب ہم سرینگر منتقل ہوئے تو صورت حال مزید ابتر ہوئی۔ شاما پرشاد مکرجی کو جنہوں نے ریاست میں داخل ہونے کی پابندی کی خلاف ورزی کی تھی' گرفتار کیا گیا تھا۔ ۱۰ر جون کو جب جواہر لعل نہرو لندن کے لمبے دورے پر تھے تو میں نے انکو ایک رپورٹ بھیجی جس میں 'میں نے کہا۔ " وادی میں سیاسی صورت حال بدستور انتہائی پیچیدہ ہے' نیشنل کانفرنس کے اندر تقسیم سے کافی تناؤ لاحق ہو رہا ہے۔ بھارت کا حامی گروپ برابر ثابت قدم ہے اور

مضبوط ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور ورکنگ کمیٹی اور اسمبلی میں اکثریت کی حمایت کا دعویٰ کرتا ہے اور ورکنگ کمیٹی کی متواتر میٹنگوں کا سلسلہ جاری ہے۔"

پچھلے ہفتہ شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ ایک نجی ملاقات سے یہ اخذ کر کے مجھے صدمہ ہوا اور تعجب لگا کہ انہوں نے ان اہم سمجھوتوں سے جو انہوں نے اپنے واضح وعدوں پر بھارت سے کئے تھے' سے انحراف کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی ہے کیونکہ یہ صورت ہماری پوزیشن کو بالکل ناممکن بنا دیگی۔ اور یہ ہمارے قومی مفادات اور قدرتی طور پر ہماری بین الاقوامی حیثیت کو بھی بھاری دھکا پہنچائے گی۔ مجھے ان سنگین اور وسیع اثرات کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں جو اس صورت حال سے برآمد ہونگے۔ واپسی پر یہ مسئلہ حتمی اور فیصلہ کن حل ڈھونڈنے کیلئے' آپکے فوری توجہ کا مستحق ہے۔"

اسکے فوراً بعد جیل کے اندر شاما پرشاد مکرجی کے مرنے کی افسوسناک خبر آئی مجھے انکی بیماری یا انہیں ہسپتال میں منتقل کرنے کی خبر نہیں دیگئی تھی اور کئی گھنٹے بعد انکی لاش سرینگر سے باہر ہوائی جہاز سے بھیجے جانے کے بعد مجھے اس بارے میں غیر سرکاری ذرائع سے پتہ چلا۔ ریاستی سرکار کی تحویل میں جن حالات میں اُن کا انتقال ہوا وہ سنگین ناراضگی اور مشکوک تھے۔ جموّں آگ بگولہ ہو گیا۔

کیونکہ ڈاکٹر مکرجی نے پرجا پرشد کے موقف کیلئے لڑتے ہوئے جان دی تھی۔ اور عام چرچا یہ تھا کہ انکی موت قدرتی وجوہات کی بناء پر نہیں ہوئی تھی۔ پورے بھارت کو، خصوصاً بنگال کے لوگوں کو جو ڈاکٹر مکرجی کا بہت احترام کرتے تھے، اس واقعہ پر بہت صدمہ ہوا۔

اس دوران شیخ صاحب صاف طور پر لڑائی کے راستہ پر تھے۔ دہلی آنے کی بار بار تجویزوں اور ۳ جولائی کو جواہر لعل نہرو کی دہلی آنے کی دعوت کے باوجود انہوں نے راجدھانی جاکر پورے معاملہ پر بات چیت کرنے سے انکار کیا۔ مولانا آزاد کچھ روز کے لئے سرینگر آگئے لیکن بجائے اسکے کہ انکے دورے کا فائدہ اٹھا کر اختلاف کو دور کرتے، شیخ محمد عبداللہ نے جان بوجھ کر انہیں فراموش کیا۔ بلکہ نیشنل کانگریس کے کارکنوں نے درحقیقت انکی توہین کی۔ شیخ صاحب کی تقاریر زیادہ سے زیادہ سخت ہوتی گئیں۔ اور یہ بات کافی واضح ہوگئی کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ کشمیر کیلئے ایک طرح کی آزاد حیثیت کے خیال پر غور کررہے تھے، جسکا صحیح معنوں میں یہ نتیجہ نکلتا کہ بھارت کے ساتھ الحاق ناگریز طور پر ختم ہوتا۔ تقریباً اسی دوران آر۔ ڈلائے سٹونسن نے سرینگر کا دورہ کیا اور شیخ صاحب کے ساتھ لمبی گفتگو کی۔ یہ معلوم نہیں ہے کہ کیا راز کی باتیں ہوئیں لیکن عام تأثر یہ تھا کہ شیخ صاحب کو کسی طرح سے آزادی کی دلیل کے بارے میں اس گفتگو سے حوصلہ افزائی ملی۔

دریں اثنا نیشنل کانفرنس کے اندر اختلاف کھل کر سامنے آگیا تھا۔ یہ بات صاف تھی کہ شیخ صاحب سخت رویہ رکھنے والے جن کی قیادت مرزا محمد افضل بیگ کررہے تھے، کی حمایت کررہے تھے۔ جبکہ بیشتر دوسرے سینئر لیڈر جن میں دو کابینہ درجہ کے وزراء گردھاری لال ڈوگرہ اور شام لال صراف اور ڈی پی دھر جو نائب وزیر تھے، بخشی غلام محمد کا ساتھ دے رہے تھے۔ بخشی غلام محمد کئی مرتبہ اسٹیٹ سے لحہ بورڈ کے سلسلہ میں، جس کا میں چیرمین تھا، مجھ سے ملنے میرے گھر پر آئے اور دوسروں کے چلے جانے کے بعد کچھ منٹ میرے پاس ٹھہرے۔ جب کہ میں یہ تأثر دینے میں کہ میں اس جھگڑے میں اُلجھ رہا ہوں، محتاط تھا۔ مجھے بیشک بھارت کے طرفدار عناصر کے ساتھ قریبی تعلقات قائم رکھے تھے۔ ڈی۔ پی۔ دھر اکثر میرے پاس آتے تھے اور وہ اس ڈرامہ کے ایک اہم رکن بنے جو کھیلا جانے والا تھا۔ ڈی۔ پی۔ دھر خاموش طبیعت، خوش خلق اور تیز ذہن کے مالک تھے اور ایک عمدہ تدبیر تھے۔ نئی دہلی کو نیشنل کانفرنس کے اندرونی جھگڑوں کے بارے میں باخبر رکھنے میں انہوں نے ایک اہم رول ادا کیا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو انکو پسند کرتے تھے اور انکی سیاسی بصیرت کی قدر کرتے تھے۔

اسی دوران ہم نے محسوس کرنا شروع کیا کہ جب تک

شیخ محمد عبداللہ کو روکنے کیلئے کوئی انتہائی نوعیت کی کاروائی نہیں کیجاتی، حالات آہستہ آہستہ ابتر ہوتے جائیں گے اور بالآخر مکمل طور سے ہمارے بس سے باہر ہو جائیں گے جس کیلئے پورے ملک کو سنگین اور بے حساب نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ سلامتی کونسل کے ایجنڈے میں مسئلہ کشمیر ابھی تک ایک اہم مد کے طور پر موجود تھا اور یہ تباہ کن ہوگا اگر شیخ محمد عبداللہ نے اپنا رُخ بدل دیا جنکو لیک سکیس میں شرکت کیلئے ہندوستانی وفد کے لئے دو مرتبہ بھیجا گیا تھا اور جواب بھی ریاست کے وزیراعظم ہیں میں کافی تشویش اور خدشات کے ساتھ حالات کے رُخ کا مشاہدہ کرتا رہا اور فیصلہ کیا کہ مجھے صورت حال پر بات چیت کرنے کیلئے جواہر لعل نہرو کے ساتھ ایک بار پھر دہلی جانا چاہئے۔ ایسا میں نے جولائی کے تیسرے ہفتے میں کیا۔ جب میں ان سے ملا تو میں نے ان کا رویہ کافی بدلا ہوا پایا۔ نہ صرف یہ کہ انہوں نے شیخ محمد عبداللہ کا دفاع کرنے کی کوئی کوشش نہیں بلکہ وہ میری ہی طرح بگڑی صورت حال پر پریشان لگ رہے تھے۔ لگتا ہے کہ میرے خطوط کے علاوہ انٹیلی جنس بیورو (جسکے سربراہ اس وقت بی۔این۔ملک تھے) ڈی۔پی۔دھر اور ریاست کے دوسرے لوگوں سے تفصیلی رپورٹیں ملی تھیں۔ اور انہیں اپنے قریبی سیاسی معتمد مولانا ابوالکلام آزاد اور رفیع احمد

قدوائی سے بھی براہ راست تاثرات لے تھے۔ انہوں نے میری تفصیلی رپورٹ کو بہت خاموشی سے سُنا۔ کبھی انہیں غصہ آتا اور کبھی اقرار میں سر ہلاتے۔ میں نے انکے سامنے کوئی ٹھوس تجویز نہیں رکھی لیکن میں نے یہ واضح کر دیا کہ اگر شیخ محمد عبداللہ اپنے مخالفانہ رویہ پر بضد رہے تو ہمارا مختلف سمتوں پر جانا ناگزیر بن جائیگا۔ جب میں رُخصت ہوا تو وہ مجھے دروازہ تک چھوڑنے آئے۔ رُخصت ہوتے وقت انہوں نے میرے شانے پر ہاتھ رکھکر کہا۔ "فکر مت کرو۔ جو بھی آپ سے ہو سکے کر لیں۔"

سرینگر لوٹنے کے فوراً بعد میں نے اس مسئلہ سے مکمل طور پر اپنے آپ کو دوُر رکھکر مشہور تیرتھ گاہ امرناتھ جو لارڈ شیو سے منسوب ہے اور جو تیرہ ہزار کی بلندی پر ایک وسیع غار میں واقع ہے جانے کا فیصلہ کیا۔ میں ہمیشہ یہاں جانا چاہتا تھا اور محسوس کیا کہ ایسا کرنے کا یہ موزون موقع تھا۔ غالباً یہ یاترا مجھے خوفناک بحران سے نپٹنے کیلئے حوصلہ دیگی۔ مزید یہ کہ میری یاترا کی خوب تشہیر کیجائے گی۔ اس سے ان خدشات میں کمی ہوگی جو میرے دلی جانے سے پیدا ہوئے ہونگے۔ اصلی امرناتھ یاترا تیرتھ استھان پر شراون کی مکمل چاندنی رات کو پہنچتی ہے جو اگست میں کسی دن پڑتی ہے۔ تاہم بعض یاتری ایک ماہ پہلے چلے جاتے ہیں۔ ۲۶ جولائی کو چودھویں کا چاند تھا۔ اسلئے ہم سرینگر سے

۲۳ر جولائی کو روانہ ہوئے۔

ایسا سفر میں نے کبھی نہیں کیا تھا اور یہ بے حد یادگاری سفر تھا۔ پہلگام سے مجھے ڈانڈی میں اٹھایا گیا کیونکہ میری ٹانگ ابھی پوری طرح سے ٹھیک نہیں ہوئی تھی جو میں سیدھی پہاڑیوں پر چڑھ سکتا جبکہ آشا نے تمام راستہ چلنے پر ضد کی۔ راستے میں ہم نے تین راتوں کو چندن واری، شیش ناگ اور پنج ترنی میں ڈیرہ ڈالا۔ راستے میں دنگ کر دینے والے مناظر تھے خصوصاً تین چوٹیوں والی برف کی چٹان کے مدمقابل حیران کن دودھیالے نیلے رنگ کی شیش ناگ کی جھیل ایک بار پھر میں قدرتی خوبصورتی کی رُوحانی قوت سے متأثر ہوا۔ خاص طور پر ان بلندیوں پر ۔ جیسا کہ میں نے سلسلہ وار مضامین میں لکھا جو ہندوستان ٹائمز کے اتوار کے ضمیموں میں شائع ہوئے۔

انسان واضح طور پر ایک ایسی طاقت کی موجودگی محسوس کرتا ہے، جو اسکے اپنے حقیر وجُود سے مضبوط تر اور پاک تر ہوتی ہے۔ لمحہ بھر کیلئے قدرت کے حسین چہرہ کی جھلک اسکی صاف وپاک جاہ وجلال میں دیکھتا ہوں۔ ایسے میں وقت کی رفتار سُست پڑ جاتی ہے۔ زندگی کے مسائل اور جھنجھٹ حقیر قسم کے حدوں میں داخل ہوتے ہیں اور میں تصورات میں کھو جاتا ہوں، میری خواہش ہے کہ ایک دن ایسے ہی گرد و پیش میں 'میں خود ایک آشرم بناؤں جہاں خواہش اور خوف' خودی اور لگاؤ جیسے صاف اور آزاد بنے ہوئے جسم اور ذہن سے انسان قدرت کی ملاوٹ سے مبرّا سچائی پر ہمہ تن متوجہ ہو کر شاید رُوحانی روشنی کو پا سکے۔ بعد میں یہ مضامین ایک چھوٹے کتابچے 'دی گلوری آف امرناتھ' میں شائع ہوئے جو کہ ادبی میدان میں میری پہلی سعی تھی۔

بذات خود غار میرے تصوّر سے کہیں زیادہ بڑا تھا اور ایک کونے میں لارڈ شیو کی تخلیقی طاقت کا اشارہ کرتا ہوا تقریباً پانچ فٹ اونچا جگمگاتا ہوا برف کا ایک مجسمہ کھڑا تھا۔ تیرتھ گاہ اس لحاظ سے لاجواب ہے کیونکہ برف کا مجسمہ ہر سال خود بخود وجُود میں آتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ چاند کے ساتھ یہ پگھلتا اور گھٹتا ہے۔ سفر کے دوران میں پال برونٹن کی کتاب "سرچ اِن سیکرٹ انڈیا" پڑھتا رہا اور اس پورے تجربہ نے میرے اوپر گہرا اثر ڈالا۔ میں نے بار بار یہ دیکھا ہے کہ بیرونی بحران انسان کی اندرونی آرزو کو گہرا بنانے کیلئے ایک عمدہ وقت ہوتا ہے۔ یہ کہ جتنا زیادہ حملہ کا دباؤ بڑھ جائے اتنی ہی اندرونی آواز زیادہ بامعنی بن جاتی ہے۔

میں ۲۸ر جولائی کو سرینگر لوٹ آیا۔ میری غیر حاضری کے دوران نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کی کئی میٹنگیں ہوئی تھیں جن میں دو دھڑوں کے درمیان تکرار ہوئی تھی۔ اس

مناقشہ میں شیخ محمد عبداللہ اب کھل کر طرفداری کر رہے تھے لیکن انکی کابینہ کے صرف ایک رکن محمد افضل بیگ انکی حمایت کر رہے تھے۔ کابینہ میں اختلاف ۷ ر اگست کو انتہا پر پہنچا جب ایک کمزور بہانے کا استعمال کرتے ہوئے شیخ صاحب نے پنڈت شام لال صراف کا استعفیٰ طلب کرکے مخالف گروپ کے خلاف کاروائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۸ ر تاریخ کی صبح کو صراف نے مجھے شیخ صاحب کو بھیجے گئے طویل خط کی نقل بھیجی جس میں ان پر ہند سلطنت کے ساتھ ریاست کے تعلقات کے بارے میں نیشنل کانفرنس کی واضح پالیسی سے انحراف کا الزام تھا۔ انہوں نے یہ کہتے ہوئے استعفیٰ دینے سے انکار کیا کہ جس طریقہ پر آپ نے عوام کے سامنے بہت ہی اشتعال انگیز تقریریں کرکے، جس میں کابینہ کے اندر آپ کا مطلق العنان رویہ بھی شامل ہے۔ ملک میں ایک خطرناک صورت حال پیدا کی ہے۔ ان باتوں نے مجھے مطمئن کیا ہے کہ مشکل صورت میں مدد کرنے کے بجائے میرا استعفیٰ آپکو اپنی پالیسیوں کی پیروی کرنے میں بے لگام طور پر حوصلہ افزائی کرے گا۔ اس طرح کی کاروائی ملک کیلئے ہلاکت کن ہوگی۔

کچھ گھنٹے بعد شیخ محمد عبداللہ کو بخشی غلام محمد نائب وزیر اعظم، وزیر خزانہ گردھاری لال ڈوگرہ اور وزیر صحت پنڈت شام لال صراف کی طرف سے بھیجے گئے میمورنڈم کی دستخط شدہ کاپی موصول ہوئی۔ پانچ صفحات کی دستاویز میں شیخ محمد عبداللہ اور محمد افضل بیگ

پر پارٹی کی تسلیم شدہ پالیسیوں کی بالکل خلاف ورزی کرنے کا الزام تھا۔ میمورنڈم میں درج تھا۔ "قانون ساز اسمبلی کا اجلاس بلانے کے بعد دہلی سمجھوتہ جس میں آپ ہماری جانب سے ممتاز معمار تھے" ریاست کے بھارت کے ساتھ تعلقات پر چند ناقابل فرار وضاحتیں کیگئی تھیں۔ آپ کے موقف کی بہ اتفاق رائے سے گورنمنٹ، نیشنل کانفرنس، بھارت کی پارلیمنٹ اور ریاست کی قانون ساز اسمبلی نے تصدیق کی۔ لیکن ان معاملات کے بارے میں سمجھوتہ کی نہ صرف جان بوجھ کر آپنے عمل درآمد میں تاخیر کی جو کہ ہماری پالیسی کی آخری پناہ گاہ ہے۔ بلکہ آپنے ان کی خاص غرض سے اور کھلم کھلا مذمت کی۔ پس آپنے من مانی کرتے ہوئے ناعاقبت اندیش طور پر ریاست کے بھارت کے ساتھ تعلقات میں بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش کی۔"

انہوں نے مزید لکھا۔

"جناب محمد افضل بیگ لگاتار تنگ نظری، علیحدگی پسند اور فرقہ پرست پالیسیوں کی پیروی کرتے رہے ہیں، جن سے ریاست کی سالمیت کو شدید زک پہنچا ہے۔ بدقسمتی سے آپ کابینہ کے اندر اور عوام میں انکی حرکتوں کی حمایت کرتے رہے ہیں۔ اس بات نے ریاست کے مختلف حصوں میں رہنے والے لوگوں کے ذہنوں میں شک وشبہ کا شدید احساس پیدا کیا ہے۔ آپنے

بدقسمتی سے ان تمام حالات سے چشم پوشی کی ہے اور پس آپ نے تفرق انگیز قوتوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یکجہتی اور سیکولر کردار کو آج خطرہ لاحق ہے جو ہماری ریاست کے دو بنیادی پہلو ہیں"۔

میمورنڈم کے اختتام پر تین وزیروں نے لکھا۔

"ہم لگاتار آپ سے استدعا کرتے رہے ہیں کہ آپ ان نامناسب رجحانات کا خاتمہ کریں اور مل جل کر عوام کا حوصلہ بحال کرنے کا کام ہاتھ میں لے لیں۔ اپنے انتہائی قصد کے باوجود ہم اپنی کوششوں میں ناکام ہوئے ہیں۔ اسلئے ہمیں آپکو بہت دکھ کے ساتھ اپنے فیصلے سے مطلع کرنا پڑ رہا ہے کہ کابینہ جس طریقہ پر اس وقت تشکیل دی ہوئی ہے اور جسطرح سے یہ مقصد اور عمل کی یکجہتی کھو چکی ہے، یہ صاف ستھرا، قابل اور موزون انتظامیہ بہم پہنچانے کی صلاحیت کے سلسلہ میں عوام کا اعتماد کھو چکی ہے۔"

جونہی مجھے یہ مراسلہ، جو بالکل ہی غیر متوقع نہ تھا، موصول ہوا تو اب معاملہ بالکل میرے اوپر چھوڑ دیا گیا تھا۔ قانونی طور پر کابینہ تب تک قائم رکھ سکتی تھی جب تک صدر ریاست چاہتے چونکہ میں کابینہ کے ارکان کا تقرر کرنے والا تھا اسلئے میں انہیں برخواست کرنے کا مجاز بھی تھا۔ اگرچہ اسکی واضح طور پر نشان دہی نہیں کی گئی تھی۔ تاہم کوئی انتہائی نوعیت کا قدم اٹھانے

سے پہلے میں نے سوچا کہ یہ مناسب رہے گا کہ میں شیخ محمد عبداللہ سے بات کروں۔ میں نے انہیں فوراً جسقدر جلد ممکن ہو سکے اپنے پاس بلایا۔ اس شام وہ گلمرگ جا رہے تھے اور میرے مکان پر قریب دوپہر کے وقت آئے۔ جب میں نے صورت حال کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے شام لال صراف کے بارے میں معمولی قسم کے تین طویل واقعات بیان کئے اور بتایا کہ انہوں نے صراف کو استعفٰی دینے کو کہا ہے۔ انہوں نے ذکر کیا کہ دہلی سے کشمیر ٹریڈ کمیشن سے انہیں آج صبح ٹیلیفون ملا اور انہیں بتایا گیا کہ اخبارات میں کشمیر کے اندر آئینی بحران کی بڑی بڑی سرخیاں شائع ہوئی ہیں اور انہوں نے اس راز افشانی پر اپنی حیرانگی ظاہر کی۔

میں نے کہا کہ حالیہ واقعات کا رُخ دیکھ کر میں بہت متفکر اور پریشان ہوں خاصکر کابینہ کے اندر یکجہتی کا مکمل طور پر فقدان دیکھ کر۔ میں نے بتایا کہ یہ اچھا رہیگا اگر وہ اور انکے کابینہ کے ارکان اس شام میرے گھر پر آئیں تاکہ اس مسئلہ پر تفصیل سے گفتگو ہو سکے۔ ہندوستانی پریس کے خلاف غصے میں انہوں نے تقریر کر کے اس تجویز کو ٹال دیا۔ انہوں نے ہندوستانی پریس پر کابینہ کے اندر اختلاف کی سراسر غلط تصویر پیش کرنے اور مبالغہ آمیزی سے کام لینے کا الزام دیا۔ انہوں نے حیران کن

دعویٰ کیا کہ اگرچہ تھوڑا بہت اختلاف رائے ہے لیکن کابینہ کے اندر بنیادی سیاسی یا انتظامیہ نوعیت کے کوئی اختلافات نہ تھے۔ جب میں نے دوبارہ صورت حال کو درست کرنے کے بارے میں کچھ نہ کچھ کرنے کی ضرورت پر زور دیا تو انہوں نے صاف طور پر کہا کہ کوئی اندرونی حل تب تک ممکن نہیں جب تک کہ کوئی ایسا بیرونی حل ہو جو دونوں ہندوستان اور پاکستان کے لئے قابل قبول ہو۔ اس بات نے انکی حقیقی ذہنی کیفیت کو اُجاگر کیا ہندوستان کے ساتھ آخری اور ناقابل تنسیخ الحاق کی تصدیق کی پوزیشن سے پچھلے چند مہینوں سے انہوں نے بالکل ہی مختلف موقف اپنایا تھا۔ وہ بظاہر ہندوستان کے اُوپر بین الاقوامی دباؤ کی توقع رکھتے تھے۔ جیسے سچ مچ کشمیر کو ایک آزاد حیثیت ملتی اور یہ ایک بالکل صاف چھتی کہ شیخ صاحب دہلی سمجھوتہ کی عمل درآمد کو ٹال رہے تھے جسکا مقصد ریاست اور مرکز کے درمیان تعلقات کو مزید مستحکم بنانا تھا۔ ہماری ملاقات کے دوران نہ صرف وہ اپنی کابینہ کے اندر بحران کو حل کرنے کے سلسلے میں مجھے یقین دلانے سے قاصر تھے بلکہ بیرون حل کے بارے میں کہتے ہوئے غیر یقینیت میں ایک نئی صورت حال شامل کی تھی۔

ہماری میٹنگ پنتالیس منٹ تک چلی۔ اس کے بعد وہ یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے کہ وہ چھٹی گذارنے گلمرگ جا رہے

ہیں۔ مجھ پر یہ بات بالکل عیاں تھی کہ اگر حالات کو مزید خراب ہونے سے بچانا ہے تو فوراً ہی کچھ کرنا ہوگا۔ میں نے اپنے سیاسی اور قانونی ماہروں کو بلایا۔ جن میں ڈی۔ دھر اور بریگیڈیر بی۔ ایم۔ کول شامل تھے (جو بعد میں جنرل بنے) جو ہمارے اور نئی دہلی کے درمیان ایک طرح کے ایک غیر سرکاری ہرکارے کے طور پر کام کرتے تھے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ کرپشن اور بدنظمی نے شیخ محمد عبداللہ کے رُتبے کو کسی حد تک کم کر دیا تھا۔ پھر بھی وہ وادی میں ایک ہر دلعزیز شخص تھے۔ اگر ہم اپنے مسئلہ کو بازاروں میں لیجانے کا موقع دیتے تو وہ بہ آسانی فرقہ پرست اور کشمیری عوام کے جارحانہ جذبات کو بھڑکاتے۔ جس کا نتیجہ سنگین اور وحشی افراتفری کی صورت میں نکلتا۔ ملک دشمن عناصر اور ایجنٹ وادی میں سرگرم تھے اور انہیں موقع دیا جاتا تو وہ ریاست کو مکمل ہلچل میں ڈھکیلنے سے گریز نہ کرتے۔ پارلیمنٹ کا اجلاس چل رہا تھا۔ اور یہاں کوئی چیز ہوتی اسکا فوراً قومی سطح پر اثر پڑتا۔

اسلئے ہم نے فیصلہ کیا کہ شیخ محمد عبداللہ کو ڈسمس کیا جانا ہوگا جبکہ میں انہیں گرفتار کرنے پر رضامند نہ تھا۔ بخشی غلام محمد نے یہ بات بالکل واضح کر دی کہ اگر شیخ محمد عبداللہ اور بیگ کو اپنے نظریات کا پروپیگنڈہ کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ حکومت چلانے کا کام ہاتھ میں نہیں لیں گے۔

ایک برسر اقتدار وزیر اعظم کو ڈسمس کرنا اور گرفتار کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ سب پلان مکمل رازداری میں تیار کرنے تھے۔ پولیس کو منظم کرنا تھا، بھارتی فوج کو محتاط طور باخبر رکھنا تھا۔ روابط عامہ کو تخیلی انداز سے برتنا تھا۔ خوش قسمتی سے ڈی۔ پی۔ دھر ایک عمدہ شاطر تھے اور ایسے موقعوں کیلئے وہ بہترین تھے۔ بحران کے پہلے تین دن کے دوران ڈی۔ پی۔ دھر نے جو نائب وزیر داخلہ تھے، سب تفاصیل تیار کی تھیں۔

تاہم اس وجہ سے کہ شیخ محمد عبداللہ کے گلمرگ جانے کا فیصلہ نے ہمارے پلان میں آخری وقت میں کچھ تبدیلی کی ضرورت پیدا کی۔ انکے میرے گھر سے چلے جانے کے فوراً بعد ہم انہیں ڈسمس کرنے کا آرڈر تیار کرنے کیلئے بیٹھ گئے۔ اسکے ساتھ میں نے شیخ محمد عبداللہ کے نام ایک خط لکھوایا۔ ان دستاویز کی عبارت یوں تھی۔

کرن محل، سرینگر

۸، اگست ۱۹۵۳ء

میرے پیارے شیخ محمد عبداللہ

آپ کو یاد ہوگا کہ ہماری آج کی ملاقات کے دوران میں نے آپکی کابینہ میں پائے جانے والے سنگین اختلافات پر اپنی گہری تشویش سے آگاہ کیا۔ پالیسیوں کی انجام دہی کے

سلسلہ میں کابینہ کے ارکان کے درمیان ہم آہنگی اور مقصد کے اتحاد کو بحال کرنے کی ضرورت میں نے آپکو ذہن نشین کرائی۔ تاہم آپ مجھے یہ یقین دہانی کرانے سے قاصر رہے کہ ان شدید اختلافات کا تدارک کیا جائیگا۔ کابینہ کے اندر یہ اختلاف کافی عرصہ سے ریاست کے عوام کے ذہنوں میں بڑی الجھن اور تشویش پیدا کرتا رہا ہے صورت حال ایک ایسی بحران تک پہنچی ہے جسکی کوئی مثال نہیں اس حقیقت کے ساتھ کہ آپکی کابینہ کے تین ساتھیوں نے ایک میمورنڈم میں جسکی نقل وہ مجھے بھیج چکے ہیں، آپکی حرکات اور پالیسیوں پر اپنی مکمل بے اطمینانی کا اظہار کیا ہے۔ جسکی وجہ سے موجودہ کابینہ عوام کا اعتماد کھو چکی ہے۔ یہ دستاویز صاف طور پر ظاہر کرتی ہے کہ آپکی کابینہ کے اندر انتشار اس حد تک پہنچ چکا ہے جس میں ریاست کی وحدت، خوشحالی اور استحکام کو سنگین خطرہ لاحق ہوا ہے۔

جب ہماری آج ملاقات ہوئی تو میں نے آپکو یہ تجویز پیش کی کہ آج شام میرے مکان پر کابینہ کی ایک ہنگامی میٹنگ بلائی جانی چاہئے۔ تاکہ ہم مل کر ملک کیلئے ایک پائدار، متحد اور قابل سرکار حاصل کرنے کے امکانات کو تلاش کریں۔ لیکن افسوس ہے کہ آپ نے اس معاملہ کو ٹال دیا۔

ان حالات میں بحیثیت ریاست کے سربراہ کے مجھے اس نتیجہ پر پہنچنے کیلئے مجبور کر دیا گیا کہ موجودہ کابینہ مزید وقت کیلئے

برسر اقتدار نہیں رہ سکتی ہے۔ پس مجھے دُکھ کے ساتھ آپ کو اطلاع دینا پڑ رہی ہے کہ میں نے کابینہ کو توڑنے کا فیصلہ کیا ہے جسکے آپ قائد ہیں۔ اس سلسلہ میں میرے حکم کی ایک کاپی اس خط کے ہمراہ شامل ہے۔

مجھے شاید یہ لکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ کاروائی کرتے ہوئے میں کس قدر رنجیدہ ہوں لیکن ریاست کے عوام کے مفادات کے پیش نظر میرے لئے چارہ بھی نہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ اس کاروائی سے آپسی احترام اور ہم آہنگ جذبات جو ہم ایک دوسرے کے لئے رکھتے ہیں کسی بھی صورت میں متاثر نہیں ہونگے۔

مُخلص

کرن سنگھ۔ صدر ریاست

آرڈر

چونکہ چند مہینوں سے میں بڑھتی ہوئی تشویش کے ساتھ دیکھ رہا ہوں کہ سرکار کے درمیان بنیادی معاملات، سیاسی، اقتصادی اور انتظامی معاملات میں شدید اختلافات پیدا ہو گیا ہے جو ریاست کے اہم مفادات کو متاثر کر رہے ہیں

اور چونکہ گورنمنٹ کے ارکان ان معاملات

سے متعلق کھلم کھلا متضاد نقطہ ہائے نظریات ظاہر کر رہے ہیں۔ اور چونکہ ان بنیادی معاملات پر کابینہ کے اکثر ممبران کے نظریات وزیر اعظم اور ان کے ایک ساتھی کے نظریہ سے بہت زیادہ مختلف ہیں۔ اور چونکہ ہم آہنگی سے کام کرنے اور ایک ٹیم کے طور پر ساتھ چلنے کی کوششیں ناکام ہو چکی ہیں اور کابینہ کی اکثریت یہ اظہار کر چکی ہے کہ کابینہ میں مقصد کی یکجہتی اور کارکردگی کا فقدان ہے۔ اسلئے موجودہ کابینہ عوام کا اعتماد کھو چکی ہے۔

اور چونکہ عوام کی اقتصادی مصیبت بہت بڑھ چکی ہے اور اسکی طرف فوری سنجیدہ دھیان کی ضرورت ہے۔

اور چونکہ ایک اسٹیج آچکا ہے جس میں ایماندار اور قابل انتظامیہ کا بنیادی عمل ناقابل عمل بن چکا ہے۔

اور چونکہ بالآخر موجودہ کابینہ کی کارکردگی مشترکہ بنیاد پر ناممکن بن چکی ہے

اور ماحصل اختلاف نے شدید طور پر ریاست کی یکجہتی، بہبودی اور استحکام کو شدید خطرہ پہنچایا ہے۔

میں، کرن سنگھ، صدر ریاست، ریاست کے عوام کے مفاد میں کام کرتے ہوئے، جنہوں نے مجھے ذمہ داری اور ریاست کی سربراہی کا اعتماد بخشا ہے۔ شیخ محمد عبداللہ کو ریاست جموں و کشمیر کی وزارت عظمیٰ کے عہدے سے برطرف کرتا ہوں اور جس کے نتیجہ میں کابینہ جسکی سربراہی شیخ محمد عبداللہ کر رہے ہیں فوراً برطرف کی جاتی ہے۔

صدر ریاست
جموں و کشمیر

سرینگر ۸۔ اگست ۱۹۵۳ء

کاغذات مکمل ہونے تک رات ہو چکی تھی۔ موسم بھی سرکش تھا۔ بارش ہو رہی تھی۔ بادل گرج رہے تھے اور بجلی چمک رہی تھی۔ میں نے اپنے باڈی گارڈ میجر بی۔ ایس۔ بجوا کو گلمرگ جا کر شیخ محمد عبداللہ کے حوالے خط کرنے پر معمور کیا۔ ان کے

ساتھ پولیس کی ایک جماعت بھی گئی لیکن تیز بارش اور ٹنگمرگ سے آگے خراب سڑک نے پولیس پارٹی کو ٹنگمرگ میں تاخیر کر دی۔ دستاویزات کو روانہ کرنے کے بعد ہم سب کرن محل میں یہ سننے کیلئے انتظار کرتے رہے کہ یہ منزل تک پہنچا دئے گئے۔ جب اس میں تاخیر ہوئی تو تشویش بڑھ گئی ہمارا کھیل خطرے کا تھا کیونکہ اگر شیخ محمد عبداللہ کو خفیف سا شبہ ہوتا کہ کیا ہو رہا تھا وہ شدید ردعمل دکھاتے اور ہماری خود کی زندگیاں خطرے میں پڑ جاتیں۔ بہرحال پانی سر سے گذر چکا تھا اور ہم بس دعا ہی کر سکتے تھے کہ آپریشن خوش اسلوبی سے پایہ تکمیل تک پہنچے۔

جیسا کہ ظاہر ہوا ہماری دعائیں کامیاب رہیں۔ شیخ صاحب صورت حال سے بالکل بے خبر تھے اور اقتدار میں اس قدر مغرور تھے کہ وہ گمان تک نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی شخص انکو چیلنج کرنے کی جسارت کر سکے گا۔ جب بالآخر ڈی۔ سی اور پولیس پارٹی گلمرگ پہنچے تو کافی رات بیت چکی تھی اور شیخ صاحب اور بیگم عبداللہ گہری نیند میں تھے۔ کچھ مشکل کے ساتھ اور بہت دیر تک دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد انہیں جگایا گیا۔ اور انکو خط اور گرفتاری کا وارنٹ دے گئے۔ اس سے پڑھکر وہ آگ بگولہ ہو گئے۔ اور چلائے

کہ "صدر ریاست مجھے برطرف کرنے والا کون ہوتا ہے۔ میں نے اس چھوکرے کو صدر ریاست بنایا ہے۔" لیکن اس دوران انکی قیام گاہ کو پوری طرح سے پولیس گھیرے میں لے چکی تھی۔ انہیں نماز پڑھنے اور سامان سمیٹنے کیلئے دو گھنٹے دئے گئے تھے۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ اس دوران انہوں نے بہت سارے دستاویزات جلا ڈالے جو انکے پاس تھے۔ اسے روکا جا سکتا تھا لیکن ہم نے پولیس کو سخت ہدایات دی تھیں کہ شیخ صاحب اور بیگم صاحبہ کے ساتھ احترام کیساتھ پیش آنا چاہئے اور کسی طرح سے کوئی جسمانی طور پریشان نہ کیا جائے۔

۹ اگست صبح سویرے انہیں حفاظت میں ایک کار تک لیا گیا اور انہیں وادی سے باہر اُدھم پور کے گیسٹ ہاؤس میں لے جایا گیا جہاں انکو حراست میں رکھا گیا۔ اس رات محمد افضل بیگ اور کئی اور لوگ سرینگر اور وادی کے دیگر حصوں سے گرفتار کئے گئے۔

درین اثنا، یہ دیکھنا میری ذمہ داری تھی کہ ریاست کے انتظامیہ میں کوئی شگاف نہ رہے۔ شیخ محمد عبداللہ کی برطرفی کے ساتھ، میں نے بخشی غلام محمد کو آکر حکومت بنانے کے مسئلہ پر تبادلہ خیال کرنے کی دعوت دی۔ خط کے اختتام پر میں نے لکھا کہ نئی وزارت کا اقتدار میں قائم رہنا اس بات

پر منحصر ہوگا کہ اسے آنے والے اجلاس میں اسمبلی سے اعتماد حاصل کرنا ہوگا۔ بخشی صاحب میرے پاس آئے اور ہم نے صورت حال پر تبادلہ خیال کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ نئی سرکار کو حلف دلانے میں کوئی دیر نہیں لگانی چاہئے۔ میں نے چیف سکرٹری ایم۔ کے۔ قدوائی کو طلب کیا جو شادمانی سے اس بات سے بے خبر تھے کہ کیا کچھ ہو رہا تھا۔ جب انہیں پتہ چلا کہ شیخ محمد عبداللہ کو برطرف کیا گیا اور انہیں گرفتار کیا جا چکا ہے وہ سیڑھیوں پر اپنا سر ہاتھوں میں تھامے سکتہ میں آگئے اور انہیں سخت تاثیر والی وسکی کی کئی خوراکیں مہیا کرنے کے بعد ہی ہوش میں لایا گیا۔

۹ مارچ علی الصبح میں نے بخشی غلام محمد اور گردھاری لال ڈوگرہ کو حلف دلایا تاکہ وہ سنگین صورت حال سے نپٹ سکیں جو شیخ محمد عبداللہ کی برطرفی اور گرفتاری کی خبر کے پھیلنے کے فوراً بعد وادی میں لازمی طور پر پیدا ہوگئی تھی۔ تب میں نے صدر جمہوریہ کو پوری صورت حال کے بارے میں آگاہ کرتے ہوئے رپورٹ لکھی اور اسکی کاپی جواہر لعل نہرو کو اپنے خط کے ساتھ روانہ کی۔ جس میں یہ جملے شامل تھے۔

"ہم سب اچھی طرح سے یہ قدم اٹھانے کی اہمیت کو جانتے ہیں جس کیلئے ہمیں مجبور کیا گیا اور اسکے ممکن

اثرات کو بھی جانتے ہیں جو ریاست اور ریاست کے باہر پیدا ہونگے۔ اس سارے معاملہ میں میں نے جمہوری اور آئینی طریقہ پر عمل کرنے کی کوشش کی ہے، خاص طور پر آپکی بات ذہن میں رکھتے ہوئے جو آپ نے ہماری پچھلی ملاقات کے دوران کہی تھی۔ مجموعی طور پر میں محسوس کرتا ہوں موجودہ حالات میں ہم نے پھر وہی کیا جو ممکن تھا۔

برطرفی کے بعد شیخ صاحب کے ساتھ کیسے نپٹا جائے یہ فیصلہ بیشک نئی سرکار کو لینا تھا۔ اپنی طرف سے میں نے انہیں برطرف کرنے کے بعد فوراً گرفتار کرنے سے گریز کرنے کی بہت تاکید کی لیکن نئی سرکار کو اندیشہ تھا کہ وادی میں اس موڑ پر انکی موجودگی کی وجہ سے ردِ عمل میں بہت شدت پیدا ہوگی اور صورت حال کے مکمل طور پر ہاتھ سے نکل جانے کا سنگین خطرہ ہوگا یہانتک کہ اس کا نتیجہ ہنگاموں اور خون خرابے کی صورت میں نکلے گا۔ اس کے نتیجہ میں انہیں آج صبح گلمرگ سے گرفتار کیا گیا اور انہیں اودھمپور لے لیا جا رہا ہے۔ یہاں انکو سرکاری گیسٹ ہاؤس میں رکھا جائیگا۔ میں نے تاکید کی ہے کہ انکے اور انکی فیملی کے ساتھ پورا احترام اور لحاظ برتا جائے۔

اس پوری کاروائی کے اختتام پر صبح ہو چکی تھی۔

پچھلے دو روز کے بادل چھٹ چکے تھے اور مطلع دوبارہ صاف تھا۔ صبح کے آٹھ بجے سے کچھ ہی دیر پہلے میں نے جواہر لعل کیساتھ ٹیلیفون پر رابطہ قائم کیا۔ لیکن لائن صاف نہ تھی۔ صبح کی خبروں میں کشمیر کی صورت حال پر تفصیلی رپورٹ نشر کرکے آل انڈیا ریڈیو نے پندرہ منٹ میں سے تیرہ منٹ صرف کئے۔ اس رات میں لمحہ بھر کیلئے نہیں سویا اور حیرت انگیز طور پر میں نے اپنے آپکو لاتعلقی اور ہلکی کیفیت میں پایا۔ میں جانتا تھا کہ میں نے جو کچھ کیا تھا وہ قومی بھلائی کیلئے تھا اور اگر قوم کو فائدہ پہنچے تو سبھی خطرات لئے جا سکتے ہیں۔ آشا بھی اپنے کمرہ میں ساری رات بے چینی سے جاگی تھیں۔ آہستہ آہستہ میں نے سیڑھیاں چڑھیں اور کمرہ میں داخل ہوا۔ کام ختم ہو چکا ہے۔ میں نے کہا۔ اور ہم دونوں مسکرائے۔ ان کا ستروان اور میرا تیسواں[۳۳] سال چل رہا ہے۔ بستر کو چھونے سے پہلے میں تقریباً سو چکا تھا۔

شباب کشمیر

یعنی

کشمیر کے مشہور بے تعصب اور دنیائے اسلام کے بے نظیر بادشاہ سلطان زین العابدین عُرف بڈشاہ کے عہد کی برکات و ترقیات، عہد بڈشاہی کے عُلماء، و مشائخ اور دربار بڈشاہی کے ہندو و مسلمان ارکان اور بڈشاہ کی علم نوازی و انصاف پروری اور مساوات پرستی کے مفصل و مکمل حالات۔

مُرتبہ:۔ **محمد الدین فوق**

صفحات ۳۲۴

سائز ۲۰×۳۰/۱۶

قیمت چالیس روپے

گلشن پبلیشرز کی سنہ ۱۹۸۴ کی تازہ ترین مطبوعات

نام کتاب	مصنف	قیمت
ولی عہد	ڈاکٹر کرن سنگھ	۶۰/-
شباب کشمیر	محمد الدین فوق	۴۰/-
خلاصۃ التواریخ	مرزا کمال الدین شیدا	۹۰/-
ارمغان شیدا	”	۳۵/-
لہ دید	جیا لال گیرو	۴۰/-
بچوں کی تربیت	ڈاکٹر عبدالرؤف	۱۰/-
تفسیر اقبال	ببار آلہ آبادی	۷۵/-
نفسیات اور تعلیمی مسائل	عبدالاحد شاہ	۲۰/-
نظم و نسق مدرسہ و اصول تعلیم	”	۲۰/-
تاریخ کشمیر	محمد امین پنڈت	۲۵/-
جموں و کشمیر کے گوجر	آر آر کھجوریہ	۳۰/-
تلاش	محی الدین مجبور	۷/-
کشمیر اور ڈوگرہ راج	ملک فضل حسین	۴۵/-
ایک چہرہ پر چھائی کا (ڈرامہ)	شکیل الرحمان	۹/-
اقبال اور فنون لطیفہ	”	۱۵/-
اردو کی ادبی تاریخ	عبدالقادر سروری	۲۵/-

قیمت	مصنّف	نام کتاب
۱۲/-	لکھمن لال کول	مایہ منثر ژھائے
۴/-	محمد شفیع محبوب	درد جگر
۱۵/-	ابوالکلام آزاد	ہجر و وصال
۱۲/-	کانجی دوارکا داس	محمد علی جناح
۱۵/-	زینت فردوس زینت	قطرے

جموں و کشمیر میں لائبریری کتابوں کا بہترین کتب خانہ

شیخ محمد عثمان اینڈ سنز تاجران کتب سرینگر

ایکسچینج روڈ، گاؤکدل چوک، سری نگر، کشمیر

فون ۷۲۰۸۱

ہماری دیگر مطبوعات

قیمت	مصنّف	نام کتاب
۲۵/-	مولانا الطاف حسین حالی	حیات جاوید
۵/-	عبدالاحد شاہ	ابتدائی مدارس میں پڑھانے کا طریقہ
۷/-	"	رُوسو سے ذاکر حسین تک
۹/-	مولانا ابوالکلام آزاد	جامع الشواہد
۷/-	"	عیدین
۲۰/-	محمد اقبال	رہبر بالغان
۲۰/-	"	تعلیم بالغان
۱۵/-	ابراہیم جلیس	نواب فراڈ بہادر جنگ
۱۰/-	فاضل کاشمیری	چپ جی صاحب
۲۰/-	سیّد عبداللہ	مقاماتِ اقبال
۳/-	مولانا ابوالکلام آزاد	اصحابِ کہف
۲۵/-	حامدی کاشمیری	لاحرف
۴۵/-	"	کارگہِ شیشہ گری
۴۰/-	کالیداس گپتا	چکبست اور باقیات چکبست
۲۰/-	"	شعاعِ جاوید
۷۵/-	"	مقالات چکبست

ہماری دیگر مطبوعات

نام کتاب	مصنف	قیمت
حیات جاوید	مولانا الطاف حسین حالی	۲۵/-
ابتدائی مدارس میں پڑھانے کا طریقہ	عبدالاحد شاہ	۵/-
رُوسو سے ذاکر حسین تک	”	۷/-
جامع الشواہد	مولانا ابوالکلام آزاد	۸/-
عیدین	”	۷/-
رہبر بالغان	محمد اقبال	۲۰/-
تعلیم بالغان	”	۲۰/-
نواب فراڈ بہادر جنگ	ابراہیم جلیس	۱۵/-
چپ جی صاحب	فاضل کاشمیری	۱۰/-
مقاماتِ اقبال	سید عبداللہ	۲۰/-
اصحابِ کہف	مولانا ابوالکلام آزاد	۳/-
لاعرف	حامدی کاشمیری	۲۵/-
کارگہ شیشہ گری	”	۴۵/-
چکبست اور باقیات چکبست	کالیداس گپتا	۴۰/-
شعاع جاوید	”	۲۰/-
مقالات چکبست	”	۷۵/-

نام کتاب	مصنف	قیمت
مایہ منتشر حصے	لکھمن لال کول	۱۲/-
درد جگر	محمد شفیع محبوب	۴/-
ہجر و وصال	ابوالکلام آزاد	۱۵/-
محمد علی جناح	کانجی دوارکا داس	۱۲/-
قطرے	زینت فردوس زینت	۱۵/-

نام کتاب	مصنف	قیمت
سبو و سراغ	کالیداس گپتا	۳۵/-
غالبیات ۔ چند عنوانات	"	۵۰/-
انتخاب آتش و غالب	"	۳ /-
کالیداس گپتا	ظفر ادیب	۳۵/-
دیوانِ جالب	جالب کشمیری	۲۰/-
کینی کیلر	ظہور الدین	۲۰/-
ہندوستانی مشرقی افریقہ میں	کالیداس	۱۰/۵۰
آدمی نامہ	نظیر اکبرآبادی	۲/-
معرکہ بے چہرہ لمحے	سیدا محمد قادری	۵/-
سرمژگاں	سیدہ طیبہ خسرو	۳۰/-
عہد ساز لڑکیاں	ایلیا فوری	۲/۵۰
کامیاب استانیاں	رضیہ فرحت	۶/-
تمہید ادب		۱۰/-
عورت اور سماج	محمد امین حکیم	۹/-
پوسٹن کا سفر	محمود ہاشمی	۱۰/۵۰
خوشگوار رفاقت	ایلین چیز	۶/-
کیف و کم	یوسف ناظم	۷/-
فن انشاء پردازی	محی الدین قادری	۴/-
تعارف روح اور کشمیری نظمیں	عبدالرشید	۴/۸۵

نام کتاب	مصنف	قیمت
اردو کشمیری فرہنگ ڈکشنری (۹ جلدوں میں)	کلچرل اکیڈمی کشمیر	۱۵۱/۱۱
جیل کے سو دن	عبدالرشید	۴/۵۰
تورینہ	رضیہ بٹ	۲۰/-
نقیب	مینا ناز	۲۰/-
سدا بہار	دیبا خانم	۲۵/-
اوصاف اقبال	بہار اکرآبادی	۵۰/-
اقبال کا فلسفہ خودی	محمد عثمان	۳۰/-
غنی کاشمیری (فارسی)	ریاض احمد شیروانی	۲۲/۸۰
شیرین و قلم (اوّل و دوم باتصویر مکمل سیٹ)	محمد یوسف ٹینگ	۶۰/-
کاشر ڈکشنری (اوّل تا سات دیگزین بائنڈنگ کامل)		۱۱۸/۲۵

خُلاصۃ التواریخ

اس کتاب میں مؤلف نے تاریخ کشمیر کے حالات و واقعات قدیم نایاب نسخوں سے اخذ کر کے ان پر مفصل و مدلل طور پر بحث کی ہے۔